’’فہم دین کورس‘‘

اسلامی عقائد

تیسرا ایڈیشن 2016ء

ڈاکٹر مفتی عبدالواحد

(ایم بی بی ایس)

(سابق) مفتی جامعہ مدنیہ لاہور

رئیس دارالافتاء والتحقیق چوبرجی پارک لاہور

مجلس نشریات اسلام

۱۔ کے۔ ۳، ناظم آباد مینشن، ناظم آباد نمبر ۱، کراچی۔ ۷۴۶۰۰

یہ کتاب
محترم جناب ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب (ایم بی بی ایس)
مفتی جامعہ مدنیہ لاہور کی
اجازت سے شائع کی جارہی ہے

نام کتاب: ....اسلامی عقائد
تصنیف: ....ڈاکٹر مفتی عبدالواحد (ایم بی بی ایس)
طباعت: ....احمد برادرز پریس کراچی
اشاعت: ....
ضخامت: 312

ناشر
فضل ربی ندوی
مجلس نشریات اسلام
۱۔ کے۔ ۳، ناظم آباد مینشن، ناظم آباد نمبر ۱، کراچی ۔ ۷۴۶۰۰
استاکسٹ مکتبۂ ندوۃ۔ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی
فون: ۲۶۳۸۹۱۷

فہرست مضامین

تعارف 10
مقدمہ 14
باب:1 اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا بیان 20
وجود باری تعالیٰ پر قرآن کا طریق استدلال 20
اللہ تعالیٰ ایک ہے کوئی اس کا شریک نہیں 23
اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے 25
اللہ تعالیٰ کی صفات 25
صفات ذاتیہ، صفات فعلیہ 26
اللہ تعالیٰ کی تمام صفات قدیم ہیں 27
اللہ تعالیٰ کی صفات میں ترتیب نہیں ہے 27
اللہ تعالیٰ کی صفات ان کی ذات کا عین ہیں یا غیر ہیں؟ 27
بنیادی صفات کا تفصیلی بیان 30
صفت حیات 30
صفت سمع 30
صفت بصر 31
صفت علم 31
صفت ارادہ ومشیت 33
صفت کلام 34
صفت قدرت 38
صفت تکوین 52
اشیاء کے وجود کا تعلق کیا کلمہ کن کے ساتھ ہے؟ 52

ممکنات اوران کے آثار وخواص سب اللہ تعالیٰ کی ایجاد ہیں 53
بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے 54
خیروشر دونوں کے ساتھ ارادۂ خداوندی کا تعلق 56
عالم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا تعلق 58
صفات متشابہات 62
اسمائے حسنی 69
حدیث میں وارد اللہ تعالیٰ کے 99 نام 70
اللہ تعالیٰ کی تنزیہات 78
پہلی تنزیہہ۔ وہ کسی کا کسی چیز میں محتاج نہیں 78
دوسری تنزیہہ۔ حق تعالیٰ کسی چیز کے ساتھ متحد نہیں ہوتا 78
وحدۃ الوجود کی تحقیق 79
وحدۃ الشہود کی تحقیق 80
تیسری تنزیہہ۔ اس کی ذات وصفات کو کبھی فنا اور تغیر نہیں 81
چوتھی تنزیہہ۔ کوئی چیز اس پر واجب نہیں 82
پانچویں تنزیہہ۔ اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہیں کہ ان کو بدا ہو 84
بدا کی تین قسمیں 84
بدا فی الامر اور نسخ کے درمیان فرق 85
بدا کی تینوں قسمیں لازم آنا 85
عقیدہ بدا کا نتیجہ 85
عقیدہ بدا کا قرآن کے مخالف ہونا 86
قائلین بدا کے دلائل اور ان کے جواب 86
باب:2 انبیاء ورسل سے متعلق عقائد 88
شریعت میں نبی کس کو کہتے ہیں؟ 88
لفظ نبوت اور رسالت کا مفہوم 88

نبی اور رسول میں فرق 89
نبوت و رسالت عطیہ الٰہی ہے اکتسابی نہیں 89
کسی ایک نبی کو جھٹلانا تمام انبیاء کو جھٹلانے کے مترادف ہے 90
انبیاء پر ایمان کے بغیر اللہ پر ایمان معتبر نہیں 90
انبیاء علیہم السلام امین ہوتے ہیں 91
انبیاء علیہم السلام منصب نبوت سے کبھی لائق معزولی نہیں ٹھہرتے 92
سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ 92
ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا رد 92
عصمت انبیاء علیہم السلام 93
عصمت انبیاء کے ثبوت پر اعتراض اور اس کا جواب 95
باب:3 معجزات یا دلائل نبوت 102
معجزہ کی حقیقت۔ عادت اللہ کی دو قسمیں (1) عام جاری عادت
(2) خاص موقت عادت 109
قدرت اور عادت کے درمیان فرق 110
معجزہ کا دلیل نبوت ہونا 111
باب:4 انبیاء علیہم السلام میں حضرت محمد ﷺ کے امتیازات 117
حضرت محمد ﷺ پر ختم نبوت اور اس کے دلائل 117
حضرت محمد ﷺ کی نبوت کا سابقہ آسمانی کتابوں سے ثبوت 121
حضرت محمد ﷺ کی بعثت و نبوت تمام عالم کے لئے عام ہے 125
حضرت محمد ﷺ تمام پیغمبروں کے سردار اور سب سے افضل ہیں 126
حضرت محمد ﷺ کو تمام مخلوقات سے زیادہ علوم عطا ہوئے 128
باب:5 عقیدہ حیات النبی 129
باب:6 بعض بدعتیوں کا نبی ﷺ کی شان میں غلو اور اس کا جواب 136
پہلا غلو۔ نبی ﷺ کے لئے جمیع ما کان و ما یکون کا علم ماننا 136

دوسرا غلو۔ نبی ﷺ کو مختار کل ماننا 139
تیسرا غلو۔ نبی ﷺ کو عالم الغیب کہنا 139
باب:7 فرشتوں کا بیان 142
باب:8 کتب الٰہیہ کا بیان 147
باب:9 جنات کا بیان 149
باب:10 علامات قیامت 153
قیامت کی علامات دو قسم کی ہیں صغریٰ اور کبریٰ 154
قیامت کی علامات صغریٰ کا بیان 154
قیامت کی علامات کبریٰ کا بیان 155
ظہور مہدی علیہ السلام 155
خروج دجال 158
نزول عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام 158
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ ہونے اور صلیب پر چڑھائے نہ جانے کے دلائل 160
حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد شریعت محمدیہ کا اتباع کریں گے 165
خروج یاجوج و ماجوج 167
خروج دخان یعنی دھوئیں کا ظاہر ہونا 174
مغرب سے طلوع آفتاب 174
دابۃ الارض کا نکلنا 176
ٹھنڈی ہوا کا چلنا 177
حبشیوں کا غلبہ 177
آگ کا نکلنا 177
باب:11 قبر میں عذاب و راحت اور فرشتوں کا سوال ثابت ہے۔ 179

باب:12 عقائد متعلقہ عالم آخرت 184
قیامت کا آغاز کس طرح ہوگا؟ 185
قیامت برحق ہے 185
دلائل بعث بعد الموت 186
ابطال عقیدہ تناسخ 188
وزن اعمال 188
شفاعت کبریٰ 189
نامہائے اعمال کی تقسیم 190
نامہائے اعمال پڑھنے کے بعد محاسبہ شروع ہوگا 190
حوض کوثر 193
پل صراط 194
باب:13 عقیدہ شفاعت 196
شفاعت کی حقیقت 199
شفاعت کس کے لئے نہ ہوگی؟ 202
شفاعت کے لئے ضابطہ 202
شفاعت کون کرے گا 204
باب:14 جنت و دوزخ 206
جنت و جہنم حق ہیں 206
جنت اور جہنم دونوں پیدا ہو چکی ہیں اور فی الحال موجود ہیں 206
جنت اور جہنم دونوں دائمی ہیں ان کے لئے کبھی فنا نہیں ہے 209
ایک سوال اور اس کا جواب 209
دوسرا سوال اور اس کا جواب 210
اعراف حق ہے 213
آخرت میں دیدار الٰہی 214

باب:15 عقائد متعلقہ صحابہ کرام 218
تمام انبیاء کے بعد حضرت محمد ﷺ کے صحابہ کا مرتبہ ہے 219
صحابہ کرام کی خصوصیات 220
انبیاء کے بعد سب سے افضل انسان حضرت ابوبکرؓ ہیں 225
خلفائے راشدین کے بعد عشرہ مبشرہ کا درجہ 131
عشرہ مبشرہ کے بعد اہل بدر پھر اہل احد اور پھر اہل بیعت رضوان کا درجہ ہے 231
مشاجرات یعنی حضرت عثمانؓ کے بعد صحابہ کے مابین جو اختلافات پیش آئے ان کا مبنی اجتہاد ہے ہوا و ہوس نہیں 233
باب:16 تقدیر کا بیان 237
اشکالات اور ان کا حل 239
بعض اعمال سے تقدیر و قضا کے بدل جانے کی حقیقت 244
باب:17 امامت و خلافت 246
اسلامی حکومت کی تعریف۔ خلافت راشدہ 247
اسلامی حکمران 247
خلیفہ اور امیر کی شرائط 248
امامت کے بارے میں مذہب شیعہ 250
امیر مملکت اور خلیفہ کے فرائض 251
طریقہ انتخاب امیر 253
زبردستی امیر و خلیفہ بننا 254
باب:18 ایمان کا بیان 256
اصطلاح شریعت میں ایمان 256
زبان سے اقرار 257
ایمان اور اعمال صالحہ 258

ایمان کا کم و بیش ہونا 259
ایمان اور اسلام 259
قبض روح اور معائنہ عذاب دیکھ کر ایمان لانا مقبول نہیں 261
کبیرہ گناہ سے ایمان نہیں جاتا 261
کسی ویرانے میں بالغ ہونے والے اور وہ شخص جس کو دعوت
اسلام نہ پہنچی ہو ان کے اسلام و ایمان کا مسئلہ 262
باب:19 شرک کا بیان 266
شرک کی برائی 271
انبیاء کی بعثت کا اصل مقصد توحید ہے 273
شرک کے درجے اور ان کا حکم 275
شرک فی العلم 279
شرک فی التصرف 284
شرک فی العبادۃ 287
شرک فی العادات 293

تعارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله و کفی و سلام علی عباده الذین اصطفی ۔ اما بعد

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے دنیوی تعلیم سے آراستہ مسلمانوں کی دینی تعلیم کے لئے فہم دین کے نام سے ایک نصاب و کورس ترتیب دینے کی توفیق عطا فرمائی۔ کورس مندرجہ ذیل تین کتابوں پر مشتمل ہے۔

1- اسلامی عقائد

2- اصول دین

3- مسائل بہشتی زیور (2 حصے)

یہ نصاب کسی اچھے عالم دین سے پڑھا جائے جو اس کی خوب اچھی طرح تیاری کر کے پڑھائیں اور تعلیم کی ترتیب یہ ہو کہ روزانہ ایک گھنٹہ تعلیم ہو جس میں دو سبق پڑھائے جائیں۔ ہفتہ وار ناغہ کی رعایت کرتے ہوئے یہ نصاب چھ مہینے میں پورا کرایا جا سکتا ہے۔ احکام و مسائل کا سبق پورے چھ مہینے چلے جب کہ عقائد اور اصول کی کتابیں تین تین مہینے میں مکمل کی جائیں۔ پہلی سہ ماہی میں عقائد کی کتاب پڑھائی جائے اور دوسری سہ ماہی میں اصول کی کتاب کی تعلیم ہو۔ دوران تعلیم اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ سبق کے وقت میں سبق سے خارج اور غیر متعلق بحثوں میں نہ لگیں۔ البتہ طالب علموں کو سوال کرنے کی مکمل آزادی ہو بلکہ حوصلہ افزائی کی جائے اور پڑھانے والے ان کے تحقیقی جواب دیں اگرچہ مہلت لے کر ہی دیں۔

عقائد اور اصول پر اپنے دور کی ضروریات اور اپنے زمانے کے ذوق کے مطابق کوئی جامع کتاب نظر نہ آئی اس لئے ان موضوعات پر معتبر کتابوں سے متفرق مواد کو لے کر ایک جگہ ترتیب دیا گیا اور اس طرح سے اسلامی عقائد اور اصول دین کے نام سے دو کتابیں وجود میں آئیں۔

احکام و مسائل میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب ''مسائل بہشتی زیور'' کو لے کر اس کو نئے سرے سے ترتیب دیا، اس کی تسہیل کی اور بہت سے جدید مسائل اور نئے ابواب کا اضافہ کیا۔ اس طرح سے یہ اپنے موضوع پر مکمل اور UP-TO-DATE کتاب ہے۔

یہ کتابیں ان شاء اللہ پڑھنے والوں کی دینی ضروریات کو بھی پورا کریں گی۔ بہت سے ذہنی خلجان کو بھی دور کریں گی اور بہت سی گمراہیوں کے مقابلہ میں مؤثر ہتھیار ثابت ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں اور نافع خلائق بنائیں۔

زندگی کے تمام ہی شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات کے لئے الحمد للہ یہ بہت ہی مفید نصاب ہے جس کی تحصیل بہت ہی مختصر وقت میں کی جا سکتی ہے۔

وہ تمام حضرات جنہوں نے ان کتابوں کی تالیف اور نشر و اشاعت میں تعاون کیا ہے۔ خصوصاً دار الافتاء جامعہ مدنیہ کے معاون مولوی مختار احمد سلمہ۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس پر بھرپور اجر عطا فرمائیں۔

آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

عبدالواحد

دارالافتاء۔ جامعہ مدنیہ۔ لاہور

شوال المکرّم 1418ھ

عرض ثانی

اسلامی عقائد چونکہ ایک نصابی کتاب کے طور پر ہے اس لئے اس کو پڑھانے کے دوران اساتذہ کو جن باتوں میں کچھ اجمال نظر آیا اس کی اس دوسرے ایڈیشن میں تفصیل کر دی گئی جہاں کچھ اغلاق تھا اس کو کھول دیا گیا اور کہیں کہیں مضمون کی ترتیب کو بہتر بنایا گیا ہے۔ جنات کے موضوع پر ایک نئے مختصر باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس دوسرے ایڈیشن کے لئے ہمارے جامعہ مدنیہ کے ساتھی مولوی حفیظ الرحمٰن سلمہ برابر کے شریک کار رہے۔ درجہ تخصص کے طالب علم مولوی قاسم سلمہ کی محنت اور خلوص بھی قابل قدر رہے۔ مجلس نشریات اسلام، کراچی کے جناب فضل ربی صاحب کی اس دوسرے ایڈیشن کی طباعت واشاعت میں دلچسپی نے ہمت بندھائی۔ ان سب حضرات کے لئے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے بیش از بیش اپنے دین کا کام لیں اور ہم کمپوزر جناب شاہد صاحب کے لئے بھی دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے بھرپور تعاون پر دارین کا اجر عطا فرمائیں۔

عبدالواحد

جامعہ مدنیہ، لاہور

ذیقعدہ 1422ھ

تیسری گزارش

بسم اللہ حامد و مصلیاً

قارئین کے ہاتھوں میں کتاب کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے پڑی کہ کتاب کے کچھ مباحث اجمال و اختصار کے ساتھ تھے۔ ہمارے بعض ساتھیوں کا مطالبہ تھا کہ بحث کو پورا ذکر کیا جائے۔ اس مطالبہ کو مفید جانتے ہوئے مندرجہ ذیل مباحث کو قدرے تفصیل سے لکھا ہے:

اس طرح کرنے سے یہ کتاب نہ صرف طلبہ کے لیے مزید مفید ہو گئی بلکہ اہل علم کی ضرورت بھی بن گئی ہے۔

1) اعتقادی مسائل کے بارے میں ضابطہ۔

2) اللہ تعالیٰ کی صفات کیا ان کی ذات کا عین ہیں یا غیر ہیں۔

3) اللہ تعالیٰ کی صفات متشابہات۔

4) اللہ تعالیٰ کو امور قبیحہ کرنے کی قدرت ہے یا نہیں۔

5) افعال و اشیاء کے وجود میں سببیت اور شرطیت وغیرہ کو دخل ہے یا نہیں۔

6) یاجوج و ماجوج کا تعارف اور ان کا قرب قیامت میں خروج اور انجام۔

7) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں پر زندہ اٹھایا جانا اور قرب قیامت میں ان کا آسمان سے نازل ہونا۔

تعاون اور خیر خواہی کرنے والوں کے لیے دعا ہے۔

عبدالواحد

ربیع الاول ۱۴۳۷

1436ھ

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله على نواله والصلوة والسلام على سيدنا محمد بقدر حسنه وجماله وعلى اهل بيته وآله

انسان خیال کرے کہ دنیا میں ہمیشہ کوئی نہیں رہا۔ آخر ہر شخص ایک روز یہاں سے جائے گا اور آخرت میں اپنا کیا پائے گا لہٰذا ضروری ہے کہ یہاں سے کمال حاصل کر کے جائے تا کہ وہاں کے عذابوں سے بچے اور دائمی عیش و آرام پائے۔ اور وہ کمال یہ ہے کہ اپنے خالق و مالک کے سب احکام کو جانے اور مانے اور ان احکام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ کہ جن میں ہاتھ پاؤں وغیرہ اعضاء کے عمل کی حاجت ہو جیسے نماز، روزہ یعنی عبادات اور معاملات دوسرے وہ کہ جن میں اعضاء کے عمل کی حاجت نہ ہو بلکہ ان کا صرف مان لینا ہی کافی ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کو ایک جاننا اور اس کو سمیع و علیم و بصیر سمجھنا یا قیامت اور جنت و دوزخ کو حق سمجھنا۔

علماء نے لوگوں کی آسانی کی خاطر قرآن و حدیث سے پہلی قسم کے احکام نکال کر ان کو تفصیل سے جدا مرتب کیا اور اس علم کا نام فقہ رکھا اور دوسری قسم کے احکام کو الگ تفصیل سے لکھا اور اس کا نام عقائد رکھا۔

علم عقائد کو علم کلام بھی کہا جاتا ہے جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جب اس علم کی تدوین ہوئی تو ہر مسئلے کے عنوان میں لفظ کلام لایا کرتے تھے اور یوں کہا کرتے تھے الکلام فی کذا یعنی فلاں مسئلہ اور عقیدہ میں کلام شروع ہے۔ اس وجہ سے اس علم کو ہی علم کلام کہا جانے لگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کے بارے میں اس علم میں زیادہ تحقیق ہے لہٰذا اس کی وجہ سے اس کو علم کلام کہنے لگے۔

ائمہ علم کلام

امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ عقائد اور عملی احکام دونوں میں امام تھے۔ ان کے بعد مندرجہ ذیل دو حضرات علم عقائد میں زیادہ مشہور ہوئے:

1- امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ جو تین واسطوں سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں اور 333ھ میں فوت ہوئے۔ یہ ماترید جو کہ سمرقند کے قریب ایک گاؤں ہے وہاں کے رہنے والے تھے۔

2- امام ابو الحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ 260ھ میں پیدا ہوئے اور 330ھ سے اوپر میں وفات پائی۔ یہ

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔

یہ دونوں حضرات اہلسنت والجماعۃ کے عقائد میں امام ہیں۔ وہ مسائل جن میں ان کا آپس میں اختلاف ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

i- امام ماتریدی رحمہ اللہ تکوین کو مستقل صفت الٰہی مانتے ہیں جب کہ امام اشعری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ صفت قدرت ہی سے متعلق ہے۔

ii- امام ماتریدی رحمہ اللہ کے نزدیک افعال کا حسن (یعنی افعال کا مدح وثواب کے قابل ہونا) وقبح (یعنی افعال کا مذمت وگناہ کے قابل ہونا) عقل سے سمجھا جا سکتا ہے جب کہ امام اشعری رحمہ اللہ کے نزدیک ان کا پتہ شرع ہی سے چلتا ہے عقل سے نہیں۔

iii- امام ماتریدی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ کہنا کہ میں مومن ہوں انشاء اللہ جائز نہیں بلکہ فقط یوں کہنا چاہئے کہ میں مومن ہوں اور امام اشعری رحمہ اللہ کے نزدیک انشاء اللہ کو ساتھ لگانا جائز ہے۔

ان جیسے اختلافی مسائل میں شافعیہ امام اشعری رحمہ اللہ کے تابع ہیں اس وجہ سے ان کو اشعریہ اور اشاعرہ کہا جاتا ہے اور حنفی امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کے تابع ہیں اس سبب سے ان کو ماتریدیہ کہتے ہیں۔ کبھی گمراہ فرقوں کے مقابلہ میں دونوں ہی کو صرف اشاعرہ کہہ دیتے ہیں۔

شروع کے دور میں علم عقائد میں وہ دینی عقائد جو کہ قرآن وحدیث سے ثابت تھے ذکر کئے جاتے تھے جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی کتاب فقہ اکبر میں ملتا ہے۔ فلسفیانہ بحثوں کو ان میں دخل نہ تھا۔ البتہ اس وقت کے گمراہ فرقوں مثلاً معتزلہ اور خوارج وغیرہ کے رد کا اہتمام کیا جاتا تھا تاکہ عام لوگ ان کی گمراہی سے بچے رہیں۔

معتزلہ کے وجود میں آنے کا قصہ یہ ہوا کہ ایک شخص واصل بن عطاء حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی مجلس میں بیٹھتا تھا اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ کبیرہ گناہ کرنے سے آدمی نہ مومن رہتا ہے نہ کافر ہوتا ہے بلکہ ایمان وکفر کے درمیان کے ایک درجہ میں ہو جاتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا قَدْ اِعْتَزَلَ عَنَّا (یعنی یہ شخص ہم جمہور اہل اسلام سے الگ ہو گیا) کیونکہ صحیح اہل اسلام کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب اطیمان سے نہیں نکلتا۔ اسی روز سے یہ لوگ معتزلہ کہلائے جانے لگے۔ واصل بن عطا کا گروہ بھی اپنے آپ کو معتزلہ کہتا تھا اور اس نیت سے کہتا کہ اہلسنت کا عقیدہ باطل ہے اور وہ اس باطل سے جدا ہے۔ تفسیر کشاف کے مصنف زمخشری نے جو معتزلی عقیدہ رکھتا تھا اپنے لئے اسی وجہ سے ابو المعتزلہ کی کنیت اختیار کی۔ معتزلہ اپنے آپکو اصحاب العدل

والتوحید (عدل وتوحید کے علمبردار) بھی کہتے تھے۔ علی ہذا القیاس جو لوگ جمہور اہل اسلام سے عقائد میں مخالف ہوتے گئے ان کے فرقوں کے جدا جدا نام مقرر ہوتے گئے۔ مثلاً جہمیہ، مرجۂ کرامیہ، رافضیہ متشبھہ، مجسمہ اور سلفیہ۔

واصل کے بعد اس کے پیرو مدت دراز تک اپنے عقائد کو فلسفیانہ دلائل سے مدلل کر کے عوام کو بہکاتے رہے یہاں تک کہ امام ابوالحسن اشعری اور ان کے استاد ابوعلی جبائی معتزلی کے درمیان اصلح للعبد (جس میں بندے کا زیادہ فائدہ ہے) کے مسئلہ میں گفتگو ہوئی (یہ واقعہ آگے ذکر ہوگا)۔ اس مسئلہ میں ابوعلی جبائی لاجواب ہوگیا اور امام اشعری رحمہ اللہ نے معتزلہ کے عقائد کی کوتاہی پر متنبہ ہوکر ان عقائد کو ترک کیا اور انہوں نے اور ان کے پیروکاروں نے عقائد حقہ کا اثبات اور مخالفین خصوصاً معتزلہ کا رد کرنا شروع کیا۔ پھر خلفائے عباسیہ کے عہد میں منطق اور فلسفہ کا یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ کیا گیا تو بعد والوں نے مخالفین اور خصوصاً فلاسفہ کا انہی کے دلائل سے رد کرنے کی خاطر منطق اور فلسفہ سے علم کلام کو بھر دیا لیکن محققین نے علم کلام میں اس طرح کے اشتغال کو پسند نہیں کیا کیونکہ محض عقلی اور حسی تحقیق کسی حد تک کیوں نہ ہو شکوک وشبہات کی آلائش سے پاک نہیں ہوتی۔

اعتقادی مسائل کی تین قسمیں ہیں

1- بدیہی یعنی کھلے عقائد

جو بات رسول اللہ ﷺ سے ہم تک تواتر سے پہنچی ہے اس کا ثبوت قطعی کہلاتا ہے جیسے قران، فرض نمازیں اور ان کی تعداد، فرض نمازوں کی رکعات کی تعداد اور نماز کی ہیئت، رمضان کے روزوں کی فرضیت، رسول اللہ ﷺ کی ختم نبوت، فرشتوں کا وجود، کتب الٰہیہ کا نزول، قیامت کا وقوع اور جنت ودوزخ کا ثبوت۔ جن باتوں کا ثبوت قطعی ہو اگر وہ اس درجہ مشہور ہو جائیں کہ ہر خاص وعام مسلمان ان سے باخبر ہو اگرچہ اس نے ان کو سیکھا نہ ہو ایسی باتوں کو بدیہیات اور ضروریات دین کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی بھی ایک بات کا انکار کفر ہوتا ہے۔

2- غیر بدیہی عقائد

ان کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم

وہ عقائد جن کا ذکر قرآن و صحیح احادیث میں ہے اور جن کو سلف صالحین یعنی صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم نے اختیار کیا مثلاً قبر میں منکر نکیر کا سوال کرنا، قیامت کے دن وزن اعمال، پل صراط، رویت باری تعالیٰ اور اولیاء کی کرامتیں۔ ان عقائد میں مسلمانوں کا مندرجہ ذیل اختلاف ہوا:

i- بعض نے قرآن و سنت کے ظاہر کو اور سلف صالحین کے اختیار کردہ قول کو لیا اور اس کی پروا نہیں کی کہ وہ اس زمانے کے عقلی اور سائنسی اصول اور ضابطوں کے مخالف ہیں یا موافق ہیں۔ انہوں نے ان عقائد میں عقل کا استعمال کیا تو صرف مزید اطمینان کے لیے اور فریق مخالف پر رد کرنے کے لیے اس لیے نہیں کہ اس سے عقائد ایجاد کریں۔ یہ لوگ اہل السنۃ والجماعۃ ہیں۔

ii- بعض نے جب اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق ان مذکورہ بالا باتوں کے ظاہری معنی کو اپنے دور کے عقلی اور سائنسی اصول کے خلاف پایا تو انہوں نے یا تو ان کا انکار کیا یا ان کے ظاہری معنی کو چھوڑ کر تاویل کو اختیار کیا تاکہ بات کھل جائے اور اصل معنی سامنے آ جائے۔ یہ لوگ اہل سنت سے الگ بدعتی فرقے ہوئے مثلاً معتزلہ، مرجئہ، جہمیہ اور کرامیہ وغیرہ۔

دوسری قسم:

وہ عقائد جن کا ذکر قران اور مشہور حدیثوں میں نہ ہو اور سلف صالحین میں بھی ان کا ذکر نہ ملتا ہو۔ ان کی پھر مختلف اقسام ہیں:

i- دلائل نقلیہ سے ان کا استنباط کیا گیا ہو، مثلاً فرشتوں پر انبیاء کی فضیلت، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر فضیلت۔

ii- وہ امور جن پر قطعی عقائد موقوف ہوں مثلاً معجزات کا ثبوت موقوف ہے اس بات کو ماننے پر کہ سبب و مسبب کے درمیان لزوم عادی ہے یعنی جیسے آگ کا چھونا سبب ہے کپڑے کے جلنے کا اور کپڑے کا جلنا مسبب ہے اپنے سبب کا اس لیے آگ کپڑے کو چھوئے تو کپڑا عام طور سے ضرور جلتا ہے لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی عام عادت کے اعتبار سے ہے اس کو لزوم عادی کہتے ہیں اس لیے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی

خاص عادت کے تحت آگ کپڑے کو چھو لیتی ہے لیکن کپڑا جلتا نہیں ہے۔ اگر سبب و مسبب کے درمیان لزوم عقلی ہو تو پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ آگ کپڑے کو چھوئے اور کپڑا نہ جلے۔

iii- قران و سنت میں مذکور عقائد کی تفسیر و تفصیل کرنے میں جو باتیں ثابت ہوں مثلاً:

ا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے سمع و بصر کے صفات ہونے پر اتفاق کے بعد ان کی تفسیر میں اختلاف ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ ان سے مراد مسموعات و مبصرات کا علم ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ان سے مستقل صفات مراد ہیں۔

ب۔ اللہ تعالیٰ کا حی، علیم، مرید، قدیر اور متکلم ہونے پر اتفاق کے بعد ان کا مطلب بعض نے یہ لیا کہ یہ مستقل صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہیں اور بعض نے کہا کہ ان سے مراد ان کی غایتیں اور اثرات ہیں اور (سمیع و بصیر سمیت) ان سات میں اور رحمت و غضب اور جود (سخاوت) میں مذکور مراد کے اعتبار سے کچھ فرق نہیں ہے۔

ج۔ اللہ تعالیٰ کے لیے صفات متشابہات استواء علی العرش، وجہ (چہرہ) اور ضحک (ہنسنے) کے ثابت ہونے پر اتفاق کے بعد ان کو بعض نے ایسی صفات کہا جن کی مراد معلوم نہیں اور بعض نے کہا کہ ان سے ان کے مناسب معنی مراد ہیں مثلاً استواء سے مراد استیلاء و غلبہ اور وجہ سے ذات مراد ہے۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں: ''میں اس دوسری قسم میں کسی ایک فرقہ کو اہل السنۃ ہونے میں دوسرے پر فائق نہیں سمجھتا ورنہ جہاں تک خالص سنت ہونے کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ ان مسائل میں کچھ غور و فکر نہ کیا جائے جیسا کہ اسلاف کا طریقہ تھا۔''

غرض اصل صفت کو مان لینے کے بعد تفصیل و تفسیر میں اختلاف سے آدمی اہل سنت سے خارج نہیں ہوتا اور دونوں فریق اہل سنت میں سے شمار ہوں گے۔ لیکن اگر کوئی ایسی تفصیل و تفسیر کرے جو دین کی دیگر قطعیات کے مخالف و معارض ہو تو ایسا شخص اہل سنت سے خارج ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات متشابہات کے بارے میں وہ تفسیر جو کرامیہ اور سلفیہ نے کی ہے۔ اسی طرح استنباط سے اور موقوف علیہ ہونے سے جو عقیدہ حاصل ہو اس کا اگر کوئی انکار کرے تو وہ بھی اہل سنت سے خارج نہیں ہوتا۔

باب: 1

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا بیان

اللہ تعالیٰ اپنی قدیم ذات اور صفات کے ساتھ خود بخود موجود اور موصوف ہے اور اس کے سوا تمام اشیاء اسی کی ایجاد سے موجود ہوتی ہیں اور اسی کے پیدا کرنے سے عدم سے وجود میں آتی ہیں۔ خدا تعالیٰ کو خدا اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ خود بخود ہے اور اس کی ذات وصفات کے سوا تمام عالم اور اس کی تمام اشیاء حادث اور نو پیدا ہیں۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ انسانی کی ابتداء سے اس وقت تک دنیا کے ہر حصہ اور ہر خطہ میں تقریباً سب کے سب انسان خدا کے قائل رہے ہیں اور دنیا کے تمام مذاہب وملل اور ادیان سب اس پر متفق ہیں کہ خدائے برحق موجود ہے۔ جو چند ایک منکرین مذہب ہیں ان کا کہنا ہے کہ خدا کا کوئی واقعی وجود نہیں خدا محض ایک موہوم اور فرضی شے ہے جس کو انسانی دماغ نے قوانین طبعیہ (Physical Laws) سے مرعوب ہوکر اختراع کرلیا ہے اور تمام اعمال وافعال اور تمام اقوال واحوال بلکہ تمام کائنات میں اس کو مدبر اور متصرف سمجھ کر اپنے وجود کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دی اور بے وجہ اپنی امید وخوف کو اس کے ساتھ وابستہ کرلیا اور اس کو اپنا معبود سمجھ لیا ہے حالانکہ کائنات کا یہ نظام خدا کے بغیر ہی چل رہا ہے۔

منکرین خدا کا یہ دعویٰ محض فرضی وخیالی ہے جس کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں۔

وجود باری تعالیٰ پر قرآن کا طریق استدلال

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا اعتراف انسان کی اصل فطرت میں داخل ہے۔ یہی فطرت ہے جس کو قرآن مجید نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا (سورہ: اعراف:172)

ترجمہ: ’’اور جب کہ تیرے رب نے آدم کی پیٹھ سے ان کی نسل کو نکالا اور خود ان کو ان ہی پر گواہ کیا

کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ سب بول اٹھے کہ ہاں ہم گواہ ہیں۔‘‘

لیکن چونکہ خارجی اسباب سے اکثر یہ فطری احساس دب جاتا ہے اس لئے خدا نے جابجا اسی فطرت کو متنبہ کیا ہے۔

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

ترجمہ: ’’کیا اللہ کے بارے میں بھی شک ہوسکتا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔‘‘

اور چونکہ خارجی اسباب کی وجہ سے بعض اوقات یہ فطری احساس اس قدر دب جاتا ہے کہ محض اشارہ اور تنبیہ کافی نہیں ہوتی اس لئے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تجربی اور حسی مقدمات کے ذریعہ سے استدلال بھی کیا۔

انسان کو آغاز تمیز میں جن بدیہی اور حسی مقدمات کا علم ہوتا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کو مرتب، باقاعدہ اور منتظم دیکھتا ہے تو اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ کسی دانش مند نے ان چیزوں کو ترتیب دیا ہے۔ اگر کسی جگہ ہم چند چیزیں بے ترتیب رکھی دیکھیں تو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ آپ سے آپ یہ چیزیں اکٹھی ہوگئی ہوں گی لیکن جب وہ اس ترتیب اور سلیقہ سے چنی گئی ہوں کہ ایک ہوشیار صناع بھی بہ مشکل اس طرح چن سکتا ہے تو یہ خیال کبھی نہیں ہوسکتا کہ آپ سے آپ یہ ترتیب پیدا ہوگئی ہوگی۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ نظام عالم جو اس قدر باقاعدہ مرتب اور موزوں ہے وہ خود بخود قائم ہوگیا ہو۔ قرآن مجید میں خدا کے وجود پر اسی سے استدلال کیا ہے۔

صُنۡعَ اللّٰہِ الَّذِیۡ اَتۡقَنَ کُلَّ شَیۡءٍ (سورہ نمل:88)

’’یہ خدا کی کاریگری ہے جس نے ہر شے کو خوب پختہ طور سے بنایا‘‘

مَاتَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ھَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ (سورہ ملك :3)

’’رحمٰن کی کاریگری میں تم کوئی فرق نہیں پاتے ہو۔ پھر دوبارہ نظر دوڑاؤ کیا تم کوئی دراڑ دیکھتے ہو۔‘‘

خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا (سورہ فرقان: 2)

’’خدا نے ہر شے کو پیدا کیا پھر اس کا ایک اندازہ معین کیا۔

فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا (سورہ فاطر: 43)

’’خدا کے طریقے میں تم ہرگز ردوبدل نہیں پاؤ گے‘‘

ان آیتوں میں عالم کے بارے میں تین اوصاف بیان کئے ہیں۔ (1) کامل اور بے نقص ہے (2) موزوں اور مرتب ہے (3) ایسے اصول اور ضوابط کا پابند ہے جو اللہ تعالیٰ کی عام عادت میں کبھی نہیں

ٹوٹتے۔

اب دلیل یوں بنی کہ عالم اور یہ کائنات کامل اور بے نقص ہے اور موزوں ومرتب ہے اور غیر متبدل اصول کی پابند ہے اور جو چیز کامل، مرتب اور مستمر نظام والی ہوتی ہے وہ خود بخود پیدا نہیں ہو جاتی بلکہ کسی صاحب قدرت اور صاحب اختیار نے اس کو پیدا کیا ہوتا ہے لہٰذا یہ کائنات بھی کسی ایسے خالق کی تخلیق ہے جو صاحب قدرت اور صاحب اختیار ہے آخر ایسا کیوں نہ ہو؟ کیا کسی قصر شاہی کو دیکھ کر جس میں طرح طرح کے بالاخانے اور کمرے اور قسم قسم کے فرش اور قالین بچھے ہوئے ہوں اور حوض اور فوارے اس میں جاری ہوں کوئی یہ کہنے لگے کہ یہ محل ماہر کاریگروں کی کاریگری نہیں بلکہ اتفاق سے ایسی ہوا چلی کہ مٹی اور پانی کے بکھرے ہوئے ذرات میں حرکت پیدا ہوئی جس سے یہ کمرے اور یہ جنگلے اور یہ برآمدے اور یہ راستے اور یہ حوض اور فوارے خود بخود وجود میں آ گئے اور یہ قالین اور یہ کرسیاں خود بخود بن کر یہاں سج گئے۔ کیا جس شخص کے دماغ میں کچھ بھی عقل ہے وہ اس کو دیوانگی نہ سمجھے گا؟۔

ایک مرتبہ دہریوں کے ایک گروہ کے ساتھ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مناظرہ ہوا۔ امام صاحب نے ان سے فرمایا کہ تم ایسے شخص کے بارہ میں کیا کہتے ہو کہ جو یہ کہے کہ میں نے دریا میں سامان سے بھری ہوئی ایک کشتی دیکھی ہے جو اس کنارے سے خود بخود سامان لے جاتی ہے اور دوسرے کنارے پر لے جا کر اتار دیتی ہے اور دریا کی موجوں کو چیرتی ہوئی سیدھی نکل جاتی ہے اور کوئی ملاح اس کے ساتھ نہیں خود بخود سامان اس میں لد جاتا ہے اور خود بخود اتر جاتا ہے۔ ان لوگوں نے کہا یہ بات تو ایسی خلاف عقل ہے کہ کوئی عاقل اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ امام صاحب نے فرمایا افسوس تمہاری عقلوں پر۔ جب ایک کشتی بغیر ملاح کے نہیں چل سکتی تو سارے عالم کی کشتی بغیر ملاح کے کیسے چل سکتی ہے اس پر وہ مبہوت ہو گئے اور سب کے سب تائب ہو کر آپ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے۔

دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں مزید کوئی تفصیل کسی کو معلوم نہیں اس لئے اس بارے میں کچھ خیال آرائی کرنے کی ضرورت نہیں البتہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے جس کے بیان کا آگے ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ ایک ہے کوئی اس کا شریک نہیں

حق تعالیٰ ایک ہے کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ قرآن پاک میں ہے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (اے نبی خبر دیجئے کہ اللہ ایک ہے) وحدت کی ایک دلیل جو خود قرآن پاک میں ذکر کی گئی ہے یہ ہے۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (سورہ انبیاء: 22)

”اگر آسمان وزمین میں اللہ کے علاوہ اور معبود ہوتے تو یہ دونوں برباد ہوجاتے“

اس کی تفصیل یہ ہے کہ عبادت نام ہے کامل تذلل کا۔ اور کامل تذلل صرف اسی ذات کے سامنے اختیار کیا جاسکتا ہے جو اپنی ذات وصفات میں ہر طرح کامل ہو۔ اس ذات کو ہم اللہ یا خدا کہتے ہیں۔ ضروری ہے کہ خدا کی ذات ہر قسم کے عیوب ونقائص سے پاک ہو۔ نہ وہ کسی حیثیت سے ناقص ہو نہ بیکار، نہ عاجز ہو، نہ مغلوب نہ کسی دوسرے سے دبے نہ کوئی اس کے کام میں روک ٹوک کر سکے۔ اب اگر فرض کیجئے آسمان وزمین میں دو خدا ہوں تو دونوں اسی شان کے ہوں گے۔ اس وقت دیکھنا یہ ہے کہ عالم کی تخلیق اور علویات وسفلیات کی تدبیر دونوں کے کلی اتفاق سے ہوتی ہے یا گاہ بگاہ باہم اختلاف بھی ہوجاتا ہے۔

اتفاق کی صورت میں دو احتمال ہیں۔ یا تو اکیلے ایک سے کام نہیں چل سکتا تھا اس لئے دونوں نے مل کر انتظام کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں میں سے ایک بھی کامل قدرت والا نہیں اور اگر تنہا ایک سارے عالم کا کام کامل طور پر سرانجام کرسکتا تھا تو دوسرا بیکار ٹھہرا حالانکہ خدا کا وجود اس لئے ماننا پڑا ہے کہ اس کو مانے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں ہوسکتا (یعنی اس کے بغیر) کارخانہ عالم نہیں چلتا تو جو بیکار ٹھہرا وہ خدا نہیں ہوسکتا۔

اگر اختلاف کی صورت فرض کریں تو لامحالہ مقابلہ میں یا تو ایک مغلوب ہوکر اپنے ارادہ اور تجویز کو چھوڑ بیٹھے گا تو وہ خدا نہ رہا۔ اور یا دونوں بالکل مساوی ومتوازی طاقت سے ایک دوسرے کے خلاف اپنے ارادہ اور تجویز کو عمل میں لانا چاہیں گے۔ اول تو (معاذ اللہ) خداؤں کی اس رسہ کشی میں سرے سے کوئی چیز موجود ہی نہ ہوسکے گی اور موجود چیز پر زور آزمائی ہونے لگی تو اس کشمکش میں ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہوجائے گی۔ یہاں سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر آسمان وزمین میں دو خدا ہوتے تو آسمان وزمین کا یہ نظام کبھی کا درہم برہم ہوجاتا ورنہ ایک خدا کا بیکار یا ناقص وعاجز ہونا لازم آتا جو خلاف مفروض ہے۔

اگر یہ شق نکالی جائے کہ دونوں خدا باوجود کامل قدرت ہونے کے آپس میں اتفاق کرلیں اور کام بانٹ لیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی بھی وصف ہو وہ اپنا کامل ظہور چاہتا ہے اور صاحب وصف کے وصف کی

معرفت بھی اسی حساب سے ہوتی ہے جتنا اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اگر مجوسیوں کے عقیدے کے مطابق یزداں کو خالق خیر اور اہرمن کو خالق شر مانیں تو یہ کیونکر معلوم ہوگا کہ یزداں میں بھی شر کو پیدا کرنے کی اتنی ہی قوت موجود ہے جتنی کہ اہرمن میں ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہوگا کہ اگر دو خدا ہوں اور ہر ایک کامل قدرت رکھتا ہو تو ان میں سے ہر ایک اپنی پوری قوت کا اظہار کرے۔ اور ہر ایک کی کامل قوت و قدرت کا اظہار اس طرح ہوگا کہ وہ دوسرے کے مخالف کام کرے۔ اور اس صورت میں فساد و خرابی کا برپا ہونا ظاہر ہے۔

جب یہ ثابت ہوگیا کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ خدا کے لئے نہ کوئی بیٹا ہوسکتا ہے اور نہ بیٹی اس لئے کہ اولاد باپ کی ہم جنس اور ہم نوع ہوتی ہے۔ زید اگرچہ اپنے باپ کا غیر ہے مگر انسانیت میں اس کا شریک ہے۔ اس طرح اگر خدا کا بیٹا ہو تو وہ بھی خدائی میں خدا تعالیٰ کا شریک ہوگا اور خدا کی طرح وہ بھی ایک خدا ہوگا۔ اس لئے ارشاد ہے: سُبۡحَانَہٗ اَنۡ یَّکُوۡنَ لَہٗ وَلَدٌ (پاک ہے وہ اس سے کہ اس کے لئے اولاد ہو)۔

اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے

اللہ تعالیٰ قدیم ہے اور ازلی ہے وہ ہمیشہ ہمیش سے ہے۔ اس کے وجود کی کوئی ابتداء نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ کبھی پہلے نہ تھا پھر پیدا ہوگیا چنانچہ قرآن پاک میں ہے ھُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ یعنی وہ اللہ تعالیٰ اول حقیقی ہے کہ اس کے لئے ابتداء نہیں اور آخر حقیقی بھی ہے کہ اس کے لئے کوئی انتہا نہیں ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود ضروری اور لازمی ہے اور اسی کی ذات کا تقاضا ہے تو اگر عدم کے بعد وجود حاصل ہوا ہو تو ایسا اس وجہ سے ہوگا کہ وہ اپنے وجود کے لئے کسی چیز کا محتاج ہوگا جب وہ چیز پائی گئی تب اس کو وجود حاصل ہوگیا۔ لیکن ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر قسم کی احتیاج اور نقص سے پاک ہے لہٰذا ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ ہمیشہ سے ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے علاوہ کسی اور شے کے لئے ازلیت اور قدم ثابت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات

اشاعرہ و ماتریدیہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی دو قسمیں کرتے ہیں ایک صفات ذاتیہ اور دوسری صفات فعلیہ۔

صفات ذاتیہ

ان صفات کو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان کی ضد کے ساتھ موصوف نہ ہوسکے۔ امام ابوالحسن اشعری

رحمہ اللہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتیہ سات ہیں یعنی حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع اور بصر اور کلام۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ تو متصف ہے ان کی ضد یعنی موت، جہل، عجز وغیرہ کے ساتھ متصف نہیں ہوسکتا۔ یہ امہات الصفات یعنی بنیادی صفات بھی کہلاتی ہیں کیونکہ یہ صفات فعلیہ اور دیگر صفات کیلئے بمنزلہ بنیاد کے ہیں اس لئے کہ اگر حیات ہی نہ ہو تو خدا ہی نہ رہے اور علم و ارادہ نہ ہو تو کوئی فعل وجود میں نہ آئے۔

صفات فعلیہ

ان صفات کو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان کی ضد کے ساتھ موصوف ہو سکے اور ان کا تعلق غیر کے ساتھ ہو۔ جیسے مارنا اور جلانا، عزت دینا اور ذلت دینا، رزق دینا اور نہ دینا وغیرہ۔ ان صفات کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ جیسے زید کو زندگی دیتے ہیں اس طرح اس کو موت بھی دیتے ہیں اور جیسے وہ کسی کو عزت دینے کے ساتھ منصف ہیں اسی طرح وہ کسی کو ذلت دینے کے ساتھ بھی متصف ہیں۔ امام اشعری سب صفات فعلیہ کو بنیادی صفت قدرت کے ماتحت اور اس سے متعلق مانتے ہیں۔

امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ بنیادی صفات آٹھ مانتے ہیں۔ ان میں سے سات تو وہ ہیں جو اوپر صفات ذاتیہ میں مذکور ہوئیں اور آٹھویں صفت تکوین ہے۔ امام ماتریدی کے نزدیک اوپر مذکور صفات فعلیہ کی بنیاد صفت تکوین ہے۔ تکوین کا مطلب ہے وجود میں لانا تو اللہ تعالیٰ وجود میں لانے والے بھی ہیں۔ اشیاء کی پیدائش کو وجود میں لانے کے اعتبار سے وہ خالق ہیں اور عطائے رزق کو وجود میں لانے کے اعتبار سے رازق ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی تمام صفات قدیم ہیں

اللہ تعالیٰ کی تمام صفات قدیم یعنی ازلی اور ہمیشہ ہمیش سے ہیں۔ جب مخلوق ابھی پیدا بھی نہیں کی گئی تھی اللہ تعالیٰ اس وقت بھی خالق تھے کیونکہ تخلیق کی بنیاد جو کہ امام اشعری کے نزدیک صفت قدرت ہے اور امام ماتریدی کے نزدیک صفت تکوین ہے ازل سے موجود ہے۔ اس وجہ سے خالق اس کی صفت قدیم ہے۔ اس کا خالق ہونا مخلوق کے پیدا ہونے پر موقوف نہیں بلکہ مخلوق کا پیدا ہونا اس کے خالق ہونے پر موقوف ہے۔ اگر اس میں پیدا کرنے کی صفت نہ ہوتی تو یہ مخلوق کیسے پیدا ہوتی۔ اس کو مثال سے یوں سمجھئے کہ زید نے عمدہ کتابت کی۔ اس کی کتابت اس کے پہلے سے کاتب ہونے سے ہے اس کا کاتب ہونا کتابت پر موقوف نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات میں ترتیب نہیں ہے

یہ بھی جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں ترتیب زمانی نہیں ہے یعنی یہ کہنا درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو فلاں صفت پہلے حاصل ہوئی اور فلاں صفت بعد میں حاصل ہوئی۔ اس کی تمام صفات ازلی اور قدیم ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں کہ اس کا علم اس کی قدرت سے پہلے ہے یا اس کی قدرت اس کے علم کے بعد ہے یا اس کی حیات اس کے علم سے پہلے ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ سے حیی اور علیم اور قدیر ہے۔

کیا اللہ تعالیٰ کی صفات ان کی ذات کا عین ہیں یا غیر ہیں؟

ہر انسان کی ایک ذات ہوتی ہے اور اس کی کچھ صفات ہوتی ہیں جو وہ پیدا ہونے کے بعد حاصل کرتا ہے۔ علم، قدرت، کلام اور ارادہ ان سب صفات سے پیدائش کے وقت بچہ خالی ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بچے کو یہ مذکورہ صفات حاصل ہونے لگتی ہیں۔ سب سمجھتے ہیں کہ بچے میں یہ صفات پہلے نہ تھیں بعد میں آئیں لہٰذا بچے کی مذکورہ صفات بچے کی ذات پر زائد ہیں اور ذات کا غیر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات بھی ہے اور ان کی صفات ذاتیہ بھی ہیں اور یہ ہمیشہ ہمیش سے ہیں۔ صفات الٰہیہ کے بارے میں سلف صالحین نے اس پر کبھی بات نہیں کی کہ صفات اللہ تعالیٰ کی ذات کا عین ہیں یا غیر ہیں یا نہ عین ہیں نہ غیر ہیں لیکن گمراہ فرقوں نے مثلاً معتزلہ نے صفات الٰہیہ کے بارے میں فلسفیانہ انداز اختیار کیا تو اہلسنت (اشاعرہ اور ماتریدیہ) بھی مجبور ہوئے کہ معتزلہ کو ان کی زبان میں جواب دیں۔

انسان اور دیگر مخلوقات کے برعکس ایسا نہیں ہوا کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات وجود میں آئی ہو پھر اس کے بعد کبھی ذات الٰہی کو صفات حاصل ہوئی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بھی قدیم اور ہمیشہ ہمیش سے ہے اور اللہ کی صفات بھی ہمیشہ سے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ کبھی اللہ کی ذات ہو صفات نہ ہوں کیونکہ صفات کے بغیر ذات ناقص ہوتی ہے اور یہ بھی ممکن نہیں کہ کبھی صفات ہوں ذات نہ ہو کیونکہ صفات ذات کے تابع ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ قائم ہوتی ہیں ذات کے بغیر نہیں ہوتیں۔

معتزلہ کا قول: بنیادی صفات عین ذات ہیں

اس پر معتزلہ کا یہ اعتراض ہے کہ صفات اگر ذات پر زائد ہیں اور قدیم اور ازلی ہیں تو قدماء کا متعدد ہونا لازم آتا ہے حالانکہ جو چیز قدیم ہے وہ صرف اللہ کی ذات ہے اور یہی توحید کا معنی ہے۔ معتزلہ متعدد قدماء کا قول کرنے سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات پر ان کی صفات کے زائد ہونے کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفات ان کی ذات کا عین ہیں علیحدہ سے ان کا وجود نہیں ہے۔ اس طرح سے صرف

اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو قدیم ہے۔

صفات الٰہیہ کو عین ذات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جن اثرات کا اللہ تعالیٰ کی صفات سے صادر ہونے کا خیال کیا جاتا ہے معتزلہ ان کو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے صادر مانتے ہیں اس لیے وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ عالم ہیں لیکن ان میں صفت علم نہیں ہے، وہ قادر ہیں لیکن ان میں صفت قدرت نہیں ہے اور وہ حی یعنی زندہ ہیں لیکن ان میں صفت حیات نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو معلومات، مقدورات اور مسموعات سے تعلق ہوتا ہے اس وجہ سے ان کی ذات کو عالم، قادر اور سمیع کہا جاتا ہے۔

متقدمین اشاعرہ وماتریدیہ کا قول: اللہ تعالیٰ کی صفات نہ عین ذات ہیں اور نہ غیر ذات ہیں:

ایک کے دوسرے کے عین ہونے کا مطلب ہے کہ دونوں لفظ یعنی ذات اور صفت کے مفہوموں کا مصداق ہر اعتبار سے ایک ہی ہو۔

اور ایک کے دوسرے کے غیر ہونے کا مطلب ہے ان میں سے ایک دوسرے کے بغیر موجود ہوسکتا ہو۔

اس تفسیر کے مطابق ذات حق اور صفات میں نہ عینیت ہوئی نہ غیریت ہوئی۔ عینیت تو اس لئے نہ ہوئی کہ اس کے معنی ہیں دو چیزوں کا بالکل ایک ہونا اور چونکہ صفات، ذات پر زائد ہوتی ہیں تو دونوں کا مصداق تمام اعتبارات سے ایک نہ ہوا لہٰذا صفات الٰہی ذات الٰہی کا عین نہ ہوئیں۔

اور غیریت اس لئے نہ ہوئی کہ یہاں ذات اور صفات دونوں میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں کہ دوسرے کے بغیر اس کا پایا جانا ممکن ہو۔ صفات تو ذات کے بغیر اس لئے موجود نہیں ہوسکتیں کہ صفات تابع ہوتی ہیں اور ذات متبوع ہوتی ہے اور تابع کا وجود متبوع کے بغیر محال ہے۔ اور ذات صفات کے بغیر اس لئے نہیں پائی جاسکتی کہ ذات الٰہی کا صفات کمال سے خالی ہونا لازم آتا ہے اور وہ محال ہے لہٰذا ایک دوسرے کے لئے لازم ہے۔ اس لئے غیریت بھی نہ ہوئی۔

عام متاخرین اشاعرہ کا قول: صفات ذات کا غیر ہیں

متقدمین اشاعرہ کا مذکورہ بالا قول بھی تسلی بخش نہیں ہے کیونکہ صفات کے نہ عین ذات ہونے نہ غیر ذات ہونے کا حاصل یہ ہے کہ ذات و صفات کے مفہوم جدا جدا ہیں لیکن ایک دوسرے کے بغیر پائے نہیں جاتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ذات وصفات آپس میں غیر ہیں لیکن دونوں قدیم ہیں۔ اس سے قدماء کا متعدد ہونا لازم ہوا۔ اور اس قول سے کوئی ایسی صورت حاصل نہیں ہوئی جو عین ذات ہونے یا غیر ذات ہونے کے مابین کوئی درمیانی تسلی بخش صورت ہوتی۔ اسی وجہ سے متاخرین اشاعرہ نے اس جواب کو ترک کردیا اور ان کی

اکثریت نے اس بات کو اختیار کیا کہ صفات ذات کا غیر ہیں اور بعض متأخرین اشاعرہ نے صفات کو عین ذات کہا اور بعض نے سکوت اختیار کیا۔

معتزلہ کے اشکال کا جواب

جو بات توحید کے منافی ہے وہ ایک سے زیادہ قدیم ذوات کا ہونا ہے۔ صفات تو ذات کے تابع ہوتی ہیں خود ذوات نہیں ہوتیں۔ اور کوئی بھی ذات ہو کسی نہ کسی صفت کے ساتھ ضرور متصف ہوتی ہے لیکن ذات کے ساتھ قائم ہونے اور اس کے تابع ہونے اور غیر مستقل ہونے کی وجہ سے ذات کے مقابلے میں صفت کے لیے برابر کی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس لیے صفات کے قدیم ہونے سے قدماء کا متعدد ہونا لازم نہیں آتا۔

بنیادی صفات کا تفصیلی بیان

1- صفت حیات

اللہ تعالیٰ حیی ہیں یعنی زندہ ہیں اور صفت حیات ان کے لئے ثابت ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے هُوَالْحَيُّ الْقَيُّوْمُ یعنی وہ زندہ ہے اور ہر چیز کا قائم رکھنے والا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جو زندہ نہ ہو وہ عالم کو نہیں بنا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی حیات ازلی وابدی ہے جہاں موت اور فنا اور عدم کا کہیں گزر نہیں۔

2۔ صفت سمع

یعنی اس کو شنوائی اور سننے کا وصف حاصل ہے۔ وہ تمام مخلوق کی بیک وقت دعا اور آواز کو سنتا ہے اور ایک بات کا سننا اس کو دوسری بات کے سننے سے مانع نہیں ہوتا اور عالم کی مختلف زبانیں اس کو اشتباہ میں نہیں ڈالتیں وہ بیک لحظہ پرندوں کے چہچہانے اور پہاڑوں کے اندر کیڑوں کے بھنبھنانے اور صاف چکنے پتھر پر چیونٹی کے چلنے کی آواز اور دریا میں مچھلیوں کی آوازیں سنتا ہے حتیٰ کہ مچھر اور چیونٹی کی باریک نسوں میں جب خون دوران کرتا ہوا ایک بند اور جوڑ سے منتقل ہو کر دوسرے جوڑ کی طرف جاتا ہے تو وہ اس خون کے چلنے کی آواز کو صاف سنتا ہے۔ قرآن پاک میں بھی آیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ یعنی اللہ تعالیٰ سننے والا خبردار ہے۔

3۔ صفت بصر

یعنی اس کو وصف بصارت حاصل ہے کہ جس کے سبب ہر چیز کو دیکھتا ہے خواہ کوئی چیز اندھیرے میں

ہو خواہ اجالے میں خواہ نزدیک ہو خواہ دور ہو خواہ دن میں ہو خواہ رات میں ہو خواہ کتنی ہی چھوٹی ہو خواہ بڑی سب کو ہر وقت بلا تفاوت یکساں دیکھتا ہے کسی وقت میں کوئی شے اس سے چھپی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس صفت کا ذکر کئی آیات میں آیا ہے مثلاً اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ بَصِیْرٌ (یعنی اللہ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔) سورہ ملک:19-

4- صفت علم

وہ علم والا ہے جس سے آسمانوں اور زمین کا کوئی ذرہ پوشیدہ نہیں

برو علم یک ذرہ پوشیدہ نیست
کہ پیدا و پنہاں بہ نزدش یکے ست

ترجمہ: ''اس سے ایک ذرہ کا علم بھی پوشیدہ نہیں ہے کیونکہ کھلی اور چھپی چیز اس کے لئے یکساں ہے''

لہٰذا جو کچھ ہو رہا ہے اور ہوا ہے اور ہوگا ان سب باتوں کو پوری تفصیلات کے ساتھ ازل ہی میں جان لیا تھا کہ فلاں وقت فلاں شخص یہ کام کرے گا اور فلاں وقت میں یہ کچھ ہوگا یہاں تک کہ اگر ساتویں آسمان پر یا تحت الثریٰ میں مچھر اپنے پر کو ہلائے یا کوئی شخص اپنے دل میں کسی طرح کا وسوسہ لائے وہ بھی اس کو معلوم ہے اور ایسا اس لئے ہے کہ عالم کو پیدا کرنا پھر اس کو باقی رکھنا اور پرورش کرنا اور ہر شخص کے حسب حال حاجت روائی کرنا علم کے بغیر محال ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَیَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (سورہ تغابن:4)

ترجمہ: ''اللہ جانتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو اعلانیہ کرتے ہو اور اللہ کو معلوم ہے دلوں کی بات۔''

یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (سورہ حدید:4)

''اللہ جانتا ہے جو اندر جاتا ہے زمین کے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ اترتا ہے آسمان سے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھتا ہے۔''

یٰبُنَیَّ اِنَّهَا اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ (سورہ لقمان:16)

''اے بیٹے اگر کوئی چیز ہو رائی کے دانہ کے برابر کی پھر وہ ہو کسی پتھر میں یا آسمانوں میں یا زمین میں

لے آئے گا اس کو اللہ۔ بے شک اللہ جانتا ہے چھپی ہوئی چیزوں کو، خبر دار ہے۔“

ایک حدیث میں ہے:

یَامَنْ لَا تَرَاهُ الْعُيُوْنُ وَلَاتُخَالِطُهُ الظُّنُوْنُ وَلَا يَصِفُهُ الْوَاصِفُوْنَ وَلَا تَغَيِّرُهُ الْحَوَادِثُ وَلَا يَخْشَى الدَّوَائِرَ يَعْلَمُ مَثَاقِيْلَ الْجِبَالِ وَمَكَائِيْلَ الْبِحَار وَعَدَدَ قطر الْاَمْطَارِ وَعَدَدَ وَرَقِ الْاَشْجَارِ وَعَدَدَ مَا اَظْلَمَ عَلَيْهِ الَّلَيْلُ وَ اَشْرَقَ عَلَيْهِ النَّهَارُ وَلَا تُوَارِیْ مِنْهُ سَمَاءٌ سَمَائًا وَلَا اَرْضٌ اَرْضًا وَلَا بَحْرٌ مَا فی قَعْرِه وَلَا جَبَلٌ مَا فی وَعْرِہٖ۔ (حصن حصین)۔

اے وہ پاک ذات جس کو نہ اس جہان میں یہ آنکھیں دیکھ سکتی ہیں، نہ کسی کے خیال وگمان کی اس تک رسائی ہوسکتی ہے، نہ اوصاف بیان کرنے والے اس کے اوصاف بیان کر سکتے ہیں، نہ حوادث زمانہ اس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، نہ گردش روزگار کا اس کو کوئی اندیشہ ہے، جو پہاڑوں تک کے اوزان اور سمندروں تک کے پیمانے جانتا ہے، اور بارش کے قطروں تک کی تعداد اور درختوں کے پتوں تک کی گنتی کو جانتا ہے، اور رات اپنی تاریکیوں میں جن چیزوں کو چھپالیتی ہے اور دن جن چیزوں کو روشن کرتا ہے ان کی تعداد بھی جانتا ہے۔ نہ ایک آسمان دوسرے آسمان کو اس سے چھپا سکتا ہے اور نہ ایک زمین دوسری زمین کو اس سے چھپا سکتی ہے اور نہ کوئی سمندر ان چیزوں کو جو اس کی تہہ میں ہیں اس سے چھپا سکتا ہے اور نہ کوئی پہاڑ ان چیزوں کو جو اس کے غاروں میں ہیں اس سے چھپا سکتے ہیں............

پھر اللہ تعالیٰ کا علم صرف ممکنات کا ہی نہیں ہے بلکہ ان چیزوں کا بھی ہے جو اپنی ذات کے اعتبار سے واجب یا محال ہیں قرآن پاک میں ہے **وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ** یعنی اللہ تعالیٰ ہر شے سے باخبر ہے۔

5۔ صفت ارادہ ومشیت

یعنی اللہ تعالیٰ کو صفت ارادہ حاصل ہے کہ جس سے موجود یا معدوم کرنے میں کسی مقدور کو جس وقت چاہے اور جس طرح چاہے خاص کر لیتا ہے۔ لہٰذا جو بھی چیز ہوتی ہے اسی کے ارادے سے ہوتی ہے۔ اس نے ازل میں جو ارادہ کر لیا تھا اب اسی کے مطابق ہو رہا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے **فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ** یعنی جس چیز کا وہ ارادہ کرتا ہے اس کو کر لیتا ہے یہ نہیں کہ وہ کسی چیز کا ارادہ کرے پھر وہ چیز نہ ہو ورنہ عجز لازم آئے گا۔ اس لئے کہ یہ عالم کہ جس کے نظام سے عقلاء کی عقلیں حیران اور اس میں یہ گوناگوں عجائب کہ جن سے حکماء سرگردان ہیں بغیر ارادے کے پیدا کرنا محال ہے کیونکہ وہ افعال جو ارادے کے بغیر خود بخود ہوں جیسے مرتعش کے ہاتھ کی حرکتیں ان میں یہ عجیب وغریب نظام وانتظام نہیں ہوتا۔

غرض عالم کی کوئی چیز اللہ کے ارادہ اور مشیت سے باہر نہیں ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ ملائکہ اور شیاطین اور جن اور انس میں جو ارادہ ہے وہ اسی کا پیدا کردہ ہے۔ مخلوق کا ارادہ اللہ کے ارادے اور مشیت کے ماتحت ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا:

وَمَا تَشَآؤُنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعَالَمِیۡنَ (سورہ تکویر:29)

’’تم خدائے رب العالمین کے چاہے بغیر کچھ نہیں چاہ سکتے ہو۔‘‘

اس پر اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ جب پہلے ارادۂ خداوندی ہوتا ہے کہ بندہ یوں ارادہ کرے اس کے بعد بندہ ارادہ کرتا ہے تو اگر بندے کا ارادہ قبیح ہے تو اس کا موثر یعنی ارادہ خداوندی بھی قبیح ہونا چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ارادہ خداوندی ہزاروں مصلحتوں پر مشتمل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہیں اور حکیم کا کوئی ارادہ اور فعل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا اس لئے وہ قبیح نہیں جب کہ بندے کا فعل برائی مقصود ہونے کی وجہ سے قبیح ہوتا ہے۔

اس پر اگر یہ شبہ ہو کہ گو ارادۂ خداوندی میں کوئی قباحت لازم نہیں آئی مگر بندہ کا غیر مختار ہونا تو لازم آ گیا کیونکہ بندے کے ارادے کا اللہ تعالیٰ کے ارادے کے موافق ہونا ضروری ہے۔ مخالف ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ارادۂ خداوندی خاص اس طرح سے متعلق ہوا ہے کہ بندہ دل میں خیال آنے کے بعد اپنے اختیار سے اس خیال کو پختہ کرے گا اور عزم کر کے اس فعل کو کرے گا اور ہر شخص کا دل اس پر کافی گواہ ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اپنے فعل پر اپنے آپ کو با اختیار اور آزاد پاتا ہے مجبور محض نہیں پاتا۔ لہٰذا بندے کے ارادے اور اختیار کو تو اور زیادہ تاکید حاصل ہوئی اور اسکا ثبوت اور پختہ ہو گیا نہ یہ کہ بندے کا ارادہ سرے سے کالعدم ہو گیا۔

نوٹ: اس بارے میں مزید تفصیل آئندہ آئے گی۔

غرض کائنات کی تمام چیزیں پردۂ عدم میں تھیں۔ خدا تعالیٰ نے اپنے ارادہ اور اختیار سے ان کے وجود کو ان کے عدم پر ترجیح دی اور ان کے وجود کے لئے ایک زمانہ معین کر دیا۔ اس کے ارادہ کے مطابق کائنات عالم کی تمام اشیاء اپنے اپنے وقت میں اس کے حکم سے وجود میں آئیں۔

6- صفت کلام

اللہ تعالیٰ متکلم ہے یعنی کلام اس کی صفت ہے اور قدیم اور ازلی ہے اور اس کی ذات کے ساتھ قائم اور

موجود ہے لیکن اس کا کلام ہمارے کلام کی طرح نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے لئے کلام ہونے کے دلائل یہ ہیں۔

قَالَ یٰمُوْسٰی اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسَالَاتِیْ وَبِكَلَامِیْ (سورہ اعراف 144)

”کہا اے موسیٰ میں نے پیغمبری اور اپنی ہمکلامی سے دوسرے لوگوں پر تم کو امتیاز دیا ہے۔“

مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ (سورہ بقرہ:253)

”بعض ان میں وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور انکے بعض کو بہت سے درجوں میں سرفراز کیا۔“

قُلْنَا یٰآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ

”ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔“

اہل حق کے نزدیک جو کلام خدا کی صفت ہے وہ حروف و آواز سے مرکب نہیں بلکہ وہ ایک صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور اس کو کلام نفسی کہتے ہیں کیونکہ کلام اصل میں دل میں موجود مضمون اور معانی کو کہتے ہیں چنانچہ اخطل شاعر کہتا ہے۔

ان الکلام لفی الفواد و انما
جعل اللسان علی الفواد دلیلا

کلام دل میں ہوتا ہے اور زبان تو محض اس دل کے مضمون پر دلالت کرتی ہے۔ ہم لوگ دل کے اس مضمون کو کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں کبھی لکھ کر بتاتے ہیں اور کبھی اشاروں سے ظاہر کرتے ہیں۔ ہم کلام کی ادائیگی یعنی تکلم میں مخارج اور حروف اور صوت (یعنی آواز) کے محتاج ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہیں وہ ہماری طرح حروف و آواز سے تکلم نہیں فرماتے۔

اللہ تعالیٰ جب کسی سے کلام فرماتے ہیں مثلاً جیسے حضرت موسی علیہ السلام سے کلام فرمایا کہ **اِخْلَعْ نَعْلَیْكَ** (اپنی جوتیاں اتار لیجئے) (سورہ طہٰ:12)

وَمَا تِلْكَ بِیَمِیْنِكَ یٰمُوْسٰی

(اے موسیٰ آپ کے داہنے ہاتھ میں کیا ہے)

تو یہاں چند باتیں قابل لحاظ ہیں

1- امام اشعری رحمہ اللہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا کلام نفسی ہی قابل سماع ہے اگرچہ یہ عام عادت کے خلاف ہے جبکہ امام ماتریدی رحمہ اللہ بھی کلام نفسی کے سننے کو ممکن مانتے ہیں۔

2- کسی خاص شخص کے ساتھ کلام میں جیسا کہ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گفتگو میں ہوا امام اشعری رحمہ اللہ تو یہی کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کلام نفسی کو ہی سنا البتہ امام ماتریدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسی آواز سنی جو کلام الٰہی پر دلالت کر رہی تھی اور امام ماتریدی رحمہ اللہ کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلیم اللہ اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کتاب یا فرشتے کے واسطے کے بغیر کلام کیا۔

3- اللہ تعالیٰ کا کلام دو طرح کا ہے۔ ایک تو وہ ہے جو احکام و نواہی پر مشتمل ہے۔ یہ تو قدیم ہے اور اس کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم ہیں۔ دوسرا وہ ہے جو کسی مخلوق سے کسی خاص موقع پر کیا مثلاً وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا)۔

امام اشعری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ کلام کرنا بھی قدیم ہے اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم ہیں البتہ اس شرط کے ساتھ کہ جب وہ مخاطب پایا جائے گا تو اس خاص کلام کا تعلق اس مخاطب کے ساتھ ہوگا۔ مثلاً وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا) کلام نفسی میں اس قید کے ساتھ ہمیشہ سے موجود ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وجود حاصل ہوگا اور وہ ایک خاص موقع پر پہنچیں گے تو اس وقت اس کلام کا ربط و تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوگا۔ اکثر ماتریدیہ کہتے ہیں کہ تکلیم اس وقت کہتے ہیں جب دوسرے کو سنائے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ سے مکلم نہیں کہا جائے گا بلکہ صرف اسی وقت کہا جائے گا جب مخاطب کو وہ کلام سنایا جائے گا۔

قرآن پاک

قرآن پاک بھی اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور صفت قدیم ہے اس لئے اصل کے اعتبار سے تو یہ کلام نفسی پر مشتمل ہے البتہ بندے چونکہ اپنی قراءت اور تلاوت میں اور اپنی سماعت میں حروف اور صوت کے محتاج ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کو (جو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے) حروف اور کلمات کے لباس میں نازل کیا تاکہ بندے اس کو پڑھ سکیں اور سن سکیں۔

حضرت امام مجدد الف ثانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرف اور آواز کا لباس دے کر ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل فرمایا ہے اور بندوں کو اس کے ساتھ امر و نہی کا مخاطب بنایا ہے۔ جس طرح ہم اپنے

نفسی کلام کو زبان کے ذریعہ حرف اور آواز کے لباس میں لا کر ظاہر کرتے ہیں اور اس طرح اپنے پوشیدہ مطالب ومقاصد کو عرصہ ظہور میں لاتے ہیں اسی طرح حق تعالیٰ شانہ نے اپنے کلام نفسی کو بغیر زبان کے وسیلہ کے محض اپنی قدرت کاملہ سے حروف اور آواز کا لباس عطا فرما کر اپنے بندوں پر بھیجا ہے اور اپنے پوشیدہ اوامر ونواہی کو حروف اور آواز کے ضمن میں لا کر ظہور کے میدان میں جلوہ گر کیا ہے۔ پس کلام کی دونوں قسموں پر کلام کا اطلاق حقیقت کے طور پر ہے اور دونوں قسمیں یعنی کلام نفسی اور کلام لفظی حقیقۃً حق تعالیٰ کا کلام ہیں جس طرح کہ ہمارے کلام کی دونوں قسمیں نفسی اور لفظی حقیقت کے طور پر ہمارا کلام ہیں نہ یہ کہ قسم اول (کلام نفسی) تو حقیقت ہے اور دوسری قسم (یعنی لفظی) مجاز ہے۔

غرض کلام الٰہی کا اطلاق دو معنی پر ہوتا ہے۔ اول یہ کہ کلام اللہ تعالیٰ کی ایک صفت بسیط ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور اس کے قدیم ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ کلام سے وہ کلمات مراد لئے جاتے ہیں جن کو حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے کلام نفسی کے لئے بطور لباس مقرر فرمایا ہے۔ قرآن کو اللہ کا کلام اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ کلمات پر مشتمل ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے کلام نفسی کے لئے بطور لباس ہیں۔ بالفاظ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن الفاظ اور معانی کے مجموعہ کا نام ہے۔ البتہ قرآن کی قراءت اور سماعت اور کتابت یہ حادث اور مخلوق ہے۔ اس لئے کہ قراءت اور سماعت اور کتابت یہ بندے کے افعال ہیں اور بندے کے افعال حادث اور مخلوق ہوتے ہیں۔

7- صفت قدرت

اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے قدرت والا ہے کوئی شے اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے۔ کسی راہ سے وہاں عجز کا گزر نہیں ہے۔ قرآن پاک میں ہے اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ موجود کو معدوم (ختم) اور معدوم کو موجود کر سکتا ہے۔

قدرت کا تعلق ممکنات کے ساتھ ہوتا ہے یعنی ان چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے جن میں وجود اور عدم دونوں کی صلاحیت ہو۔ رہیں وہ چیزیں جن کا وجود عقلاً لازم اور ضروری ہو اور ان کا عدم محال ہو جیسے واجب الوجود یعنی خود ذات الٰہی اور صفات الہیہ تو ایسی چیزوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا تعلق نہیں ہوتا۔ اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کچھ کمی ہے بلکہ یہ وجہ ہے کہ ان چیزوں میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت اور قابلیت ہی نہیں ہے کیونکہ وہ واجب الوجود ہی کیا ہوا جس میں کسی کی تاثیر اثر کر سکے۔ اس لئے اگر کوئی یہ سوال

کرے کہ کیا خدا اپنی ذات کو یا اپنی خدائی کو یا اپنی کسی صفت کو ختم کر سکتا ہے تو جواب دیا جائے گا کہ یہ چیزیں چونکہ واجب ہیں اس لئے ان میں خدائی قدرت کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں اس لئے یہ چیزیں کبھی ختم نہیں ہوسکتیں۔ اسی طرح وہ چیزیں جو عقلاً محال ہیں یعنی جن چیزوں کا عدم عقلا ضروری اور لازم ہے اور ان کا وجود عقلاً ناممکن اور محال ہے جیسے اجتماعِ نقیضین (مثلاً زید کے وجود اور عدم کا ایک ہی وقت اور ایک ہی حالت میں جمع ہونا) تو ایسے محالات سے بھی قدرت متعلق نہیں ہوتی اس لئے کہ محالاتِ عقلی میں بھی اثر قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس کی ایک حسی مثال یہ ہے کہ سورج میں اشیاء کو گرم کرنے کی قدرت ہے لیکن بعض سنگ مرمر جو ٹھنڈے ہوتے ہیں ان ہی میں سورج کی تپش کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے مذکورہ بالا آیت میں شیٔ سے مراد صرف وہ چیزیں ہیں جو اپنی ذات میں ممکن (Possibilities) ہوں۔

خلاصہ کلام یہ کہ قدرت کا تعلق ممکنات کے ساتھ ہوتا ہے واجبات اور محالات کے ساتھ نہیں ہوتا لہٰذا اگر کوئی یہ سوال کرے کہ کیا خدا تعالیٰ کسی واجب الوجود کو معدوم اور کسی محال کو موجود کر سکتا ہے تو جواب میں یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور ارادہ کو واجبات اور محالات سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ مگر یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کو اس پر قدرت نہیں یہ بے ادبی ہے ایسی عبارت جس سے عاجزی جھلکتی ہو اللہ تعالیٰ کے لیے صحیح نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ عجز سے پاک اور منزہ ہے۔

قبائح مثلاً وعدہ اور وعید کے خلاف کرنا اور ظلم کرنا اور خلاف واقعہ بیان کرنا کیا اللہ تعالیٰ کو ان پر قدرت ہے؟

اشاعرہ کا قول

اشاعرہ کے نزدیک مذکورہ قبیح امور ممکنات میں سے ہیں محالات میں سے نہیں ہیں لہٰذا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت شامل ہیں البتہ اللہ تعالیٰ نہ ان کو کبھی کرتا ہے اور نہ کبھی کرے گا۔

اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرعون وہامان اور ابولہب کے متعلق جو یہ فرمایا ہے کہ وہ دوزخی ہیں تو یہ حکم قطعی ہے۔ اس کے خلاف کبھی نہ کرے گا لیکن اللہ ان کو جنت میں داخل کرنے پر قادر ضرور ہے عاجز نہیں ہے۔ ہاں البتہ اپنے اختیار سے ایسا نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

1-وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّىْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ(سورہ سجدہ:13)

ترجمہ: ’’اور اگر ہم چاہتے تو عطا کر دیتے ہر جان کو اس کی ہدایت لیکن پکی ہو چکی میری کہی ہوئی بات کہ مجھ کو دوزخ جنوں اور آدمیوں سے اکٹھے بھرنی ہے۔‘‘

جو بات پکی ہو چکی تھی یہ وہ تھی جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے دعوے **لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ** (میں گمراہ کروں گا ان سب کو مگر جو بندے ہیں تیرے ان میں چنے ہوئے) کے جواب میں فرمایا **فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ** (تو ٹھیک بات یہ ہے اور میں ٹھیک ہی کہتا ہوں میں ضرور بھروں گا جہنم کو تجھ سے اور ان میں سے جو تیری راہ پر چلے ان سب سے) سورہ ص :83-85)

جہنم کو انسانوں اور جنوں سے بھرنے کے قول کے باوجود یہ فرمانا **وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰهَا** (اور اگر ہم چاہتے تو عطا کر دیتے ہر جان کو اس کی ہدایت) اس آیت سے ظاہر ہو گیا کہ اگر اللہ چاہتا تو سب کو مومن بنا دیتا لیکن وہ اپنے قول کے خلاف نہیں کرتا۔ معلوم ہوا کہ اپنے قول کے خلاف کرنے کی اسے قدرت ہے لیکن وہ قدرت کے باوجود خلاف کرتا نہیں ہے۔ مذکورہ قبائح کے عقلاً محال اور ممتنع نہ ہونے کی مندرجہ ذیل تصریحات ہیں۔

2- ارشاد الٰہی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام روز محشر عرض کریں گے۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (سورہ المائدہ:118)

ترجمہ: ’’اگر آپ ان کو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور آپ ان کو معاف فرما دیں تو آپ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔‘‘

مطلب یہ ہے کہ اگر آپ ان کو ان کی بدعقیدگی یعنی شرک پر سزا دیں تو جب بھی آپ مختار ہیں کیونکہ یہ آپ کے بندے ہیں اور آپ ان کے مالک ہیں اور مالک کو حق ہے کہ بندوں کو ان کے جرائم پر سزا دے۔ اور اگر آپ ان کو معاف فرما دیں تو جب بھی آپ مختار ہیں کیونکہ آپ زبردست قدرت والے ہیں تو معافی پر بھی قادر ہیں اور حکمت والے بھی ہیں اور آپ کی معافی بھی حکمت کے موافق ہوگی اس لئے اس میں کوئی قباحت نہیں ہو سکتی۔

3- اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنا یہ ضابطہ ذکر فرمایا ہے **اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ** (اللہ اس کو معاف نہیں فرمائیں گے کہ ان کے ساتھ شرک کیا جائے) تو شرک پر عدم مغفرت کی وعید ذکر کی۔ لیکن

حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض کرر ہے ہیں کہ اگر آپ اپنے ضابطہ اور وعید کے مطابق ان کو سزا دیں تو جب بھی آپ مختار ہیں اور اگر ضابطہ اور وعید کے برخلاف آپ بالفرض ان کو معاف فرما دیں تو جب بھی آپ مختار ہیں کیونکہ آپ زبردست قدرت والے ہیں جس میں معافی بھی شامل ہے۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں۔

وَعَدَمُ غُفرَانِ الْمُشرِكِ مُقْتَضَى الوَعِيدِ فَلَا اِمْتِنَاعَ فِيهِ لِذَاتِهٖ

''یعنی مشرک کی عدم مغفرت وعید کا تقاضا ہے اور وعید کی وجہ سے ہے۔ اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ (مشرک کی مغفرت) اپنی ذات کے اعتبار سے محال اور ممتنع ہے۔''

ایک حدیث قدسی میں نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نقل فرماتے ہیں **یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی** کہ اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کرلیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ظلم نہ کرنے کو اپنی تعریف کی بات بتا رہے ہیں جب کہ تعریف ہمیشہ اس کام پر کی جاتی ہے جو اپنے اختیار اور قدرت سے ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کو ظلم پر قدرت ہی نہیں تو تعریف کس بات کی ہوئی۔ لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ظلم اور دیگر مذکورہ باتوں پر قدرت تو ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے ان کو کرتے نہیں ہیں۔

ماتریدیہ کا قول

اشاعرہ کے برعکس ماتریدیہ جو کہ عام طور سے حنفی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ چونکہ قبائح کا اللہ تعالیٰ سے صادر ہونا ناممکن اور محال ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی قدرت ان کو شامل نہیں ہے۔

شرح عقائد جلالی میں محقق دوانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

قلت الكذب نقص والنقص عليه تعالىٰ محال، فلا يكون من الممكنات، و لا يشمله القدرة كما لا يشتمل القدرة سائر وجوه النقص عليه تعالىٰ كالجهل والعجز و نفى صفات الكمال۔

(ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ جھوٹ بولنا نقص ہے اور اللہ تعالیٰ میں نقص کا ہونا محال ہے، لہٰذا یہ ممکنات میں سے نہ ہوگا، اور قدرت خداوندی اس کو شامل نہ ہوگی، جیسا کہ نقص کی دیگر صورتیں مثلاً جہل، عجز اور صفات کمال کی نفی کو قدرت الٰہی شامل نہیں ہے)۔

قاسم بن قطلو بغا رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

قال فی الکفایة قال اصحابنا رحمهم الله لا یجوز من الله تعالیٰ ان یعفو عن الکافرین و یخلدهم فی الجنة، ولا ان یخلد المؤمنین فی النار، لان الحکمة تقتضی التفرقة بین المسئ والمحسن۔ و ما یکون خلاف قضیة الحکمة یکون سفها، و انه یستحیل من اللّٰہ کالظلم و الکذب فلا یوصف الله بکونه قادراً علیه۔ ودلالة ذلك:

i- ان الله تعالیٰ ردَّ علی من حکم بالتسویة بین المسلم والمجرم بقوله:

(اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ مَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ)

(اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّئٰاتِ اَنْ نَجْعَلَهُمْ کَالَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰاتِ سَوَاءً مَحْیَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا یَحْکُمُوْنَ۔ (سوره جاثیه: 22)

ii- ولان تخلید المؤمن فی النار و تخلید الکافر فی الجنة یکون ظلماً، و انه یستحیل من اللّٰہ تعالیٰ۔ و دلالة انه ظلم، فان الظلم وضع الشئ فی غیر محله، والاسائة فی حق المحسن والاحسان و الاکرام و الانعام فی حق المسئ المعلن وضع الشئ فی غیر موضعه، فیکون ظلماً مستحیلاً من اللّٰہ تعالیٰ، و مثل هذا یعد سفهاً فی الشاهد فلا یجوز نسبة ذلك الی الله تعالیٰ عقلاً۔

(وقوله تصرف فی ملکه) قلنا التصرف فی الملك انما یجوز من الحکیم، اذا کان علی وجه الحکمة و الصواب۔ فاما التصرف علی خلاف قضیة الحکمة یکون سفهاً، و انه لایجوز۔ (حاشیة للقاسم بن قطلوبغا علی المسامرة: 177)

(ترجمہ: کفایہ میں ہے: ہمارے اصحاب (یعنی ماتریدیہ) رحمہم اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ سے یہ بات جائز نہیں کہ وہ کافروں کو معاف کر کے ان کو ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل کر دیں، اور نہ یہ بات جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل کریں، کیونکہ حکمت تقاضا کرتی ہے کہ بدکار اور نیکوکار کے درمیان فرق کیا جائے، اور حکمت کے تقاضے کے خلاف کرنا حماقت ہوتی ہے اور ظلم اور کذب کی طرح حماقت بھی اللہ تعالیٰ سے محال ہے، لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو حماقت کا کام کرنے کی قدرت ہے۔

اس کے دلائل یہ ہیں:

1- اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر رد کیا جو فرمانبردار اور نافرمان کو ایک جیسا قرار دیتے ہیں۔

الف: (اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ مَالَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ)۔

(ترجمہ: کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے۔ تمہیں کیا ہوا تم کیسا دعویٰ کرتے ہو۔)

ب: (اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَاءٌ مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَايَحْكُمُوْنَ)۔

(ترجمہ: کیا خیال کرتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کمائی ہیں برائیاں کہ ہم کر دیں گے ان کو ان لوگوں کے برابر جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، ان کا جینا اور مرنا ایک جیسا ہے۔ بُرے دعوے ہیں جو یہ کرتے ہیں۔)

2- مومن کو ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈالنا اور کافر کو ہمیشہ کے لیے جنت میں رکھنا ظلم ہے، جو اللہ سے محال ہے۔ اس کے ظلم ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ظلم شے کو اس کے غیر مقام پر رکھنے کو کہتے ہیں، اور نیکوکار کے ساتھ بُرا سلوک کرنا اور کھلے بدکار کو حسن سلوک اور انعام و اکرام سے نوازنا بھی شے کو اس کے مقام سے ہٹا کر رکھنا ہے، لہٰذا یہ ظلم ہے جو اللہ تعالیٰ سے محال ہے۔ اس جیسے کام کو انسانوں میں حماقت سمجھا جاتا ہے، لہٰذا عقل کی رو سے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا جائز نہیں ہے۔

یہ کہنا کہ مالک اپنی ملک میں جو چاہے تصرف کرے یہ ظلم نہیں ہوتا، درست نہیں کیونکہ حکمت والے کا صرف وہ تصرف جائز ہوتا ہے جو حکمت اور درستگی کے مطابق ہو۔ رہا وہ تصرف جو حکمت کے تقاضے کے خلاف ہو وہ حماقت ہوتی ہے جو جائز نہیں)۔

اما الوقوع فمقطوع بعدمه غير انه عند الاشاعرة للوعد بخلافه و عند الحنفية و غيرهم لذلك و لقبح خلافه هى خلاف الموعود به من الاثابة۔

(ترجمہ: رہا اللہ تعالیٰ سے قبیح کا وقوع تو وہ قطعی طور پر معدوم ہے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ اشاعرہ کے نزدیک اس کی وجہ قبیح کے خلاف وعدہ کرنے کی ہے، جب کہ حنفیہ کے نزدیک ایک وجہ تو یہی ہے اور دوسری وجہ ثواب کے وعدے کی خلاف ورزی کی قباحت ہے۔)

3- ابن ہمام رحمہ اللہ مسایرہ میں لکھتے ہیں:

اما ثبوتها (اى ثبوت القدرة على السفه والظلم و الكذب) ثم الامتناع عن متعلقها فبمذهب الاشاعرة اليق و لا شك ان الا متناع عنها من باب التنزيهات فيسبر العقل فى ان اى الفصلين ابلغ فى التنزيه عن الفحشاء ا هو القدرة عليه مع الامتناع عنه مختاراً او الامتناع لعدم القدرة؟ فيجب القول بادخل القولين فى التنزيه۔

(ترجمہ: حماقت، ظلم اور کذب پر قدرت کے ثابت ہونے کے بعد ان سے رکنا اشاعرہ کے مذہب کے زیادہ لائق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان باتوں سے رکنا تنزیہات کے باب سے ہے۔ تو عقل ناپے گی کہ کون سی صورت میں برائی سے تنزیہ زیادہ ہے۔ کیا برائی پر قدرت ہوتے ہوئے اس سے اپنے اختیار سے رکنے میں ہے یا قدرت نہ ہونے کی وجہ سے رکنے میں ہے۔ جس صورت میں تنزیہ زیادہ ہے اس کو اختیار کیا جائے)۔

قال قاسم بن قطلوبغا:

قلت من يجوز منه وقوع تلك الامور فامتناعه مع القدرة ابلغ، لكن البارى لايجوز منه الوقوع فلا يجوز وصفه بالقدرة عليه:

i- لان ما جاز ان يكون مقدوراًله جاز ان يكون موصوفاً به، لان تفسير كونه جائزاً ان يمكن فى العقل تقدير وقوعه، و ما يمكن فى العقل تقدير وجوده جاز ان يوصف الله تعالىٰ به، و فيه تجويز كون الله تعالىٰ ظالماً و انه محال۔

ii- ولان الظلم لو كان جائزاً منه لكان اما مع بقاء صفة العدل و هو محال لان فيه جمعاً بين الضدين و هما العدل و الظلم۔ و اما مع زوالها و هو ايضاً محال، لان صفة العدل لله تعالىٰ ازلية واجبة، و ما يكون ازلياً واجباً يستحيل عدمه۔ (حاشية لقاسم بن قطلوبغا على المسامرة: 179)

(ترجمہ: جس ذات سے حماقت، ظلم اور کذب کا وقوع جائز اور ممکن ہو اس ذات کا ان امور پر قدرت کے باوجود ان سے رکنا تو اور بڑا درجہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے ان کا وقوع جائز نہیں لہٰذا یہ بھی صحیح نہیں کہ اللہ کو اس پر قدرت کے ساتھ موصوف مانا جائے۔

i- جس ذات کے لیے ان پر قدرت ہونا ممکن ہو، اس کے لیے ان امور کے ساتھ متصف ہونا ممکن ہے، کیونکہ جائز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عقل میں اس کے وقوع کو فرض کیا جا سکے۔ اور جس کے وجود کو عقل میں فرض کیا جا سکتا ہو اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے ساتھ متصف ہونا ممکن اور جائز ہے۔ اس کی رو سے اللہ تعالیٰ کا ظالم ہونا جائز ہے، حالانکہ یہ محال ہے۔

ii- اگر اللہ تعالی کی جانب سے ظلم جائز ہو تو وہ صفت عدل کی بقاء کے ساتھ ہوگا۔ یہ محال ہے، کیونکہ اس میں ان دو چیزوں کو جمع کرنا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں یعنی عدل اور ظلم۔ یا ظلم صفت عدل کے زوال

کے ساتھ ہوگا۔ یہ بھی محال ہے، کیونکہ عدل اللہ تعالیٰ کی صفت ازلی ہے اور واجب ہے، اور جو شے ازلی اور واجب ہوتی ہے اس کا عدم محال ہوتا ہے۔)

4- کچھ یہی مضمون ابوالمعین نسفی نے اپنی کتاب ''تبصرۃ الادلۃ'' میں لکھا ہے:

فاما وجود الکذب من الباری عزوجل ففی حیز المستحیلات لما ان صفته تعالیٰ ازلی ممتنع العدم۔ و لا وجه لوجود کذبه مع وجود صدقه لاستحالة اجتماعهما۔ ولا وجه الیٰ القول بانعدام الصدق لیثبت الکذب لاستحالة العدم علی الازلی لکونه واجب الوجود۔ وانتفاء القدرة عما یستحیل دخوله تحت القدرة لایکون عن عجز بل لخروج المحل عن ان یکون قابلاً للقدرة، فلا یوجب ثبوت العجز الذی هو نقیصة منافیة للقدم...... و کذا صیرورة الظلم صفة لله تعالیٰ محال لما ان فعله الازلی عدل و افضال عندنا و یمتنع قیام الظلم به مع وجود ذلك۔ ویستحیل علی ذلك العدم، فکان محالاً فی الکذب...... (تبصرة الادلة)

(ترجمہ: رہا اللہ عزوجل سے کذب کا وجود تو یہ محال ہے، کیونکہ ان کا صدق ازلی ہے اور اس کا عدم ناممکن ہے۔ اس بات کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے کہ اللہ کے صدق کے ہوتے ہوئے اللہ کا کذب بھی موجود ہو، کیونکہ دونوں کا اجتماع محال ہے اور یہ کہنا بھی ممکن نہیں کہ اللہ کا کذب ثابت کرنے کے لیے اس کے صدق کو معدوم سمجھا جائے، کیونکہ ازلی کے وجود کے ضروری ہونے کی وجہ سے اس کا عدم محال ہوتا ہے اور جس کا قدرت کے تحت شامل ہونا محال ہو، اس کی قدرت کا انتفاء عجز کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ محل قدرت کو قبول کرنے کے قابل نہیں ہوتا، پس یہ اس نقص کا موجب نہیں ہوتا جو قدم کے منافی ہو......
اسی طرح ظلم کا اللہ کی صفت ہونا محال ہے، کیونکہ اللہ کا فعل ازلی ہمارے نزدیک عدل اور مہربانی کرنا ہے۔ اور عدل کے ساتھ ظلم کا قیام ممکن نہیں اور عدل پر عدم کا آنا محال ہے)۔

اشاعرہ کے قول کے لیے ترجیحی نکات

اگرچہ ماتریدیہ کے بعض نکات اہم ہیں لیکن اس کے باوجود زیر بحث مسئلے میں اشاعرہ کا قول وزنی ہے۔ اس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں جن کی بنیاد پر متاخرین حنفیہ نے اشاعرہ کے قول کو اختیار کیا ہے جیسا کہ ''المہند'' سے واضح ہے۔

i- ہر انسان میں جھوٹ بولنے کی قدرت ہے، یہاں تک کہ انبیاء میں بھی ہے، اس قدرت کے ہونے سے

آدمی اگرچہ جھوٹ بولنے کے ساتھ متصف ہوسکتا ہے، لیکن محض اس قدرت کے ہونے سے وہ جھوٹ کے ساتھ متصف نہیں ہو جاتا، اور اس کو جھوٹا نہیں کہا جاتا۔ جب وہ جھوٹ بولے صرف اسی وقت وہ جھوٹا بنتا ہے۔ اگر اس کے ماضی، حال اور مستقبل کا علم نہ ہو تو ممکن ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ جھوٹ کے ساتھ متصف ہوا ہو یا ہو جائے، لیکن جس کے ماضی، حال اور مستقبل کا قطعی علم ہو کہ اس نے نہ کبھی جھوٹ بولا ہے اور نہ کبھی بولے گا تو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا جھوٹ بولنا اور جھوٹ کے ساتھ متصف ہونا ممکن ہے۔

ii- انبیاء اور رسولوں کو عصمت حاصل تھی، اور عصمت کا وصف ابتلاء و آزمائش کو ختم نہیں کرتا اور اس کے باوجود ان کو قدرت حاصل تھی کہ جھوٹ بول سکیں، لیکن پھر بھی انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور نہ ہی جھوٹ کے ساتھ متصف ہوئے۔ کافر بھی ان پر یہ اعتراض نہ کر سکے کہ آپ لوگوں کو چونکہ جھوٹ بولنے پر قدرت حاصل ہے، اس لیے آپ کا جھوٹ بولنا ممکن ہے اور اس لیے آپ کی بتائی ہوئی تعلیمات بھی ممکنہ جھوٹ سے خالی نہیں اور ہم ان کے مکلّف نہیں۔ معلوم ہوا کہ جھوٹ بولنے پر قدرت کے باوجود جھوٹ نہ بولنا اور جھوٹ کے ساتھ متصف نہ ہونا ممکن ہے۔

iii- اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے محال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو اپنی ذات کے اعتبار سے محال ہو، جیسے اجتماع ضدین۔ دوسری وہ جو اللہ تعالیٰ کی شایان شان نہ ہونے کی وجہ سے اللہ سے اس کا صدور نہ ہوتا ہے۔ پہلی قسم وہ اصل محال ہے جو خالق اور مخلوق کسی کی بھی قدرت کے تحت نہیں۔ رہی دوسری قسم تو وہ اپنی ذات کے اعتبار سے ممکن ہے، جیسا کہ انسان میں جھوٹ بولنا ممکن ہے، اگرچہ وہ پوری زندگی میں کبھی جھوٹ نہ بولے۔ جب اپنی ذات کے اعتبار سے وہ ممکنات میں سے ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس پر قدرت ہونا ضروری ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں بتا دیا کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ یہ صرف نصوص اور شریعت کی بات نہیں، بلکہ عقل بھی یہ کہتی ہے کہ ممکنات پر اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کا جھوٹ سے متصف ہونا ایک عیب کی بات ہے اور صفت نقصان ہے، اس لیے اللہ کے لیے جائز نہیں کہ وہ جھوٹ بولیں۔ غرض جھوٹ بولنے کی قدرت کا ہونا اس وجہ سے ہے کہ وہ ممکنات میں سے ہے، اور اللہ تعالیٰ کا اس کے ساتھ متصف نہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ وہ صفت نقصان ہے جو کہ قبیح

عقلی ہے۔

iv- ابن ہمام رحمہ اللہ مسایرہ میں اشاعرہ کے قول کو ترجیح دیتے ہیں:

اما ثبوتها ثم الامتناع عن متعلقها فبمذهب الاشاعرة اليق و لاشك ان الامتناع عنها من باب التنزيهات فيسبر العقل فى ان اى الفصلين ابلغ فى التنزيه عن الفحشاء أ هو القدرة عليه مع الامتناع عنه مختاراً او الامتناع لعدم القدرة؟ فيحب القول بادخل القولين فى التنزيه۔ (مسامره: 179)

(ترجمہ: رہا ظلم وسفہ وکذب پر قدرت کا ثبوت، پھر ان سے امتناع تو یہ اشاعرہ کا مذہب ہے۔ اور بلاشبہ ان امور قبیحہ کا امتناع یہ تنزیہات سے ہے، لہٰذا عقل کا اس میں امتحان لیا جائے گا کہ قدرت ہونے کے بعد اپنے اختیار سے امتناع کو تنزیہ میں زیادہ دخل ہے یا عدم قدرت کی وجہ سے امتناع کو زیادہ دخل ہے؟ پھر دونوں میں سے وہ قول واجب ہوگا جس کو تنزیہہ میں زیادہ دخل ہوگا (اور ظاہر ہے کہ وہ اشاعرہ کا قول ہے جب کہ معتزلہ اور ماتریدیہ کے قول کہ امتناع عدم قدرت سے ہے اس کو تنزیہہ میں زیادہ دخل نہیں ہے)۔

V- ابن دیلمی کہتے ہیں کہ میں حضرت ابی بن کعبؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کی کہ تقدیر سے متعلق میرے دل میں کچھ شبہات پڑ گئے ہیں، لہٰذا آپ کچھ فرمائیے شاید (اس کی برکت سے) اللہ تعالیٰ میرے دل سے ان کا ازالہ فرما دے اور ایسا باطنی نور پیدا فرما دے کہ شبہات کی کھٹک ہی سینے سے نکل جائے۔ چونکہ مسئلہ تقدیر میں گفتگو اور شبہات کی تان جس جگہ پر جا کر ٹوٹتی ہے وہ انسانی جزا وسزا کا مسئلہ ہے، اس لیے حضرت ابی بن کعبؓ نے (یہاں اس دکھتی رگ کو پکڑ لیا اور اپنے کلام کا آغاز اسی سے کیا اور) فرمایا:

لو ان الله عذب اهل سماواته و اهل ارضه عذبهم و هو غير ظالم لهم۔

(سنو! عدل ہر اس تصرف کو کہتے ہیں جو اپنی ملکیت میں ہوتا ہے، اور ظلم کہتے ہیں کسی کا حق دبا لینے کو۔ اب سوچو کہ زمین وآسمان میں ایسا کون ہے جس کو ثواب دینا اللہ پر لازم اور ضروری حق ہو۔ جب یہ حق کسی کا بھی نہیں ہے تو اگر کسی کو بھی جنت عطا نہ کرے اور سب کو جہنم میں ڈال دے تو ظلم کیوں ہو، بلکہ چونکہ یہ تصرف اپنی ہی ملکیت میں ہوگا، اس لیے اس کو عین عدل کہا جائے گا۔

پیچھے ماتریدیہ کی ایک دلیل ظلم کے دوسرے معنی کے اعتبار سے ذکر ہوئی تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ مومن کو ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈالنا اور کافر کو ہمیشہ کے لیے جنت میں رکھنا ظلم ہے۔ اس کے ظلم ہونے کی دلیل یہ ہے

کہ ظلم شے کو اس کے غیر مقام پر رکھنے کو کہتے ہیں اور نیکوکار کے ساتھ برا سلوک کرنا اور کھلے بدکار کو حسن سلوک اور انعام واکرام سے نوازنا بھی شے کو اس کے مقام سے ہٹا کر رکھنا ہے لہٰذا یہ ظلم ہے...... یہ کہنا کہ مالک اپنی ملک میں جو چاہے تصرف کرے یہ ظلم نہیں ہوتا درست نہیں کیونکہ حکمت والے کا صرف وہ تصرف جائز ہوتا ہے جو حکمت اور درستگی کے مطابق ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور میں کافروں اور مشرکوں کے بارے میں عرض کریں گے ہاں اگر آپ ان کو ان کی بدعقیدگی پر سزا دیں تو جب بھی آپ مختار ہیں کیونکہ یہ آپ کے بندے ہیں اور مالک کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ان کے جرائم پر سزا دے اور اگر آپ ان کو دنیا میں ان کے توبہ کیے بغیر معاف کر دیں تو جب بھی آپ مختار ہیں کیونکہ آپ زبردست قدرت والے ہیں تو معافی پر بھی قادر ہیں اور حکمت والے بھی ہیں تو آپ کی یہ معافی بھی حکمت کے موافق ہوگی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ دنیا میں توبہ کئے بغیر جو کافر ہے اگر آپ اس کو قیامت کے دن معاف کر کے جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل کر دیں تو یہ بھی حکمت کے تحت ہوگا۔ شے کو اس کے غیر مقام پر رکھنا نہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا کون احاطہ کرسکتا ہے۔

vi- ایک حدیث قدسی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی۔

(اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کرلیا ہے)۔

اللہ تعالیٰ ظلم نہ کرنے کو اپنی تعریف کی بات بتاتے ہیں، جب کہ تعریف ہمیشہ اس کام پر کی جاتی ہے جو اپنے اختیار اور قدرت سے ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کو ظلم کرنے پر قدرت ہی نہ ہو تو تعریف کس بات کی ہوئی۔ لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ظلم وغیرہ پر قدرت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے ان کو کرتے نہیں ہیں۔

vii- حنفیہ نے جن آیتوں سے استدلال کیا ہے ان کا معنیٰ۔

قرآن پاک میں ہے:

ا: اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ كَالۡمُجۡرِمِیۡنَ مَالَكُمۡ كَیۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ۔

(ترجمہ: کیا ہم تابعداروں کو مجرم لوگوں کے برابر کردیں گے۔ تمہیں کیا ہوا۔ تم کیسا فیصلہ دیتے ہو۔)

کافروں نے یہاں دو دعوے کیے، ایک صریح اور ایک ضمنی۔ صریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تابعداروں اور مجرموں کے ساتھ یکساں سلوک کریں گے، اور ضمنی یہ ہے کہ اللہ کو اس کی قدرت ہے۔ صریح دعوے پر اللہ تعالیٰ

نے نکیر کی، لیکن ضمنی دعوے پر نکیر نہیں کی۔ اور ضابطہ یہ ہے کہ کسی کی بات قرآن پاک میں ذکر کی جائے اور اس پر نکیر نہ کی جائے تو وہ بات درست سمجھی جائے گی۔

ب: اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَجْعَلَھُمْ کَالَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ عَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ سَوَاءٌ مَحْیَاھُمْ وَ مَمَاتُھُمْ سَاءَ مَا یَحْکُمُوْنَ۔

(ترجمہ: کیا خیال کیا ہے ان لوگوں نے جنہوں نے کمائی برائیاں کہ ہم کر دیں گے ان کو مثل ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے، ان کا جینا اور مرنا ایک جیسا ہے برے دعوے ہیں جو یہ کرتے ہیں)۔

اس آیت کا بھی وہی معنیٰ ہے جو اوپر ذکر ہوا۔

viii- آدمی کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ بیک وقت اپنی دونوں ٹانگیں قیام کی حالت میں اٹھا سکے۔ اس عدم قدرت کے پیش نظر وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اپنی دونوں ٹانگیں نہیں اٹھائیں، یا میں اپنی دونوں ٹانگیں نہیں اٹھاؤں گا، بلکہ صرف یوں کہہ سکتا ہے کہ میں بیک وقت اپنی دونوں ٹانگیں نہیں اٹھا سکتا۔

اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کو ظلم کرنے کی قدرت ہی نہ ہو تو اس طرح سے کہنا درست نہیں کہ میں نے اپنے اوپر ظلم کرنے کو حرام کر لیا ہے، اس طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ ذرہ برابر ظلم نہیں کرتے، بلکہ اللہ تعالیٰ یوں کہتے کہ میں ظلم نہیں کر سکتا۔

صفت تکوین

امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک یہ صفت بھی قدیم اور ازلی ہے یعنی ہمیشہ ہمیش سے ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ جب کسی بھی شے کے وجود کا وقت جو کہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں ہے آجاتا ہے تو اس صفت کے تحت اللہ تعالیٰ اس شے کو عدم سے وجود میں لے آتے ہیں۔

تخلیق یعنی کسی شے کو پیدا کرنا، ترزیق یعنی جانداروں کو رزق دینا، تصویر یعنی جاندار و غیر جاندار کو صورت دینا، سبزہ اگانا، زندہ کرنا اور موت دینا یہ سب صفت تکوین ہی کے تحت داخل ہیں۔

امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ صفت تکوین کو علیحدہ سے مستقل صفت نہیں مانتے بلکہ تکوین کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت ہی کے ساتھ متعلق مانتے ہیں۔

اشیاء کے وجود کا تعلق کیا کلمہ کن کے ساتھ ہے؟

قرآن پاک میں ہے:

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (سورہ یٰسین: 82)

"اس کا حکم یہی ہے کہ جب وہ کسی چیز کو کرنا چاہتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔"

1- امام اشعری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اشیاء کے وجود کا تعلق اللہ تعالیٰ کے کلام ازلی کے ساتھ ہوتا ہے اور کلمہ کن اس کلام ازلی پر دلالت کرتا ہے۔

2- امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کلمہ سے مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت سے وہ شے بلا کسی تاخیر کے وجود میں آ جاتی ہے۔ غرض محض اللہ تعالیٰ کی قدرت وعظمت کا اظہار ہے خاص یہ کلمہ کہنا مراد نہیں ہے۔

3- امام فخر الاسلام بزدوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اشیاء کا وجود تکوین وایجاد اور کلمہ کن کے ساتھ خطاب دونوں سے ہی ہوتا ہے۔

ممکنات اور ان کے آثار وخواص سب اللہ تعالیٰ کی ایجاد ہیں

قرآن پاک میں ہے خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (سورہ مومن: 62) یعنی ہر ہر شے کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں لہٰذا تمام ممکنات خواہ وہ زمین وآسمان ہوں، عناصر ہوں یا افلاک وکواکب ہوں یا دیگر مخلوقات اور نفع یا نقصان دینے والی دیگر اشیاء ہوں اللہ تعالیٰ کی ایجاد سے وجود میں آئیں اس طرح ان تمام ممکنات کے خواص (Characteristics) اور آثار اور ان کی صفات اور کیفیات بھی اس قادر مختار کی ایجاد سے ہیں۔ اگر کوئی عنصر گرم ہے تو اس کی ایجاد سے گرم ہے اور اگر کوئی عنصر بارد (ٹھنڈا) ہے تو اسی کی ایجاد سے بارد ہے۔ جس طرح آگ اور پانی کا وجود اسی کا عطیہ ہے اسی طرح آگ کی حرارت اور پانی کی برودت (ٹھنڈک) بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ کوئی شے خود بخود گرم اور سرد نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ جس طرح ممکنات کے وجود کا مالک ہے کہ جب چاہے ان کے وجود کو سلب کر لے اسی طرح وہ ممکنات کی خاصیتوں اور کیفیتوں کا بھی مالک ہے جب چاہے جس ممکن کی خاصیت کو چاہے سلب کر لے مثلاً اپنے کسی برگزیدہ بندہ کے لئے آگ کی حرارت سلب کر کے اس کو بردو سلام بنا دے۔

جس طرح ممکنات اور ان کی تمام صفات اپنے وجود میں حق تعالیٰ کی محتاج ہیں اسی طرح اپنی بقا میں بھی

اس کی محتاج ہیں۔ ذات ہو یا صفت حقیقت ہو یا خاصیت ان سب کا وجود اور بقاء اسی کی مشیت اور ارادہ کے تابع ہے جب تک چاہے گا اس وقت تک وہ ذات یا وہ صفت اور خاصیت باقی رہے گی اور جب چاہے گا تو اس ذات یا اس صفت اور خاصیت کو سلب کر لے گا۔ اسی نے اسباب اور مسببات (Causes And Effects) کو پیدا کیا اور اسی نے اسباب میں سببیت پیدا کی سبب خود بخود سبب نہیں بن گیا۔ وہ جب چاہے کسی سبب کی سببیت کو سلب کر سکتا ہے اور مسبب کو بغیر سبب کے پیدا کر سکتا ہے۔

بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے

حق تعالیٰ جس طرح بندوں کی ذوات کا خالق ہے اس طرح ان کے اخلاق اور عادات اور صفات اور افعال کا بھی خالق ہے وہ افعال خواہ خیر ہوں یا شر سب اسی کی تقدیر اور علم اور ارادہ اور مشیت سے ہیں لیکن عمل خیر سے وہ راضی ہے اور عمل شر سے راضی نہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ بندوں سے کوئی فعل صادر ہو اس کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ متعلقہ اعضاء صحیح سالم ہوں، دوسرے یہ کہ بندہ خدا کی دی ہوئی قدرت کو اس فعل کے کرنے کی خاطر اعضاء کو استعمال کرنے کی طرف متوجہ کرے، تیسرے اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہو۔

قرآن پاک میں ہے:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَھَا (سورہ بقرہ :286)

یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلّف نہیں بناتا مگر اس کی طاقت و استطاعت کے موافق۔ پس جو چیز بندے کی طاقت و استطاعت سے باہر ہو عام ہے کہ وہ فی ذاتہ ممتنع (IMPOSSIBLE) ہو جیسے ضدین کو جمع کرنا مثلا بیک وقت کھڑے ہونا اور بیٹھنا یا فی ذاتہ ممکن ہو لیکن بندے سے نہ ہو سکے مثلاً جو شخص ٹانگ کٹی ہونے کی وجہ سے کھڑے ہونے سے بالکل عاجز ہو اس کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنا اللہ تعالیٰ اس کے کرنے کا حکم بندے کو نہیں دیتا۔

قدرت و استطاعت کے دو معنی ہیں۔

پہلا معنی

سلامتی اعضاء و اسباب۔

اس معنی میں استطاعت پر انسان کے مکلّف کئے جانے کا دار و مدار ہوتا ہے۔ جو شخص جس چیز کے لئے

اعضاء واسباب نہیں رکھتا اس کو اس کام کی استطاعت نہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ اس کو وہ کام کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ اور جس چیز کے اعضاء واسباب رکھتا ہوگا اس کو اس کام کی استطاعت ہے لہٰذا اس کے کرنے کی اللہ تعالیٰ بندے کو تکلیف دیتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا

”یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے ان شخصوں پر کہ کعبہ تک جانے کی طاقت رکھتے ہیں حج فرض ہے۔“

دوسرا معنی

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر قدرت کی ایک صفت بھی رکھی ہے جس کو انسان اپنے وجدان میں محسوس کرتا ہے۔ فعل کرنے سے پیشتر ہی انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے اعضاء کو حرکت دے سکتا ہے۔ اسی صفت قدرت کی وجہ سے بعض اوقات وہ شخص جس کی ٹانگیں فالج زدہ ہوں یا کٹی ہوئی ہوں بے خیالی میں اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ خیر وشر یعنی نیک وبد دونوں قسم کے اعمال کے ساتھ اس قدرت کا تعلق ہوتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ سے یہ منقول ہے:

ان القدرة صالحة للضدين عند ابى حنيفة حتى ان القدرة المصروفة الى الكفر هى بعينها القدرة التى تصرف الى الايمان لا اختلاف الا فى التعلق وهو لا يوجب الاختلاف فى نفس القدرة فالكافر قادر على الايمان المكلف به الا انه صرف قدرته الى الكفر وضيع باختياره صرفها الى الايمان فاستحق الذم والعقاب من هذا الباب (شرح فقه اكبر)

(ترجمہ) ”تو وہ قدرت جو کفر کرنے میں لگی وہ بعینہٖ وہی قدرت ہے جو ایمان اختیار کرنے میں لگ سکتی تھی۔ وہ قدرت تو ایک ہی ہے البتہ اس میں فرق ہے کہ اس کا تعلق نیک عمل کے ساتھ ہوا ہے یا برے عمل کے ساتھ۔ لہٰذا کافر کو بھی وہ قدرت حاصل ہے جو وہ مامور بہ ایمان کو اختیار کرنے میں لگا سکتا تھا لیکن اس نے اپنی قدرت کو کفر اختیار کرنے میں لگایا اور اپنے اختیار سے ایمان کے لئے نہیں لگایا لہٰذا اس وجہ سے مذمت اور سزا کا مستحق بنا۔“

لیکن اعضاء واسباب کی سلامتی اور انسان میں رکھی گئی قدرت افعال کے سرزد ہونے کے لئے کافی نہیں۔ بندہ جب اپنی قدرت کو اپنے اعضاء کے استعمال کرنے کی طرف متوجہ کرتا ہے (اسی کو بندے کا کسب کہتے ہیں) تو اللہ تعالیٰ نے اپنا معمول مقرر کر رکھا ہے کہ وہ مطلوبہ فعل کو پیدا کر دیتے ہیں۔

معتزلہ اس بات کے قائل تھے کہ بندہ اپنے افعال و اعمال کا خود خالق ہے لیکن ان کی یہ بات درست نہیں کیونکہ خود قرآن پاک میں واضح طور پر فرمایا وَاللّٰہُ خَلَقَکُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ (سورہ صافات: 96) یعنی اللہ نے تم کو بھی پیدا کیا اور جو عمل تم کرتے ہو اس کو بھی پیدا کیا۔

فعل خیر اور فعل شر دونوں کے ساتھ ارادۂ خداوندی کا تعلق

اللہ تعالیٰ کسی شے یا فعل کی تخلیق کریں اس کے لئے قدرت اور ارادہ کا ہونا ضروری ہے۔ معتزلہ اس بات کے قائل تھے کہ کسی قبیح اور شر کا خلق و ایجاد بھی قبیح ہے اور اس کا ارادہ بھی قبیح ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ شر اور قبیح کا ارادہ نہیں کرتے اور وہ اس کا دعویٰ کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کافر اور فاسق سے ایمان اور اطاعت کا ارادہ کرتے ہیں کفر اور معصیت کا نہیں۔

اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ قبیح کا خلق اور ارادہ قبیح نہیں ہوتا بلکہ قبیح کا ارتکاب اور کسب اور قبیح کے ساتھ متصف ہونا قبیح ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قبیح کا ارادہ کرنا خود قرآن پاک میں مذکور ہے۔

وَمَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّهٗ یَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا (سورہ انعام: 125)

(ترجمہ: اور جس کو چاہتا ہے کہ گمراہ کرے، کر دیتا ہے اس کے سینہ کو تنگ بے انتہا تنگ)۔

علاوہ ازیں معتزلہ کے عقیدے پر لازم آئے گا کہ بندوں کے زیادہ تر افعال اللہ تعالیٰ کے ارادے کے خلاف ہوں کیونکہ کفر اور معصیت ایمان اور اطاعت کے مقابلے میں دنیا میں زیادہ ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ایک چیز کا ارادہ کریں اور بندے اللہ کے ارادے کے خلاف عمل کر ڈالیں اس سے اللہ تعالیٰ کا شدید عاجز ہونا ظاہر ہوتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے عجز سے پاک اور برتر ہیں۔ خود قرآن پاک میں ہے فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ (اللہ تعالیٰ جس کام کا ارادہ کرتا ہے اس کو کر گزرنے والا ہے)۔

عمرو بن عبید ایک قدیم معتزلی تھا۔ خود اس کا کہنا ہے کہ جیسا الزام ایک مجوسی نے مجھے دیا ویسا الزام کسی اور نے نہیں دیا۔ اس نے قصہ بیان کیا کہ میرے ساتھ ایک کشتی میں ایک مجوسی بھی سوار تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تو مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا؟ اس نے (معتزلہ کے عقیدے کے پیش نظر) جواب دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میرے اسلام کا ارادہ نہیں کیا (یعنی تمہارا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شر کا ارادہ نہیں کرتے اور چونکہ اللہ نے میرے اسلام کا ارادہ نہیں کیا لہٰذا معلوم ہوا کہ اسلام خیر نہیں ہے بلکہ شر ہے)۔ عمرو بن عبید کہتا ہے میں نے اس مجوسی سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تو تیرے اسلام کا ارادہ کرتے ہیں لیکن شیطان تجھے نہیں چھوڑتے ہیں تو مجوسی نے جواباً

کہا کہ پھر تو مجھے غالب فریق کے ساتھ رہنا چاہئے (یعنی اللہ ارادہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں مسلمان ہو جاؤں لیکن شیطان اللہ کے ارادے کو پورا نہیں ہونے دیتے تو شیطان اللہ پر غالب ہوئے تو عقل کے مطابق دونوں میں سے جو غالب ہو اس کا عقیدہ رکھنا چاہئے نہ کہ مغلوب کا)۔

عمرو بن عبید معتزلی کا یہ غلط عقیدہ ہی تھا جس کی وجہ سے مجوسی اس کو الزام دینے پر قادر ہوا۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ اس قصہ کے بعد اس نے اپنے مذہب اعتزال کو ہی ترک کر دیا تھا۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کافر اور فاسق سے کفر اور فسق کا ارادہ کرتے ہیں لیکن خود ان کے اختیار کے ساتھ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ارادے سے وہ کفر اور فسق پر مجبور نہیں ہو جاتے جس کی بڑی دلیل کافر اور فاسق کا خود اپنا یہ احساس اور وجدان ہے کہ وہ اپنے کفر اور فسق میں با اختیار ہے مجبور نہیں ہے۔

فقط شر کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا خلاف ادب ہے لہٰذا حق تعالیٰ کو خالق شر کہنا ہرگز مناسب نہیں ہے بلکہ یا تو خالق خیر وشر کہنا چاہئے یا خالق کل شی (ہر شے کا خالق) کہنا چاہئے۔ اسی طرح خالق القاذورات اور خالق الخنازیر (نجاستوں اور خنزیروں کا پیدا کرنے والا) بھی ہرگز نہ کہنا چاہئے۔ حق تعالیٰ کی پاک جناب میں ایسا لفظ کہنا بے ادبی اور گستاخی ہے۔

اس کو ایسے سمجھیں کہ آدمی کا باپ اس کی ماں کا شوہر بھی ہوتا ہے۔ اب اگر یہ شخص اپنے والد کو بجائے والد صاحب یا ابا جی کہنے کے یوں کہے کہ اے میری ماں کے شوہر یا ان کا تعارف کرائے تو یوں کہے یہ میری ماں کے شوہر ہیں تو کتنی بے ادبی اور گستاخی کی بات ہے۔

عالم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا تعلق

فلاسفہ کہتے ہیں کہ ابتدا میں خدا کے ساتھ ایک اور شے بھی تھی جس کا نام انہوں نے مادہ اور ہیولی (Matter) رکھا ہے اور اس سے تمام کائنات کا ظہور ہوا ہے۔ یہ سب غلط ہے۔ حق یہ ہے کہ ازل میں صرف حق تعالیٰ تھا اور اس کے سوا کوئی شے نہ تھی اس نے اپنے علم اور قدرت اور ارادہ سے جس طرح چاہا کائنات کو پیدا کیا۔

اس کائنات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیا تعلق ہے اس کو شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے عبقات میں خوب واضح کیا ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الدین القیم میں اس کو سہل انداز میں یوں بیان

کیا ہے۔

''فلاسفہ اسلام اور صوفیہ کا نظریہ ہے کہ انسان کو جب کسی چیز کا علم حواس کے ذریعہ سے ہوتا ہے تو اس علمی اثر کے بعد انسان میں اس کی قدرت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنی معلوم کی ہوئی شے کو اپنی خیالی قوت سے پیدا کرے۔

فتوحات مکیہ میں شیخ ابن عربی رحمہ اللہ لکھتے ہیں **بالوھم یخلق کل انسان فی قوۃ خیالہ ما لا وجود لہ الا فیھا** (یعنی وہم سے آدمی اپنی قوت خیال میں وہ چیزیں پیدا کرسکتا ہے جن کا وجود صرف اسی میں ہے۔ اس کو ہم (مجازا) انسان کا تخلیقی عمل کہتے ہیں۔

انسان جب عالم خیال میں عمل کرتا ہے اور مثلاً یہ ارادہ کرتا ہے کہ میں ذہن کی دنیا میں بادشاہی مسجد کو پیدا کروں تو وہ اس کا خیال کرنے کے بعد ہر چیز سے منقطع ہوکر انتہائی یکسوئی کے ساتھ خیال میں قائم کی ہوئی اس عمارت کے تصور میں کچھ اس طرح منہمک اور مستغرق ہو جاتا ہے کہ وہ باتیں جواب تک اس کے تحت الشعور میں پوشیدہ تھیں وہ اس درجہ سے نکل کر اس کے تفصیلی شعور کے سامنے آ جاتی ہیں یعنی بجائے معقول ہونے کے متخیل ہو جاتی ہیں ٹھیک جیسے نیند میں آدمی بیرونی محسوسات سے منقطع ہو کر ان ہی چیزوں کے مشاہدے میں ڈوب جاتا ہے جو اس کے خزانہ خیال میں محفوظ ہوتی ہیں۔

اپنی اس خیالی اور ذہنی تخلیق سے جس قسم کے تعلقات انسان کے ہوتے ہیں قرآن پاک نے ان سارے تعلقات کو خدا اور عالم کے درمیان ثابت کیا ہے مثلاً

1- پہلا تعلق: قرآن کا دعویٰ ہے کہ حق تعالیٰ نے عالم کو بغیر مادہ کے پیدا کیا ہے جیسا کہ **بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ** کے قرآنی الفاظ کا تقاضا ہے۔ اسی کی تفسیر حدیث میں ہے کہ **کان اللہ ولم یکن معہ شئ** (عالم کو بنانے سے پہلے صرف اللہ موجود تھا اور اس کے ساتھ کوئی اور شے موجود نہ تھی) جس کے معنی یہی ہیں کہ آسمان و زمین کچھ نہ تھے اور پھر پیدا ہو گئے۔

حاصل یہ ہے کہ ابتداء میں خدا کے سوا کچھ نہ تھا یعنی مادہ وغیرہ کچھ نہیں تھا پھر خدا نے قوت کن (یعنی اپنی تخلیقی قوت) سے اس عالم کو پیدا کیا۔ ٹھیک جس طرح ہمارے خیال میں کچھ نہیں ہوتا پھر محض اپنے ارادہ سے اپنی معلومات کو ہم وجود عطا کرتے ہیں۔

2- دوسرا تعلق: اسی طرح قرآن کا بیان ہے کہ **وَمَاۤ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡ هُوَ اَقۡرَبُ** (یعنی موجودہ نظام عالم کی بربادی کے لئے یا قیام قیامت کے لئے پلک جھپکانے بلکہ اس سے بھی کم زمانہ کی

ضرورت ہے) ہم بھی جب اپنی خیالی اور علمی مخلوق مثلاً اسی بادشاہی مسجد کو جسے خیال میں پیدا کرتے ہیں اگر برباد کرنا چاہیں تو اس کے لئے لمح بصر (پلک جھپکانے) سے زیادہ وقت کی ضرورت نہیں صرف توجہ ہٹالینا کافی ہے توجہ ہٹالینے کے ساتھ ہی ہماری خیالی مخلوقات معدوم ہو جاتی ہیں اور بغیر کسی مادہ چھوڑنے کے معدوم ہو جاتی ہیں۔

3- تیسرا تعلق: ہماری خیالی اور علمی مخلوق مثلاً بادشاہی مسجد جس طرح پیدا ہونے میں ہمارے ارادہ اور توجہ کی محتاج ہے ٹھیک اس طرح ہر لحظہ اور ہر لمحہ اپنے قیام و بقا میں بھی ہماری توجہ اور التفات کی وہ دست نگر ہے۔

یہی قرآن کا بھی بیان ہے کہ خدائے تعالیٰ عالم کا صرف خالق ہی نہیں ہے بلکہ قیوم بھی ہے یعنی وہی اسے تھامے ہوئے ہے (یعنی عالم اسی سے قائم ہے) اگر ادنیٰ التفات اس کی طرف سے ہٹالے تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا جیسا کہ ارشاد ہے۔

اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ

یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ زندہ ہے (یعنی مردہ مادہ نہیں ہے) قیوم ہے (یعنی عالم کو تھامے ہوئے ہے) اسے نہ غنودگی پکڑتی ہے اور نہ نیند چھوتی ہے۔ (کیونکہ اگر ایسا ہو تو نظام عالم قائم نہیں رہ سکتا)۔

اپنے خیال میں کسی مخلوق کو پیدا کر کے یعنی تصور قائم کر کے اگر کوئی اونگھ جائے یا سو جائے تو اس کی یہ پیدا کی ہوئی مخلوق کیا باقی رہ سکتی ہے؟

4- **چوتھا تعلق**: اب اس پر غور کیجئے کہ مثلاً زید اپنی تخلیقی قوت سے عالم خیال میں جس وقت بادشاہی مسجد کو پیدا کرتا ہے کیا زید خود بادشاہی مسجد بن جاتا ہے یا بادشاہی مسجد زید بن جاتی ہے؟ ہم بلا غور وفکر کے جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کو سوچئے کہ اس خیالی اور علمی بادشاہی مسجد کا وجود زید کے وجود اور ارادہ سے کیا جدا ہے؟ اس کے ہونے کے معنی بجز اس کے اور کیا ہیں کہ اس کا ارادہ اور اس کی توجہ اس کی طرف ہے یہ نہ ہو تو بادشاہی مسجد کی نہ دیواریں ہوں نہ محراب اور نہ منبر۔ تو اسی طرح سمجھئے کہ نہ عالم خدا بن گیا ہے نہ خدا عالم بن گیا ہے اور عالم کا وجود اللہ کے وجود اور ارادہ کے بغیر کچھ نہیں۔

5- **پانچواں تعلق**: اس پر بھی غور کیجئے کہ آپ جس وقت اپنی خیالی مخلوق کو ذہن میں پیدا کرتے ہیں کیا اپنے آپ کو اس خیالی مخلوق کے کسی فوقانی، تحتانی، ظاہری و باطنی حصہ سے غائب پاتے ہیں؟ غور کیجئے کہ آپ جس طرح اپنے آپ کو اس کی دیواروں کی جڑ کے پاس پاتے ہیں اسی طرح اس کے میناروں پر بھی یقیناً

پائیں گے۔ آپ کو جو نسبت اس کے ظاہر سے ہے اس کے باطن سے بھی وہی نسبت آپ کو ہوگی۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ خالق و قیوم اس عالم کے اول میں بھی ہے اور آخر میں بھی، ظاہر میں بھی ہے اور باطن میں بھی۔ ارشاد ہوتا ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُوَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَیٍٔ عَلِيُمٌ (سورہ حدید:3)

''وہی اول ہے وہی آخر ہے وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے اور وہی ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

لیکن فرمایا جاتا ہے کہ خدا عرش پر ہے کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ وہ انسان کی رگ گردن کے پاس بھی ہے۔ خود ہی غور کیجئے۔ ایک خالق اور اس کی مخلوق میں اس کے سوا اور نسبت ہی کیا ہوتی ہے؟ آخر آپ بھی تو اپنے آپ کو اپنی خیالی بادشاہی مسجد کے میناروں پر بھی پاتے ہیں اور اس کی دیوار کی جڑوں کے پاس بھی۔ پھر اگر اس عالم کا خالق اگر عرش پر بھی ہو اور آپ کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہو تو اس کے سوا اور عقل سوچ ہی کیا سکتی ہے۔

6- چھٹا تعلق: اب دیکھئے بادشاہی مسجد ایک طویل و عریض عمارت ہے۔ آپ اپنے ذہن میں جس وقت اسے پیدا کرتے ہیں اس طول و عرض کے ساتھ پیدا کرتے ہیں۔ اس لمبائی اور چوڑائی کے باوجود آپ اپنے آپ کو کیا اس کے ذرہ ذرہ پر محیط نہیں پاتے؟ قرآن بھی یہی کہتا ہے **وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیٍٔ مُّحِيطٌ** (اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے)۔

7- ساتواں تعلق: آپ جس وقت اپنے ذہن میں کسی پہاڑ یا کسی شہر کو پیدا کرتے ہیں کیا اس ذہنی خیال یا علمی مخلوق میں کسی دوسرے کے ارادے سے کوئی چیز اپنی جگہ سے ہل سکتی ہے۔ غور کیجئے اس کا ہر ذرہ آپ ہی کی مرضی اور آپ ہی کے ارادہ کا پابند ہے دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے۔

اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ(سورہ یونس:107)

''اگر چھوئے اللہ تجھے کسی ضرر کے ساتھ تو اسے کوئی کھولنے والا نہیں لیکن وہی۔ اور وہ اگر ارادہ کرے تیرے ساتھ بھلائی کا کوئی اس کی مہربانی کا پلٹانے والا نہیں ہے۔''

یعنی اس عالم کے کسی حصہ میں کوئی واقعہ بھی ہو اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اذن کے بغیر نہیں ہو سکتا اور کسی

دوسرے کا تصور یا ارادہ یا فعل اس میں قطعاً موثر نہیں ہوسکتا۔

8- آٹھواں تعلق: آپ جب خیالی بادشاہی مسجد کو پیدا کرتے ہیں تو جہاں آپ ہوتے ہیں کیا بادشاہی مسجد بھی وہیں نہیں ہوتی۔ جب ایسا ہے تو خدا نے جب عالم کو پیدا کیا اور خدا اس کا خالق اور وہ اس کا مخلوق ہے تو اس کے بعد یہ سوال کتنا بے معنی ہو جاتا ہے کہ عالم کہاں ہے اور خدا کہاں ہے؟ جب قرآن میں فرمایا گیا ھو مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تو لوگوں کو تعجب ہوا کہ جہاں ہم ہوتے ہیں وہیں خدا کس طرح ہوسکتا ہے لیکن لوگ اپنی ذہنی تخلیق کے متعلق نہیں سوچتے کہ جہاں وہ ہوتے ہیں وہیں ان کی وہ تخلیق بھی ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ اگر آدمی اپنی ذہنی مخلوقات کے متعلق غور کرے تو کیا اپنے آپ کو ان کے نیچے یا اوپر یا کسی اور سمت میں پاتا ہے؟ یقیناً خالق و مخلوق میں کوئی ایسی سمتی نسبت نہیں ہوتی۔ پھر کیا ہوا اگر قرآن میں اعلان کیا گیا کہ اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ یعنی جدھر تم رخ کرو گے وہیں خدا ہے۔

صفات متشابہات

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے لیے ید (ہاتھ) وجہ (چہرہ) ساق (پنڈلی) اور استوی علی العرش (عرش پر مستوی ہوا) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان سے اللہ تعالیٰ کی وہ صفات مراد ہیں جن کا ظاہری مطلب مراد نہیں ہے۔ چونکہ قرآن پاک میں ان کا ذکر ہے اس لیے ان پر ایمان رکھنا ضروری ہے لیکن اس طور پر کہ ہمیں ان کا معنی نہیں بتایا گیا اور ان سے جو بھی اللہ کی مراد ہے وہ حق ہے۔

صفات متشابہات کے بارے میں:

1- اہلسنت جو کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ ہیں ان کے متقدمین کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں لیکن ان کا ظاہری معنی مراد نہیں ہے اور ان کا کوئی معنی متعین کئے بغیر ہم ان کی مراد کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتے ہیں اور ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک ان کے جو بھی معنی ہیں وہ حق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی شایان شان ہیں۔ صفات متشابہات کے بارے میں اس نظریے کو تفویض کہا جاتا ہے۔

فقہ اکبر میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فما ذكره الله تعالىٰ فى القرآن من ذكر الوجه و اليد و النفس و العين فهوله صفات ولا يقال ان يده قدرته او نعمته لان فيه ابطال الصفة و هو قول اهل القدر والا عتزال ولكن يده صفته بلا كيف۔

ترجمہ: قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے وجہ اور ید اور نفس اور عین کا ذکر کیا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مستقل صفات ہیں۔ اور یہ نہ کہنا چاہئے کہ ید (ہاتھ) سے اللہ کی قدرت یا نعمت مراد ہے اس لیے کہ اس طرح کہنے سے اللہ تعالیٰ کی صفات کا بطلان لازم آتا ہے (کیونکہ قدرت کا اللہ کی صفت ہونا معلوم ہے۔ ید سے مراد بھی اگر قدرت ہی ہو تو یہ علیحدہ صفت نہ ہوئی اورس کا علیحدہ مستقل صفت ہونا باطل ہوا)۔ اور مثلاً ید سے قدرت مراد لینا معتزلہ اور قدریہ کا طریقہ ہے۔ (امام اعظم رحمہ اللہ کہتے ہیں) اس کے بجائے یوں کہنا چاہئے کہ مثلاً ید اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو کیفیت سے پاک ہے۔ (اور اس سے اللہ کی کیا مراد ہے وہ اللہ کے حوالے ہے)۔

2- اہلسنت یعنی اشاعرہ و ماتریدیہ کے متاخرین کے نزدیک بھی اصل تفویض ہے لیکن چونکہ اسلاف سے بعض جگہ تاویل منقول ہے اس لیے یہ حضرات عوام کو گمراہوں کی گمراہی سے بچانے کے لیے تاویل کرنے کو جائز کہتے ہیں۔ یہاں تاویل سے مراد ہے ظاہری معنی کو چھوڑ کر اللہ کے شایان شان کوئی اور مطلب لینا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول تاویل کی مثال یہ ہے:

ابن قدامہ اپنی کتاب ذم التاویل میں لکھتے ہیں:

ثم لو كان تاويلا فما نحن تاولنا و انما السلف رحمة الله عليهم الذى ثبت صوابهم و وجب اتباعهم هم الذين تاولوه فان ابن عباس و الضحاك و مالكا و سفيان و كثيرا من العلماء قالوا فى قوله و هو معكم اى علمه۔

’’ترجمہ: پھر اگر یہ تاویل ہی ہو تو یہ تاویل ہم نے نہیں کی۔ یہ تاویل ان سلف نے کی ہے جن کی درستگی ثابت ہے اور جن کا اتباع واجب ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ضحاک اور مالک اور سفیان ثوری اور دیگر بہت سے اہل علم ہیں رحمہم اللہ جنہوں نے وَ هُوَ مَعَكُمْ وہ تمہارے ساتھ ہے کا مطلب یہ بتایا کہ اللہ کا علم تمہارے ساتھ ہے)۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب عقیدہ واسطیہ کی شرح میں خلیل ہراس لکھتے ہیں:

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ قال ابن عباس اى علمه۔

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ۔ (وسیع ہے اس کی کرسی)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ اللہ کا علم وسیع ہے۔

3- بدعتی فرقہ معتزلہ کے نزدیک ظاہری معنی کو چھوڑ کر تاویل کرنا واجب ہے مثلاً ید سے قوت و قبضہ اور وجہ

سے ذات الٰہی مراد لینا واجب سمجھتا ہے۔ اس فرقہ کی دلیل یہ ہے کہ اگر ان سے ظاہری ہاتھ اور چہرہ ہی مراد ہو تو اللہ تعالیٰ مخلوق کی مثل ہو جائیں گے حالانکہ قرآن پاک میں ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شيءٌ (اس کی مثل کوئی شے نہیں ہے)۔

معتزلہ کی بات درست نہیں ہے کیونکہ ہم جب اللہ تعالیٰ کے لیے صفت ید مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا وہ معنی ہے جو اللہ کی شایان شان ہے اور اللہ اسے جانتے ہیں ہم اسے نہیں جانتے تو ہم لفظ کو معنی سے خالی نہیں کہتے اور کہتے ہیں کہ اس کا معنی ہے لیکن ہم اسے نہیں جانتے ہم اس کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں۔

4- ایک فرقہ سلفی کے نام سے مشہور ہے۔ سلفیوں کے نزدیک ان صفات کے ظاہری معنی مراد ہیں مثلاً ید (ہاتھ) سے وہ کام کرنے والا عضو مراد لیتے ہیں البتہ اس کی کیفیت یعنی شکل وصورت کو غیر معلوم کہتے ہیں۔

سلفی لوگ اس کے دعویدار ہیں کہ وہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے طریقے پر چلتے ہیں لیکن امام احمد رحمہ اللہ دیگر اہلسنت کی طرح تفویض اور تاویل کرتے تھے اور ظاہری معنی مراد نہیں لیتے تھے۔

امام احمد تاویل کرتے ہیں

(i) حکی حنبل عن الامام احمد انه سمعه یقول احتجوا علی یوم المناظرة فقالوا تجئ یوم القیامة سورة البقرة و تجئ سورة تبارك قال فقلت لهم انما هو الثواب قال اللّٰه جل ذکره و جاء ربك و الملك صفا صفا و انما تاتی قدرته۔ (العقیده و علم الکلام ص 504)

(ترجمہ: امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا کہ مناظرہ کے دن فریق مخالف نے میرے خلاف یہ دلیل دی کہ حدیث میں ہے کہ سورہ بقرہ اور سورہ تبارک قیامت کے دن آئیں گی۔ میں نے جواب دیا کہ اس سے مراد ان کا ثواب ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (یعنی اس کی قدرت آئے گی)۔

(ii) قال ابن حزم الظاهری روینا عن الامام احمد بن حنبل رحمه الله فی قوله تعالیٰ وجاء ربك انما معناه جاء امر ربك کقوله تعالیٰ هل ینظرون الا ان تاتیهم الملائکة او یاتی امر ربك۔ و القرآن یفسر بعضه بعضا هکذا نقله ابن الجوزی فی تفسیره زاد المسیر (العقیده و علم الکلام ص 504)

(ترجمہ: ابن حزم ظاہری نے نقل کیا کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے وجاء ربك اور تمہارا رب آیا کے

بارے میں فرمایا کہ اس سے مراد ہے وہ تمہارے رب کا حکم آیا جیسا کہ اس آیت میں ہے:

هَلۡ يَنۡظُرُوۡن اِلَّا اَنۡ تَاتِيَهُـم الۡمَلَائِكَةُ اَوۡ يَاتِىَ اَمۡرُ رَبِّكَ۔ (نحل: 33)

(وہ نہیں انتظار کرتے مگر اس کا کہ آئیں ان کے پاس فرشتے یا آئے تمہارے رب کا حکم۔) اور قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی تفسیر کرتا ہے۔ اسی طرح سے ابن الجوزی نے اپنی تفسیر زاد المسیر میں نقل کیا ہے۔

ان روایتوں کے مطابق امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے تاویل کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ تفویض کرتے ہیں

i- لما سئل الامام احمد عن احاديث النزول والروية و وضع القدم و نحوها قال نومن بها و نصدق بها ولا كيف ولا معنى۔ (اثبات الحد لله ص 218, 219)

(ترجمہ: امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے نزول، رویت اور پاؤں رکھنے کی حدیثوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ہمارا ان پر ایمان ہے اور ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں بغیر کیفیت کے اور بغیر معنی کے۔)

(ii) و كان الأمام احمد رحمه الله يقول امرو ا الا حاديث كما جاء ت و على ما قال جرى كبار اصحابه كابراهيم الحربى و ابى داؤد والاثرم و من كبار اتباعه ابو الحسن المنادى و كان من المحققين و كذلك ابو الحسين التميمى و ابو محمد رزق الله بن عبدالوهاب و غيرهم من اساطين الائمة فى مذهب الامام احمد و جروا على ما قاله فى حالة العافية و فى حالة الابتلاء...... (العقيده و علم الكلام 285)

(ترجمہ: امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ احادیث کو ایسے ہی چلاؤ جیسی کہ وہ ہیں...... یعنی ان کے الفاظ کو چلاؤ کسی بھی معنی کی تعیین کئے بغیر...... اور جیسے انہوں نے فرمایا ان کے بڑے شاگردوں نے ویسا ہی طریقہ اختیار کیا مثلاً ابراہیم حربی، ابو داؤد اور اثرم نے اور ان کے بڑے پیروکاروں میں سے ابو الحسین منادی نے جو کہ محقق لوگوں میں سے تھے۔ اسی طرح ابو الحسن تمیمی اور ابو محمد رزق اللہ بن عبد الوہاب وغیرہ نے جو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے ستونوں میں سے تھے انہوں نے بھی موافق و مخالف ہر قسم کے حالات میں اسی طرح عمل کیا۔)

امام احمدؒ صفات متشابہات کی تفسیر میں سلفیوں سے اختلاف کرتے ہیں۔

طبقات الحنابلۃ میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ عقیدہ مذکور ہے:

”اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں ان کی صفات ہیں کام کرنے کے اعضاء نہیں ہیں اور اللہ مرکب نہیں ہیں۔ اور وہ نہ جسم ہیں اور نہ اجسام کی جنس سے ہیں اور نہ محدود و ترکیب کی جنس سے ہیں اور نہ ابعاض ہیں اور نہ جوارح اور نہ ان پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ اللہ کی کہنی ہے اور نہ بازو ہے اور نہ ہاتھ کے لفظ کا استعمال جن جن معانی کا تقاضا کرتا ہے ان میں سے ہیں سوائے ان کے جن کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہو یا جو نبی ﷺ کی صحیح حدیث میں ہو۔“

سلفیوں کی ایک اور غلطی: سلفیوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو عالم سے باہر ہونا چاہیے لیکن خود ان کے کہے کے مطابق وہ اس کے اندر بھی ہیں

سلفیوں نے استوی علی العرش کا یہ مطلب بنایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے جدا ہیں اور عرش جو کہ پورے عالم کو گھیرے ہوئے ہے اللہ تعالیٰ اس کے اوپر ہیں یا اس پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

ایک سلفی علامہ عثیمین لکھتے ہیں:

فنحن نؤمن بان الله بائن من خلقه ... و نؤمن بان الله فوق العرش استوی علیه

(ترجمہ: ہم ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے جدا ہیں....... اور ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہیں)۔

علامہ عثیمین یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عالم کل کا کل اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور اس عالم کی جو خارجی تہہ ہے وہ عرش الٰہی ہے اور اللہ تعالیٰ چونکہ عرش سے بھی کچھ اونچے ہیں یا عرش پر بیٹھے ہیں تو ان کی ذات تمام مخلوق سے جدا ہوئی۔

لیکن سلفی اپنے اس عقیدے کو بھی بلا کسی تردد کے مندرجہ ذیل طریقوں سے توڑتے ہیں:

1- کرسی عرش کے اندر کی چیز ہے اور مخلوق ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے پاؤں رکھنے کی جگہ ہے۔

ایک اور سلفی علامہ خلیل ہراس عقیدہ واسطیہ پر اپنی شرح میں لکھتے ہیں:

ان کرسیه قد وسع السماوات و الارض جمیعا۔ و الصحیح فی الکرسی انه غیر العرش و انه موضع القدمین و انه فی العرش کحلقة ملقاة فی الفلاة۔

(ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی کرسی تمام آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ کرسی عرش سے علیحدہ شے ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے قدموں کی جگہ ہے اور کرسی عرش کے مقابلے میں ایسے ہے

جیسے ریگستان میں پڑا ہوا چھلا)۔

2- جب تہائی رات رہ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ عرش سے آسمان دنیا پر اتر آتے ہیں یا پھیل کر اس تک پہنچ جاتے ہیں۔ عرش اور عرش کے اندر جو کچھ ہے چونکہ سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے تو اللہ تعالیٰ مخلوق میں داخل ہوئے مخلوق سے باہر نہ ہوئے۔

3- ابن تیمیہ سمیت تمام سلفی اس بات کے قائل ہیں کہ قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کو جو مقام محمود عطا ہوگا اس کے دو معنیٰ ہیں (i) شفاعت کبریٰ اور (ii) اللہ تعالیٰ کے عرش پر بیٹھنے کا اعزاز۔ مشہور غیر مقلد عالم مولانا یوسف صلاح الدین اپنے تفسیری حواشی میں لکھتے ہیں ’’یہ بھی ممکن ہے کہ اس عرش سے مراد وہ عرش ہو جو فیصلوں کے لیے زمین پر رکھا جائے گا جس پر اللہ تعالیٰ نزول اجلال فرمائے گا‘‘ اور ظاہر ہے کہ یہ عرش اس بڑے عرش کے اندر ہوگا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات عالم سے مباین اور جدا نہ ہوئی بلکہ اس کے اندر ہوئی۔

میدان حشر بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہوگا اور عرش کے گھیراؤ کے اندر ہوگا اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن نزول اجلال فرمائیں گے تو عالم کے اندر داخل ہو جائیں گے جدا نہیں رہیں گے۔

4- اللہ تعالیٰ جہنم پر اپنا پاؤں رکھیں گے۔ جہنم بھی عالم کا ایک حصہ اور مخلوق ہے تو اللہ تعالیٰ کا پاؤں مخلوق سے جدا نہ ہوا۔

اسماءِ حسنیٰ

نام دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک ذاتی دوسرے صفاتی مثلاً ایک شخص کا نام زید ہے تو یہ اس کا ذاتی نام ہے جو اس کی ذات (Person) کے لئے بولا جاتا ہے۔ پھر اگر وہ گورے رنگ کا ہو تو ہم اس کو گورا کہتے ہیں اور اگر صاحب علم ہو تو اس کو عالم کہتے ہیں اور صاحب عقل ہو تو اس کو عاقل کہتے ہیں۔ یہ اس کے صفاتی نام ہیں جو اس کی صفات کی وجہ سے اس پر بولے جاتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نام بھی دو طرح کے ہیں، ذاتی اور صفاتی۔ خود اللہ تو ذاتی نام ہے جبکہ دیگر تمام نام صفاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں یہ ضابطہ ہے کہ قرآن وحدیث میں جو الفاظ آئے ہیں ان کا استعمال جائز ہے۔ اور جن الفاظ کا ذکر قرآن وحدیث میں نہیں آیا مثلاً قدیم یا واجب الوجود یا سخی یا عاقل ان کے استعمال

کے بارے میں امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں نہ اسم کے طور پر کہ ہم اللہ کو مخاطب کر کے یوں کہیں کہ اے قدیم اور نہ وصف کے طور پر کہ یوں کہیں کہ اللہ قدیم ہے۔ البتہ امام غزالی اور امام رازی رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ اسم کے طور پر تو ان کا استعمال جائز نہیں اور ہم اللہ کو اے قدیم کہہ کر نہیں پکاریں گے البتہ بطور صفت کے ہم ان الفاظ کا استعمال کر سکتے ہیں جب کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی شان میں نقص کا ایہام نہ ہو مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ قدیم ہے اور اللہ واجب الوجود ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات بے شمار ہیں۔ حدیثوں میں جو ننانوے ناموں کا ذکر ہے تو اس وجہ سے ہے کہ وہ ننانوے نام اللہ کی تمام صفات کمالیہ کی اصل اور بنیاد ہیں۔ ان ننانوے ناموں کے علاوہ اور بھی کچھ نام قرآن وحدیث میں وارد ہوئے ہیں مثلاً قاہر، شاکر، دائم، وتر، فاطر، علام، ملیک، اکرم، مدبر، رفیع، ذی الطّول، ذی المعارج، ذوالفضل، خلاق، سید، حنان، شان اور دیان وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کے ذاتی ناموں میں وہ ضابطہ نہیں جو صفاتی ناموں کے لئے اوپر ذکر ہوا۔ لہٰذا ہر زبان میں ذات الٰہی کے لئے جو نام مقرر ہے جیسے اردو اور فارسی میں خدا اور انگریزی میں بڑے G کے ساتھ GOD ان کا استعمال درست ہے۔ البتہ کافروں میں اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کئے جانے والے جن ناموں کے بارے میں تحقیق نہ ہو کہ وہ ذاتی نام ہیں یا صفاتی نام ہیں مثلاً یہود میں یہوداہ (Jehovah) اور پارسیوں میں ایزد اور ہندوؤں میں پرمیشور تو ان کے استعمال سے بچنا چاہئے شاید کسی ناجائز صفت کے لحاظ سے مقرر کئے گئے ہوں مگر ان کی بے ادبی اور بے تعظیمی بھی نہ کرنی چاہئے۔

حدیث میں وارد اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام

1- اَللّٰهُ:

یہ نام خدا تعالیٰ کی ذات کے لئے مخصوص ہے۔ غیر خدا پر اس کا اطلاق نہیں ہوسکتا نہ حقیقۃً نہ مجازاً۔ اس ذاتی نام کو چھوڑ کر باقی جتنے نام ہیں وہ سب صفاتی نام ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کے اعتبار سے ہیں۔

2- اَلرَّحْمٰنُ: نہایت رحم والا۔

3- اَلرَّحِيْمُ: بڑا مہربان۔

4- اَلْمَلِكُ: بادشاہ حقیقی اپنی تدبیر اور تصرف میں مختار مطلق۔

5- اَلْقُدُّوْسُ: تمام عیبوں اور برائیوں سے پاک اور منزہ، اور جسم اور جسمانی صفات سے خالی۔

6- اَلسَّلَامُ: آفتوں اور عیبوں سے سالم اور سلامتی کا عطا کرنے والا۔

7- اَلْمُؤْمِنُ: مخلوق کو آفتوں سے امن دینے والا اور امن کے سامان پیدا کرنے والا۔

8- اَلْمُهَيْمِنُ: ہر چیز کا نگہبان

9- اَلْعَزِيْزُ: عزت والا اور غلبہ والا کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور نہ کوئی اس پر غلبہ پاسکتا ہے۔

10- اَلْجَبَّارُ: جبر اور قہر والا۔ ٹوٹے ہوئے کا جوڑنے والا اور بگڑے ہوئے کا درست کرنے والا۔

11- اَلْمُتَكَبِّرُ: انتہائی بلند اور برتر، جس کے سامنے سب حقیر ہیں۔

12- اَلْخَالِقُ: مشیت اور حکمت کے مطابق ٹھیک اندازہ کرنے والا اور اس اندازہ کے مطابق پیدا کرنے والا۔ اس نے ہر چیز کی ایک خاص مقدار مقرر کردی کسی کو چھوٹا اور کسی کو بڑا، اور کسی کو انسان اور کسی کو حیوان، کسی کو پہاڑ اور کسی کو پتھر اور کسی کو مکھی اور کسی کو مچھر غرض ہر ایک کی ایک خاص مقدار مقرر کردی ہے۔

13- اَلْبَارِئُ: بلا کسی اصل کے اور بلا کسی خلل کے پیدا کرنے والا۔

14- اَلْمُصَوِّرُ: طرح طرح کی صورتیں بنانے والا کہ ہر صورت دوسری صورت سے جدا اور ممتاز ہے۔

15- اَلْغَفَّارُ: بڑا بخشنے والا اور عیبوں کا چھپانے والا اور پردہ پوشی کرنے والا۔

16- اَلْقَهَّارُ: بڑے قہر اور غلبہ والا کہ جس کے آگے سب عاجز ہوں۔ ہر موجود اس کی قدرت کے سامنے مقہور اور عاجز ہے۔

17- اَلْوَهَّابُ: بغیر غرض کے اور بغیر عوض کے خوب دینے والا۔ بندہ بھی کچھ بخشش کرتا ہے مگر اس کی بخشش ناقص اور ناتمام ہے کیونکہ بندہ کسی کو کچھ روپیہ پیسہ دے سکتا ہے مگر صحت اور عافیت نہیں دے سکتا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی بخشش میں سب کچھ ہی داخل ہے۔

18- اَلرَّزَّاقُ: بہت بڑا روزی دینے والا اور روزی کا پیدا کرنے والا رزق اور مرزوق سب اسی کی مخلوق ہے۔

19- اَلْفَتَّاحُ: رزق، صحت اور علوم کا دروازہ کھولنے والا اور بہت بڑا مشکل کشا یعنی مشکلات کی گرہ کھولنے والا۔

20- اَلْعَلِیْمُ: بہت جاننے والا جس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہوسکتی اس کا علم تمام کائنات کے ظاہر اور باطن کو محیط ہے۔

21- اَلْقَابِضُ: تنگی کرنے والا۔

22- اَلْبَاسِطُ: فراخی کرنے والا۔ یعنی حسی اور معنوی رزق کی تنگی اور فراخی سب اس کے ہاتھ میں ہے۔ کسی پر رزق کو فراخ کیا اور کسی پر تنگ کیا۔

23,24-اَلْخَافِضُ، الرَّافِعُ: پست کرنے والا، اور بلند کرنے والا۔ وہ جس کو چاہے پست کرے اور جس کو چاہے بلند کرے۔

25,26-اَلْمُعِزُّ، اَلْمُذِلُّ: عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔ وہ جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔

27- اَلسَّمِیْعُ: سب کچھ سننے والا۔

28- اَلْبَصِیْرُ: سب کچھ دیکھنے والا۔

29- اَلْحَکَمُ: حاکم مطلق، وہ جو چاہے حکم اور فیصلہ دے کوئی اس کو چیلنج کرنے والا نہیں۔

30- اَلْعَدْلُ: انصاف کرنے والا، وہ بالفعل کسی پر ظلم اور جور وستم نہیں کرتا۔

31- اَللَّطِیْفُ: باریک بین یعنی ایسی خفی اور باریک چیزوں کا ادراک کرنے والا جہاں نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں۔ بڑا لطف وکرم کرنے والا بھی ہے۔

32- اَلْخَبِیْرُ: بڑا ہی آگاہ اور باخبر ہے۔ وہ ہر چیز کی حقیقت کو جانتا ہے۔ ہر چیز

کی اس کو خبر ہے یہ ناممکن ہے کہ کوئی چیز موجود ہو اور خدا کو اس کی خبر نہ ہو۔

33- اَلْحَلِیْمُ: بڑا ہی بردبار، اسی لئے علانیہ نافرمانی بھی اس کو مجرمین کی فوری سزا پر آمادہ نہیں کرتی اور گناہوں کی وجہ سے وہ رزق بھی نہیں روکتا۔

34- اَلْعَظِیْمُ: بڑی ہی عظمت والا جس کے سامنے سب ہیچ ہیں۔

35- اَلْغَفُوْرُ: بہت بخشنے والا۔

36 اَلشَّکُوْرُ: بڑا قدردان اس لئے تھوڑے عمل پر بڑا ثواب دیتا ہے۔

37- اَلْعَلِیُّ: بہت بلند و برتر کہ اس سے اوپر کسی کا مرتبہ نہیں۔

38- اَلْکَبِیْرُ: بہت بڑا کہ اس سے بڑا کوئی متصور نہیں۔

39- اَلْحَفِیْظُ: سب کا محافظ۔ مخلوق کو آفتوں اور بلاؤں سے محفوظ رکھتا ہے۔

40- اَلْمُقِیْتُ: مخلوق کو روزی اور توانائی دینے والا خواہ وہ روزی اور توانائی جسمانی ہو یا روحانی ہو۔

41- اَلْحَسِیْبُ: ہر حال میں سب کے لئے کفایت کرنے والا اور قیامت کے دن بندوں سے حساب لینے والا۔

42- اَلْجَلِیْلُ: بزرگ قدر۔

43- اَلْکَرِیْمُ: بہت کرم اور بخشش کرنے والا۔ وہ بغیر سوال کے اور بغیر وسیلہ کے عطا کرتا ہے۔

44- اَلرَّقِیْبُ: بڑا نگہبان اور نگران۔ کسی شے سے وہ غافل نہیں اور کوئی چیز اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔

45- اَلْمُجِیْبُ: دعاؤں کا قبول کرنے والا۔ اور بندوں کی پکار کا جواب دینے والا۔

46- اَلْوَاسِعُ: وسعت والا۔ وہ علم، قدرت اور نعمت میں بڑی وسعت والا ہے یعنی ان چیزوں نے ہر شے کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

47- اَلْحَکِیْمُ: بڑی حکمتوں والا اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ وہ ہر چیز کی مصلحتوں سے واقف ہے۔

48- اَلْوَدُوْدُ: بڑا محبت کرنے والا یعنی بندوں کی خوب رعایت کرنے والا اوران

پر خوب انعام کرنے والا

49- اَلْمَجِيْدُ: بڑا بزرگ۔ وہ اپنی ذات اور صفات اور افعال میں بزرگ ہے۔

50- اَلْبَاعِثُ: مردوں کو زندہ کر کے قبروں سے اٹھانے والا اور سوتے ہوؤں کو بستروں سے جگانے والا۔

51- اَلشَّهِيْدُ: حاضر وناظر اور ظاہر وباطن پر مطلع اور بعض کہتے ہیں کہ امور ظاہرہ کے جاننے والے کو شہید کہتے ہیں اور مطلق جاننے والے کو علیم کہتے ہیں۔

52- اَلْحَقُّ: ثابت اور برحق۔ اس کی خدائی اور شہنشاہی حق ہے اور حقیقی ہے۔ اس کے سوا سب غیر حقیقی اور ہیچ ہے۔

53- اَلْوَكِيْلُ: کارساز یعنی جس کی طرف دوسرے اپنا کام سپرد کردیں وہی بندوں کا کام بنانے والا ہے۔

54- اَلْقَوِيُّ: غیر متناہی اور بڑی طاقت وقوت والا۔ اس کو کبھی ضعف لاحق نہیں ہوتا۔

55- اَلْمَتِيْنُ: شدید قوت والا جس میں ضعف اضمحلال اور کمزوری کا امکان نہیں اور اس کی قوت میں کوئی اس کا مقابل اور شریک نہیں۔

56- اَلْوَلِيُّ: مددگار اور دوست رکھنے والا یعنی اہل ایمان کا محبّ اور ناصر۔

57- اَلْحَمِيْدُ: سزاوار حمد وثنا وہ ذات وصفات اور افعال ہر ایک کے اعتبار سے **قابل تعریف ہے۔**

58- اَلْمُحْصِي: اپنے علم وشمار میں رکھنے والا۔ یعنی وہ کائنات عالم کی مقدار اور شمار کو جاننے والا۔ زمین کے ذرے اور بارش کے قطرے اور درختوں کے پتے اور انسانوں اور حیوانوں کے سانس سب اس کو معلوم ہیں۔

59- اَلْمُبْدِئُ: پہلی بار پیدا کرنے والا اور عدم سے وجود میں لانے والا۔

60- اَلْمُعِيْدُ: دوبارہ پیدا کرنے والا۔ پہلی بار بھی اسی نے پیدا کیا اور قیامت بھی وہی دوبارہ پیدا کرے گا اور معدومات کو دوبارہ ہستی کا لباس کے دن پہنائے گا۔

61- اَلْمُحْيِيُ: زندگی دینے والا

62- اَلْمُمِيْتُ: موت دینے والا

63- اَلْحَیُّ: بذات خودزندہ اور قائم بالذات جس کی ذات قائم ہو، جس کی حیات کو کبھی زوال نہیں۔

64- اَلْقَیُّوْمُ: کائنات عالم کی ذات وصفات کا قائم رکھنے والا اور تھامنے والا یعنی تمام کائنات کا وجود اور ہستی اس کے سہارے سے قائم ہے۔

65- اَلْوَاجِدُ: غنی اور بے پروا کہ کسی چیز میں کسی کا محتاج نہیں، یا یہ معنی کہ اپنی مراد کو پانے والا، جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔

66- اَلْمَاجِدُ: بڑی بزرگی والا بزرگ مطلق۔

67- اَلْوَاحِدُ: ایک، کوئی اس کا شریک نہیں۔

68- اَلْاَحَدُ: ذات وصفات میں یکتا اور یگانہ۔ یعنی بے مثال اور بے نظیر۔ (احد کا لفظ ترمذی میں اور بیہقی کی دعوات کبیر میں نہیں آیا۔ البتہ ابن ماجہ کی روایت میں یہ لفظ آیا ہے

69- اَلصَّمَدُ: سردار کامل جو سب سے بے نیاز اور سب اس کے محتاج۔ یعنی ذات وصفات کے اعتبار سے ایسا کامل مطلق کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں۔

70- اَلْقَادِرُ: قدرت والا۔ اسے اپنے کام میں کسی آلہ کی بھی ضرورت نہیں اور وہ عجز اور لاچارگی سے پاک اور منزہ ہے۔

71- اَلْمُقْتَدِرُ: پوری قدرت رکھنے والا یعنی وہ بذات خود کامل القدرت کسی چیز کے کرنے میں اسے دشواری نہیں اور کسی میں یہ قدرت نہیں کہ اس کی قدرت میں مزاحمت کر سکے۔

72,73- اَلْمُقَدِّمُ، اَلْمُؤَخِّرُ: آگے کرنے والا (مثلا دوستوں کو) پیچھے کرنے والا (مثلاً دشمنوں کو)

74- اَلْاَوَّلُ: سب سے پہلا یعنی اس سے پہلے کوئی موجود نہ تھا

75- اَلْاٰخِرُ: سب سے پچھلا۔ یعنی جب کوئی نہ رہے وہ موجود رہے گا۔

76- اَلظَّاهِرُ: آشکارا، ہر چیز کا وجود وظہور اللہ تعالیٰ کے وجود سے ہے لہٰذا

کائنات کی ہر ہر چیز اور ہر ہر ذرہ اس کی ہستی اور وجود پر روشن دلیل ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ خوب ظاہر ہے۔ اس کا ایک مطلب غالب بھی ہے یعنی وہ ایسا غلبہ والا ہے کہ اس سے اوپر کوئی قوت نہیں ہے۔

77- اَلْبَاطِنُ: پوشیدہ۔ اس کی ذات کی کنہ اور اس کی صفات کے حقائق تک عقل کی رسائی نہیں ہے۔ کسی ایک صفت کا احاطہ بھی کوئی نہیں کرسکتا نہ اپنی رائے سے اس کی کچھ کیفیت بیان کرسکتا ہے لہٰذا اس اعتبار سے اس سے زیادہ کوئی پوشیدہ نہیں نیز وہ ایسا چھپا ہے کہ اس سے پرے کوئی جگہ نہیں جہاں اس کی آنکھ سے اوجھل ہو کر پناہ مل سکے۔

78- اَلْوَالِی: کارساز اور مالک اور تمام کاموں کا متولی اور منظّم

79- اَلْمُتَعَالِ: سب سے عالی شان اور سب سے بلند و برتر کہ جہاں تک کوئی نہ پہنچ سکے۔

80- اَلْبَرُّ: بڑا اچھا سلوک کرنے والا۔

81- اَلتَّوَّابُ: بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، اور توجہ کرنے والا۔

82- اَلْمُنْتَقِمُ: سرکشوں سے بدلہ لینے والا۔

83- اَلْعَفُوُّ: گناہوں اور کوتاہیوں سے بڑا درگزر کرنے والا اور گناہوں کو مٹا دینے والا۔

84- اَلرَّؤُفُ: بڑا ہی مہربان جس کی رحمت کی غایت اور انتہا نہیں۔

85- مَالِكُ الْمُلْكِ: خداوند جہان ملک کا مالک جس طرح چاہے تصرف کرے کوئی اس کے حکم اور تصرف کو نہ روک سکے۔

86- ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ: صاحب عظمت وجلال اور انعام واکرام والا اس کا حکم جاری اور نافذ ہے اور اس کی اطاعت لازم ہے اور اپنے فرمانبردار بندوں کو عزت دینے والا اور ان پر کرم کرنے والا۔ جس کے پاس جو عزت اور کرامت ہے وہ اسی کا عطیہ ہے۔

87- اَلْمُقْسِطُ: عدل وانصاف قائم کرنے والا

88- اَلْجَامِعُ: سب لوگوں کو جمع کرنے والا یعنی قیامت کے دن اور مرکب اشیاء میں تمام متفرق چیزوں کو جمع کرنے والا۔

89- اَلْغَنِیُّ: بڑا بے نیاز اور بے پروا۔ اسے کسی کی حاجت نہیں اور کوئی اس سے مستغنی نہیں۔

90- اَلْمُغْنِی: مخلوق کو بے پروا کرنے والا یعنی وہ خود بے نیاز ہے اور جس کو اپنے بندوں میں سے حسب حکمت و مصلحت اس کو بے پروا کر دیتا ہے چاہتا ہے اور بقدر ضرورت اس کو دے دیتا ہے۔

91- اَلْمَانِعُ: روک دینے والا اور باز رکھنے والا۔ جس چیز کو وہ روک لے کوئی اس کو دے نہیں سکتا۔

92,93 اَلضَّارُّ، اَلنَّافِعُ: ضرر پہنچانے والا۔ نفع پہنچانے والا یعنی نفع اور ضرر سب اس کے ہاتھ میں ہے۔ خیر و شر اور نفع و ضرر سب اس کی طرف سے ہے

94- اَلنُّوْرُ: وہ بذات خود ظاہر اور روشن ہے اور دوسروں کو ظاہر اور روشن کرنے والا ہے۔ نور اس چیز کو کہتے ہیں کہ جو خود ظاہر ہو اور دوسرے کو ظاہر کرتا ہو آسمان و زمین سب ظلمت عدم میں چھپے ہوئے تھے۔ اللہ نے ان کو عدم کی ظلمت سے نکال کر نور وجود عطا کیا۔ جس سے سب ظاہر ہو گئے اس لئے وہ نور السماوات والارض ہے (یعنی آسمان و زمین کا نور) ہے۔

95- اَلْھَادِی: سیدھی راہ دکھانے اور بتانے والا کہ یہ راہ سعادت ہے اور یہ راہ شقاوت ہے اور سیدھی راہ پر چلانے والا بھی ہے۔

96- اَلْبَدِیْعُ: عالم کو مثال اور نمونہ کے بغیر پیدا کرنے والا۔

97- اَلْبَاقِیُ: ہمیشہ باقی رہنے والا یعنی دائم الوجود جس کو کبھی فنا نہیں اور اس کے وجود کی کوئی انتہا نہیں۔ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے۔ ماضی کے اعتبار سے وہ قدیم ہے اور مستقبل کے لحاظ سے وہ باقی ہے ورنہ اس کی ذات کے لحاظ سے وہاں نہ ماضی ہے اور نہ مستقبل ہے اور وہ بذات خود باقی ہے۔

98- اَلْوَارِثُ: تمام موجودات کے فنا ہو جانے کے بعد موجود رہنے والا سب کا

وارث اور مالک جب سارا عالم فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے گا تو وہ خود ہی فرمائے گا لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (آج کے دن کس کی بادشاہی ہے) اور خود ہی جواب دے گا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (ایک قہار اللہ کی ہے)

99- اَلرَّشِیْدُ: رہنمائے عالم یعنی دینی اور دنیوی مصلحتوں میں عالم کا رہنما۔

100- اَلصَّبُوْرُ: بڑا صبر کرنے والا کہ نافرمانوں کے پکڑنے اور سزا دینے میں دشمنوں سے انتقام لینے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ ان کو مہلت دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تنزیہات

اللہ تعالیٰ تمام نقائص اور عیوب اور حدوث اور امکان کے شائبوں اور علامتوں سے منزہ و مبرا اور پاک ہے۔ وہ نہ جسم و جسمانی ہے اور نہ مکانی اور زمانی ہے۔ اس کی بارگاہ میں مکان زمان اور جہت کی گنجائش نہیں کیونکہ یہ سب تو خود اس کی مخلوق ہیں۔

پہلی تنزیہ: وہ کسی کا کسی چیز میں محتاج نہیں

اپنی ذات اور صفات اور کسی کام میں وہ کسی کا محتاج نہیں کیونکہ اس کی ذات اور صفات کے سوا سب عالم (یعنی ماسوا اللہ) میں داخل ہے اور کل عالم اس کا محتاج ہے اور اس کا بنایا ہوا ہے۔ لہٰذا اگر اس کو کسی چیز میں کسی کی طرف حاجت ہو تو لازم آئے گا کہ اللہ خود اپنے محتاج کا محتاج ہو جائے اور یہ محال ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (سورہ فاطر:15)

> ”یعنی اے لوگو تم سب اللہ کے محتاج ہو اور وہ ہر چیز سے بے پروا (یعنی اپنی ذات و صفات میں غیر محتاج) ہے اور تعریف کیا گیا ہے۔“

اسی لئے وہ جسم نہیں ہے کیونکہ جسم اپنے اجزاء سے مرکب ہوتا ہے اور اس وجہ سے جسم ایک تو اپنے اجزاء کا محتاج ہوتا ہے اور دوسرے اپنے ترکیب دینے والا کا بھی محتاج ہوتا ہے لہٰذا اگر خدا کے لئے بھی جسم اور بدن ہو تو خدا بھی دوسروں کا محتاج ٹھہرے گا۔

اور جب وہ جسم نہیں تو نہ اس کے لئے مکان ہے اور نہ ہی اس کو کھانے پینے اور دوسرے جسمانی، حیوانی اور انسانی ضرورتوں کی حاجت ہے۔

دوسری تنزیہ: حق تعالیٰ اتحاد وحلول سے منزہ ہے

حق تعالیٰ کسی چیز کے ساتھ متحد نہیں ہوتا یعنی جیسے گرم پانی سرد میں مل کر متحد اور ایک ہو جاتا ہے اور نہ کوئی چیز اس کے ساتھ متحد ہوتی ہے یعنی جیسے برف پانی میں گھل کر ایک ہو جاتی ہے اور نہ کوئی چیز اس میں حلول کرتی ہے (ایک چیز کے دوسری چیز کے اندر سما جانے اور پیوست ہو جانے کو حلول کہتے ہیں جیسے کپڑے میں سیاہ یا سفید رنگ پیوست ہو جاتا ہے) اور نہ وہ کسی شے میں حلول کرتا ہے۔

عیسائیوں کے نزدیک خدا تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کر گیا تھا اور ہندوؤں کے نزدیک خدا تعالیٰ انسان اور حیوان شجر اور حجر میں حلول کرتا ہے۔ سامری کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ بچھڑے میں خدا حلول کر آیا ہے۔

اہل حق صوفیاء صرف وحدت کے قائل ہیں اتحاد کے قائل نہیں ہیں کہ عالم موجود ہو پھر ذات حق کے ساتھ وجود میں متحد اور ایک ہو جائے۔ وحدت کے قول سے حلول کی بھی نفی ہوتی ہے کیونکہ حلول میں حال (حلول کرنے والا) اور محل (جس میں حلول کرے) دونوں موجود ہوتے ہیں پھر اس کے بعد ان میں ایک نوع کا اتحاد ہو جاتا ہے۔ اہل حق حضرات عالم کے وجود کو ذات حق کے وجود کے سامنے کالعدم جانتے ہیں۔ اسی لئے صوفیاء کی اصطلاح وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا حلول اور اتحاد سے کچھ بھی تعلق نہیں۔

وحدۃ الوجود کی تحقیق

صوفیاء نے وحدت کا معنی یکتا کا لیا ہے اور یکتا اور بے نظیر اس کو کہتے ہیں جس کا کوئی ہمسر نہ ہو۔ کہتے ہیں فلان واحد فی الحسن، واحد فی العلم وغیرہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرا کوئی حسین یا عالم مطلقاً ہے ہی نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کے برابر کوئی نہیں۔ یہی مطلب وحدۃ الوجود کا ہے کہ خدا تعالیٰ کے وجود کے برابر کسی کا وجود نہیں۔ وجود حقیقی اور کامل ایک ہی ہے دوسرے وجودات اس کے سامنے اس قابل نہیں کہ ان کو وجود کہا جاسکے گو کسی درجہ میں وجود ان کا بھی ہے اور یہ مضمون قرآن وحدیث کے ذرا خلاف نہیں بلکہ عین مطابق ہے۔

غرض وحدۃ الوجود کا یہ مطلب نہیں کہ کسی شے کا وجود ہی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ وجود تو دوسروں کا بھی ہے مگر اس کے سامنے کالعدم ہے جیسے ستارے دن میں موجود تو ہوتے ہیں جس کو اہل علم جانتے ہیں مگر آفتاب کے سامنے کالعدم ہوتے ہیں۔ نیز اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تھانیدار چپڑاسی پر حکومت کرتا ہے اور اس

وقت وہ حاکم معلوم ہوتا ہے مگر وزیر اعظم کے سامنے وہ بول بھی نہیں سکتا اس وقت اس کی حکومت کالعدم ہو جاتی ہے۔ نیز ایک ماہر فن قاری کے سامنے ایک طفل مکتب کو کوئی قاری نہیں کہتا گو کسی قدر پڑھنا اس نے سیکھا ہی ہو۔

غرض گفتگو میں ناقص کو کامل کے سامنے لاشے اور کالعدم سمجھا جاتا ہے اور یوں بھی کہا جاتا ہے کہ بس قاری تو فلاں ہے، سخی تو وہ ہے، حسین تو یہ ہے اور ناقص سے اس کی مکمل نفی کرتے ہیں مگر مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کامل کے سامنے کوئی چیز نہیں یہ معنی نہیں کہ فی نفسہ (یعنی اپنی ذات میں) بھی کچھ نہیں۔ یہی مطلب ہے محققین کا وحدۃ الوجود سے کہ حق تعالیٰ کے وجود کے سامنے کسی کا وجود کچھ نہیں کہ کسی درجہ میں قابل ذکر نہیں۔ اس لئے ان کا قول ہے کہ وحدۃ الوجود تو ایمان ہے اور اتحاد وجود کفر ہے۔ بہر حال جب صوفیاء کے نزدیک اتحاد وجودین (یعنی دو وجودوں کا بالکل ایک ہونا) کفر ہے تو اب معلوم ہو گیا کہ محققین کے قول میں اور جہلاء کے اس قول میں کہ ہر چیز خدا ہے کتنا فرق ہے۔ وہ تو کسی شے کو موجود کہنے کے قابل بھی نہیں سمجھتے اور یہ ظالم ہر چیز کو خدا کہتے ہیں۔ نعوذ بالله منه

وحدۃ الوجود کی یہ جو تحقیق ذکر کی گئی ہے جب تک یہ آدمی کے علم کی حد تک رہے تو صوفیاء اس کو توحید کہتے ہیں اور جب یہ بات کسی شخص کا حال بن جائے یعنی یہ کہ اس کی مستقل کیفیت یہ بن جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے آگے دوسروں کے وجود کو مثل معدوم کے سمجھتا ہے تو اس کو فنا کہتے ہیں اور یہی وحدۃ الشہود کا حاصل بھی ہے۔

وحدۃ الشہود کی تحقیق

اس کا ترجمہ ہے مشہود کا ایک ہونا یعنی واقع میں تو ہستی اور موجود متعدد ہے مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور باقی سب کالعدم معلوم ہوتے ہیں۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ نے اس کی ایک مثال لکھی ہے:

مگر دیدہ باشی کہ در باغ و راغ
بتابد بشب کرمک چوں چراغ
یکے گفتش اے کرمک شب فروز
چہ بودت کے بیروں نیائی بروز
نہ بینی کہ آں کرمک خاک زاد

جواب از سر روشنائی چہ داد
کہ من روز و شب جز بہ صحرا نیم
ولے پیش خورشید پیدا نیم

’’ترجمہ: شاید تم نے دیکھا ہوگا کہ باغ وغیرہ میں ایک کیڑا چراغ کی طرح چمکتا ہے۔ کسی نے اس سے کہا کہ اے رات کو روشن ہونے والے کیڑے تجھ کو کیا ہوا کہ تو دن کو باہر نہیں آتا۔‘‘

تمہیں خبر نہیں کہ اس خاک کے کیڑے نے عقل مندی سے کیا عمدہ جواب دیا۔

کہ میں تو دن رات جنگل کے سوا کہیں نہیں ہوتا مگر سورج کے سامنے میں ظاہر نہیں ہوسکتا۔

غرض جن لوگوں کی نظر آفتاب (وجود حقیقی) پر ہوتی ہے اس وقت جگنو یعنی اشیاء عالم کا وجود ان کو نظر نہیں آتا۔ ہاں جو لوگ اندھیرے میں ہیں جن کی نظر آفتاب وجود حقیقی سے غائب ہے وہ البتہ اشیاء عالم کے وجود پر نظر رکھتے ہیں اور جو محقق ہیں کہ مغلوب الحال نہیں ہیں ان کی نظر آفتاب وجود حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ پر ہونے کے ساتھ مخلوق پر بھی ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں حقیقی نہیں بلکہ صرف لفظی اختلاف ہے مگر چونکہ وحدۃ الوجود کے معنی عوام میں غلط مشہور ہو گئے تھے اس لئے بعض محققین نے اس کا عنوان بدل دیا۔

تیسری تنزیہ: اس کی ذات اور صفات کو کبھی فنا اور تغیر نہیں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (سورہ قصص:88) یعنی اس کی ذات کے سوا ہر شے فانی اور ہلاک ہونے والی ہے لہٰذا اس کی ذات مع صفات ہمیشہ باقی رہے گی نیز فرمایا: وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ (سورہ رحمٰن:27) یعنی اللہ جلال اکرام والا ہمیشہ باقی رہے گا۔

چوتھی تنزیہ: کوئی چیز اس پر واجب نہیں ہے۔

وجوب سے حق تعالیٰ کے اختیار کا باطل ہونا لازم آتا ہے۔ وہ کون ہے کہ جو اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب اور لازم کر سکے۔

معتزلہ کا عقیدہ تھا کہ جو چیز بندہ کے حق میں خیر اور اصلح ہے اللہ تعالیٰ پر اس کی رعایت واجب ہے۔

اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ اللہ پر کسی کا کوئی حق واجب نہیں وہ مالک و مختار ہے اس پر نہ لطف و مہربانی واجب ہے اور نہ قہر و سختی۔ جس کو چاہے ہدایت دے اور جس کو چاہے گمراہ کرے۔ ہدایت سے بڑھ کر کوئی خیر اور اصلح (بہت مصلحت کی چیز) نہیں مگر وہ بھی اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں ہے چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہے فَلَوْ شَآءَ

لَهَدَاكُمْ اَجْمَعِيْنَ (سورۃ انعام: 6) اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو سب کو ہدایت دے دیتا مگر کسی حکمت سے سب کو ہدایت نہیں دی۔ معلوم ہوا کہ ہدایت دینا اس کے ذمہ لازم نہیں۔ اور اگر اپنی رحمت سے کسی کو ہدایت بھی دے دے تو اس پر ثواب دینا اس کے ذمہ واجب نہیں۔ اگر وہ ثواب دے دے تو اس کا فضل ہے اور اگر عذاب دے تب بھی یہ ظلم نہیں ہوگا۔ ایک حدیث میں ہے حضرت ابی بن کعب، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم نے فرمایا: **لو ان الله عزوجل عذب اهل سماواته و اهل ارضه عذبهم و هو غير ظالم لهم ولو رحمهم كانت رحمته خيرا لهم من اعمالهم** (ابوداؤد) اللہ عزوجل اپنے آسمان والوں (یعنی فرشتوں) کو اور اپنی زمین والوں کو (جن میں انبیاء ورسل بھی شامل ہیں) اگر عذاب دیں تو یہ ان کا ظلم نہ ہوگا اور اگر وہ ان پر رحمت فرمائیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کے لئے ان کے نیک اعمال سے بہتر ہوگی (کیونکہ مالک مطلق کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی ملک میں جیسا چاہے تصرف کرے۔ اگرچہ قرآن وحدیث سے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اجر وثواب سے نوازیں گے)۔

اہلسنت کے برعکس معتزلہ یہ بھی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ فرمانبردار کو ثواب دے اور نافرمان کو سزا دے اور اپنی ان عقلی کوتاہیوں کے باوجود وہ اپنے آپ کو اصحاب العدل والتوحید (عدل وتوحید کے علمبردار) کہتے تھے۔ معتزلہ کی کوتاہی عقل کو امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ نے خوب کھولا۔ پہلے یہ معتزلہ کے شاگرد تھے۔ معتزلہ کے اسی عقیدے پر ان کو کھٹک ہوئی اور انہوں نے اپنے استاد مشہور معتزلی ابوعلی جبائی سے سوال کیا کہ تین بھائی ہیں ایک نے اللہ کی فرمانبرداری میں وفات پائی۔ دوسرے نے اللہ کی نافرمانی میں وفات پائی اور تیسرا بچپن ہی میں فوت ہوگیا تو آپ ان کے بارے میں کیا حکم لگاتے ہیں۔ ابوعلی جبائی نے جواب دیا کہ پہلے کو ثواب میں جنت ملے گی۔ دوسرے کو سزا میں جہنم کی آگ میں جلنا پڑے گا اور تیسرے کو نہ ثواب ملے گا اور نہ ہی سزا ملے گی۔ اس پر امام ابوالحسن اشعری نے پھر پوچھا کہ اگر تیسرا بھائی اللہ تعالیٰ سے فریاد کرے کہ آپ نے مجھے بچپن میں ہی کیوں موت دی۔ آپ میری زندگی دراز کرتے میں بلوغت کی عمر کو پہنچتا اور آپ پر ایمان لاتا اور آپ کی اطاعت کرتا تو میں بھی جنت میں جاتا تو رب تعالیٰ اس کو کیا جواب دیں گے؟ ابوعلی جبائی نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ میں جانتا تھا کہ اگر تو بڑا ہوگا تو ضرور نافرمانی کرے گا اور اس طرح جہنم میں داخل ہوگا تو تیرے لئے زیادہ بہتر اور اصلح یہی تھا کہ تجھے بچپن میں موت آتی۔ اس پر اشعری رحمہ اللہ نے پھر سوال کیا کہ اگر دوسرا بھائی اللہ تعالیٰ سے یوں فریاد کرے کہ (جب آپ کو معلوم تھا کہ میں بڑا ہو کر نافرمانی کروں گا تو) آپ نے مجھے بچپن میں موت کیوں نہ دی تاکہ نہ (میں بڑا

ہوتا اور نہ) آپ کی نافرمانی کرتا اور نہ جہنم میں جاتا تو رب تعالیٰ اس کو کیا جواب دیں گے۔ اس پر ابو علی جبائی مبہوت اور ششدر ہو کر رہ گیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس واقعہ کے بعد اشعری رحمہ اللہ نے معتزلہ کا ساتھ چھوڑا اور ان کے غلط عقیدوں کے ابطال اور اہل سنت کے عقائد کے اثبات میں لگے۔

غرض یہ کہ حق تعالیٰ پر کسی کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہاں خود اس ارحم الراحمین نے اپنی رحمت واسعہ سے اہل ایمان کی عزت افزائی کے لئے یہ فرما دیا ہے کہ اہل ایمان کا مجھ پر حق ہے کہ میں ضرور ان کو جنت میں داخل کروں گا اور ان کو ثواب دوں گا۔

پانچویں تنزیہ: اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہیں کہ ان کو بدا ہو۔

لغت میں بدا کہتے ہیں **بدا له ای ظهر له ما لم یظهر** یعنی جو بات معلوم نہ تھی اس کے معلوم ہو جانے کو بدا کہتے ہیں۔ یہ شیعوں کا عقیدہ ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔

1- پہلے جو علم تھا وہ اب غلط ثابت ہوا۔

نظام الدین جیلانی نے رسالہ **علم الهدی فی تحقیق البدا** میں اس کو اختیار کیا ہے اور بدا کا یہ مطلب بتایا ہے کہ **اذا ظهرله رای مخالف للرای الاول** یعنی اس کو پہلی رائے کے مخالف کوئی دوسری رائے سوجھی۔

2- پہلے سے کچھ علم نہ تھا اب علم ہوا۔ شریف مرتضی نے اپنی کتاب مرتضی میں اس کو اختیار کیا ہے۔

قرآن پاک میں بھی **بدا** کا لفظ کئی جگہ وارد ہوا ہے اور ہر جگہ یہی معنی ہیں کہ نا معلوم چیز کا علم ہو جائے چنانچہ سورہ یوسف میں ہے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُم مِّنۢ بَعۡدِ مَا رَاَوُا الۡاٰيٰتِ لَيَسۡجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيۡنٍ (سورہ یوسف:25)

یوسف کی پاک دامنی کے دلائل دیکھنے کے بعد لوگوں کو یہ بات مناسب معلوم ہوئی کہ کچھ دنوں کے لئے ان کو قید کر دیں۔ قید کرنے کی رائے نئی پیدا ہوئی جو پہلے نہ تھی۔

بدا کی تین قسمیں ہیں

1- **بدا فی العلم (یابدافی الاخبار)** یعنی خدا نے پہلے سے کچھ جان رکھا تھا مگر بعد میں حقیقت الامر کچھ اور معلوم ہوئی۔

2- **بدافی الاراده (یابدا فی التکوین)** یعنی پہلے کچھ ارادہ تھا پھر یوں معلوم ہوا کہ یہ ارادہ ٹھیک نہیں۔

3- **بدا فی الامر (یابدا فی التکلیف)** یعنی پہلے کچھ حکم دیا پھر بعد ازاں یوں معلوم ہوا کہ پہلے حکم میں کچھ غلطی تھی۔ اس حکم کو بدل کر دوسرا ایسا حکم جس میں وہ نقصان نہ ہو بلکہ مصلحت وقت معلوم ہوتی ہو صادر

فرمایا۔

بدافی الامراور نسخ کے درمیان فرق ہے

نسخ حقیقت میں اس کو کہتے ہیں کہ ایک حکم کا وقت پورا ہو جائے اور دوسرے حکم کا وقت آجائے۔ البتہ کبھی تو پہلے سے وقت کی مقدار کی اطلاع کر دی جاتی ہے اور کبھی نہیں کی جاتی۔ مثلاً یہ حکم تو آیا کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو لیکن شراب کی حرمت کا حکم نہیں آیا بلکہ حلت باقی رہی۔ پھر کچھ عرصے کے بعد حرمت کا حکم آیا۔ تو پہلا حکم صرف ایک مدت کے لئے تھا۔ پھر جب وہ مدت پوری ہوگئی تو شراب کی حرمت کا حکم دیا گیا اگرچہ پہلے حکم کے ساتھ یہ نہیں بتایا گیا کہ حلت کی بقاء صرف اتنے عرصے کے لئے ہے۔ اس کو نسخ کہتے ہیں جب کہ بدافی الامر میں تبدیلی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ سابقہ حکم میں کچھ غلطی تھی۔

بدا کی تینوں قسموں کا لازم آنا

بدافی الامر کے واقع ہونے کی صورت میں **بدا فی الارادہ** لازم ہے کیونکہ بدافی الارادہ تو اسی کو کہتے ہیں کہ کسی نئی مصلحت کے سبب سے پہلے ارادہ کو ترک کردیں۔ تو جب مصلحت کے لحاظ سے حکم بدلا گیا تو پہلا ارادہ جو اس حکم کی ہمیشگی کا تھا وہ بھی بدل گیا۔ اور اسی طرح بدافی الارادہ کو بدافی العلم لازم ہے کیونکہ ارادہ تو نئی مصلحت کے معلوم ہونے پر بدلتا ہے۔ تو جب نئی مصلحت معلوم ہوئی تو لامحالہ یہ بات صحیح ہوئی کہ جو علم اب حاصل ہوا ہے وہ پہلے نہ تھا اور جو پہلے تھا وہ اب غلط معلوم ہوا اسی کو بدافی العلم کہتے ہیں۔

عقیدہ بدا کا نتیجہ

جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے واضح ہوا بدا کے عقیدہ کو اللہ تعالیٰ کا جاہل اور لاعلم ہونا لازم ہے۔ اسی وجہ سے بعض شیعہ خود اس عقیدے کے انکار پر مجبور ہوئے مثلاً محقق طوسی نے عقیدہ بدا کا انکار کیا اور شیعوں کے مجتہد اعظم مولوی دلدار علی نے اپنی کتاب اساس الاصول میں لکھا ہے۔

اعلم ان البدا لا ینبغی ان یقول به احد لا نه یلزم منه ان یتصف الباری تعالیٰ بالجهل کما لا یخفی

> ”جاننا چاہئے کہ عقیدہ بدا اس لائق نہیں کہ کوئی شخص اس کا قائل ہو کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ باری تعالیٰ جاہل ہو جیسا کہ پوشیدہ نہیں ہے۔“

عقیدہ بدا کا قرآن کے مخالف ہونا

سورہ طٰہٰ: 52 میں ہے۔ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسٰی (نہ بہکتا ہے میرا رب اور نہ بھولتا ہے)۔
جب کہ عقیدہ بدا کی رو سے اللہ تعالیٰ کو چوک ہو جاتی ہے معاذ اللہ۔

قائلین بدا کے دلائل اور ان کے جواب

پہلی دلیل

یَمْحُو اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتَابِ (سورہ رعد: 39)

”اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے“۔

اور لکھے ہوئے حکم کو اسی لئے مٹایا جاتا ہے کہ اس کے بارے میں اب نقص و عیب کا وہ علم ہوا ہے جو پہلے نہیں تھا۔

جواب: اس آیت سے بدا پر استدلال صحیح نہیں ہے۔ سیاق و سباق کے ساتھ جب ان آیات کو دیکھیں تو بات یوں ہے۔

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ یَمْحُو اللّٰهُ مَایَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (سورہ رعد 38/89)

یعنی کسی پیغمبر کے اختیار میں یہ امر نہیں کہ ایک آیت (یعنی ایک حکم) بھی بغیر خدا کے حکم کے (اپنی طرف سے) لا سکے (بلکہ احکام کا مقرر ہونا اذن و اختیار خداوندی پر موقوف ہے اور خدا تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کے اعتبار سے انکا یہ معمول مقرر ہے کہ) ہر زمانہ کے مناسب خاص خاص احکام ہوتے ہیں (پھر دوسرے زمانہ میں بعض امور میں دوسرے احکام آتے ہیں اور پہلے احکام موقوف ہو جاتے ہیں اور بعضے بحالہا باقی رہتے ہیں۔ پس) خدا تعالیٰ (ہی) جس حکم کو چاہیں موقوف کر دیتے ہیں اور جس حکم کو چاہیں قائم رکھتے ہیں اور اصل کتاب (یعنی لوح محفوظ) ان ہی کے پاس (رہتی) ہے (اور یہ سب احکام ناسخ و منسوخ و غیر منسوخ اس میں درج ہیں وہ سب کی جامع ہے۔ یعنی جس طرح سے یہ احکام آتے ہیں وہ اللہ ہی کے قبضہ میں ہے پس سابقہ احکام کے موافق یا مغایر احکام لانے کی کسی اور کو گنجائش اور دسترس ہی نہیں ہو سکتی)۔

اور یہ بات بھی مذکورہ بالا کے منافی نہیں کہ ایک تو ام الکتاب یعنی بڑا دفتر جو علم خداوندی کے موافق ہے یا خود علم خداوندی ہے اس میں گھٹاؤ بڑھاؤ نہیں ہوتا۔ اور دوسرا ایک چھوٹا دفتر ہوتا ہے جو ایک زمانہ کے لئے ہوتا ہے۔ اس میں سے کچھ چیزیں پوری ہو کر مٹ جاتی ہیں اور کچھ کو آئندہ زمانے کے لئے بھی برقرار رکھا جاتا

ہے۔

دوسری دلیل

وَوَاعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ(سورہ اعراف:142)

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کوتیس دن میں توریت دینے کا وعدہ کیا تھا مگرتیس دن میں ان کوتوریت نہ ملی بلکہ دس دن اوراضافہ کرکے چالیس دن میں ان کوتوریت دی گئی۔

جواب: اول تو آیت کا ترجمہ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دس راتوں کا اضافہ بطورتتمہ کے ہے۔ ظہر کی نماز کی اصل چار رکعت فرض ہیں۔ اس کے ساتھ سنن ونوافل بطورتتمہ کے ہیں۔ اسی طرح اورنمازوں میں بھی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں بھی یہی احتمال ہے کہ تیس دن تو بطورفرض کے ہوں اوردس دن بطورنفل کے ہوں۔

دوسرے یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ توریت چالیس دن کے بعد ہی دی گئی ہو بلکہ اس کا بھی احتمال ہے کہ تیس دن کے بعد توریت مل گئی ہو اور دس دن کا اضافہ بطورشکرانہ کے کیا گیا ہو۔ اس طرح سے وعدہ کی مدت میں تو کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

باب:2

انبیاء ورسل سے متعلق عقائد کا بیان

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام حق تعالیٰ کے پاک اور برگزیدہ بندے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے خلق کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تا کہ خلق کو حق تعالیٰ کی طرف بلائیں اور گمراہی سے سیدھے راستہ پر لائیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو دارالسلام یعنی جنت کی طرف دعوت دیں جو اس کی رضا کا مقام ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی دعوت کو قبول کرے اس کو جنت کی خوشخبری سنائیں اور جو شخص اس کی دعوت قبول کرنے سے انکار یا اعراض کرے اس کو دوزخ کی وعید سنائیں۔

شریعت میں نبی کس کو کہتے ہیں

اَلنَّبِیُّ اِنۡسَانٌ بَعَثَهُ اللّٰهُ لِتَبۡلِیۡغِ مَا اُوۡحِیَ اِلَیۡهِ (مسایرہ مع مسامرہ ص **207**)

”نبی وہ انسان اور بشر ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی تبلیغ کے لئے مبعوث فرمایا ہے جو اس کی طرف وحی کی گئیں۔“

لفظ نبوت اور رسالت کا مفہوم

نبوت مصدر ہے نبأ سے جس کے معنی خبر کے ہیں اور یہاں اس سے وہ خاص خبر مراد ہے جس کو خدا تعالیٰ اپنی طرف سے کسی اپنے خاص برگزیدہ بندہ پر نازل فرمائے تا کہ بندوں کو اس سے واقف اور باخبر کر دے۔ لہٰذا نبوت کے معنی ان باتوں اور خبروں کو پہنچانے کے ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس برگزیدہ شخص کو پہنچی ہیں۔ اور اس برگزیدہ شخص کو جو خدا کی دی ہوئی خبروں کو بندوں تک پہنچائے نبی کہتے ہیں۔

رسالت کے معنی خدا تعالیٰ اور ذی عقل مخلوق کے درمیان سفارت کے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان جو سفیر ہو اس کو رسول کہتے ہیں۔

نبی اور رسول میں فرق

صحیح یہ ہے کہ رسول کا مرتبہ نبی سے بڑھ کر ہے اس لئے کہ احادیث میں انبیاء کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زائد آئی ہے اور رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ آئی ہے۔ معلوم ہوا کہ رسول خاص ہے اور نبی عام ہے۔ ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن ہر نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں۔ اس لئے محققین نے نبی اور رسول میں یہ فرق کیا ہے کہ نبی وہ برگزیدہ بندہ ہے کہ جس پر اللہ کی وحی آتی ہو اور وہ ہدایت خلق اور تبلیغ احکام الٰہیہ پر مامور ہو خواہ صاحب کتاب ہو یا نہ ہو۔

اور انبیاء کرام میں سے جس کو من جانب اللہ کوئی خصوصی امتیاز حاصل ہو یعنی اس کو نئی کتاب یا کوئی نئی شریعت دی گئی ہو یا منکرین اور مکذبین کے مقابلہ کا اس کو حکم دیا گیا ہو یا کسی نئی امت کی طرف اس کو مبعوث کیا گیا ہو تو اس کو رسول کہتے ہیں۔

تنبیہ: رسول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس پر کوئی نئی کتاب یا نئی شریعت نازل ہو اس لئے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام بالاتفاق رسول تھے لیکن ان پر کوئی کتاب اور شریعت نازل نہیں ہوئی۔ نیز ایک حدیث سے ظاہر ہے کہ رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ ہے جبکہ کتابوں اور صحیفوں کی کل تعداد اس سے کہیں کم ہے۔ بعض روایتوں میں ان کی تعداد ایک سو چار ہے۔ معلوم ہوا کہ رسول کے لئے جدید کتاب و شریعت کا ہونا ضروری نہیں۔

نبوت و رسالت محض عطیہ الٰہی ہے اکتسابی نہیں

نبوت و رسالت محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے وہ جس کو چاہتا ہے خلعت نبوت سے سرفراز کرتا ہے۔

يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (سورہ نحل: 2)

’’اللہ اتارتا ہے فرشتوں کو وحی دے کر اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔‘‘

نیز اَللّٰہُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (سورہ حج :75)

’’اللہ چھانٹ لیتا ہے فرشتوں میں پیغام پہنچانے والے اور آدمیوں میں۔‘‘

نبوت کوئی اکتسابی شئے نہیں جو مجاہدہ اور ریاضت سے حاصل ہو یا کسی خاص قابلیت اور استعداد حاصل ہو جانے سے خود بخود نبی ہو جاتا ہو۔

عقیدہ: کسی ایک نبی کو جھٹلانا تمام انبیاء کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔

تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا ضروری ہے کسی ایک نبی پر ایمان نہ لانا تمام انبیاء پر ایمان نہ لانے

کے ہم معنی ہے کیونکہ تمام انبیاء کا کلمہ ایک ہے اور اصول دین سب کے ایک ہیں۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ نِ الْمُرْسَلِيْنَ (جھٹلایا نوح کی قوم نے رسولوں کو)
كَذَّبَتْ عَادُ نِ الْمُرْسَلِيْنَ (جھٹلایا عاد نے رسولوں کو)
كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ (جھٹلایا ثمود نے رسولوں کو)

قوم نوح اور قوم عاد اور قوم ثمود نے فقط اپنے اپنے زمانہ کے رسول کی تکذیب کی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ایک رسول کی تکذیب کو تمام رسولوں کی تکذیب قرار دیا اور یہ فرمایا کہ قوم نوح نے تمام پیغمبروں کی تکذیب کی۔

اسی قاعدے کے تحت یہودی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کو رسول نہیں مانتے اور عیسائی جو حضرت محمد ﷺ کو رسول نہیں مانتے یا ان کو تمام انسانوں کے لئے رسول نہیں مانتے یہ بھی کافر ٹھہرتے ہیں۔ یہ خیال کرنا کہ یہ سب ایک ہی منزل کی مختلف راہیں ہیں بالکل غلط ہے بلکہ یہ باطل راہیں تو منزل سے ہٹا کر جہنم کی طرف لے جاتی ہیں۔

عقیدہ: انبیاء پر ایمان کے بغیر اللہ پر ایمان معتبر نہیں۔

کوئی شخص خدا تعالیٰ پر تو ایمان لائے لیکن پیغمبروں کو علم ہونے کے باوجود نہ مانے تو خدا تعالیٰ پر اس کا ایمان بھی مقبول اور معتبر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں صاف فرما دیا ہے کہ جو شخص خدا اور اس کے پیغمبروں میں تفریق کرے کہ خدا پر تو ایمان لائے اور اس کی توحید کا قائل ہو مگر رسول کی رسالت کو نہ مانے تو وہ پکا کافر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَّاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا **(سورہ نساء :105)**

’’بے شک جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور یوں چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق رکھیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعضوں پر تو ایمان لاتے ہیں اور بعضوں کے منکر ہیں اور یوں چاہتے ہیں کہ بین بین درمیانی ایک راہ تجویز کریں ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں اور کافروں کے لئے ہم نے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے۔‘‘

رسول کے انکار سے اللہ کا انکار لازم ہے اس لئے کہ جب خدا تعالیٰ نے رسول کی اطاعت اور اس

پر ایمان لانے کا حکم دیا اور پھر کسی شخص نے اللہ کے حکم کے بعد رسول کو نہ مانا اور اس کی اطاعت نہ کی تو اللہ کے حکم کو نہ مانا اور اس سے انحراف کیا۔

عقیدہ: انبیاء علیہم السلام امین ہوتے ہیں۔

انبیاء کرام حق تعالیٰ کے امین ہوتے ہیں۔ احکام خداوندی کے پہنچانے میں ذرہ برابر کمی نہیں کرتے اور نہ کافروں سے ڈر کر تقیہ کرتے ہیں۔

اَلَّذِیۡنَ یُبَلِّغُوۡنَ رِسَالَاتِ اللّٰهِ وَیَخۡشَوۡنَهٗ وَلَا یَخۡشَوۡنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (سورہ احزاب:39)

”انبیاء اللہ کے پیغامات کو (لوگوں تک پورا پورا) پہنچاتے ہیں اور صرف اللہ سے ڈرتے ہیں اور سوائے اللہ کے کسی اور سے نہیں ڈرتے۔“

یَاۤاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهٗ (سورہ مائدہ :67)

”اے رسول جو جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ سب پہنچا دیجئے۔ اور اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ نے اللہ کا ایک پیغام بھی نہیں پہنچایا۔“

عقیدہ: انبیاء علیہم السلام منصب نبوت سے کبھی لائق معزولی نہیں ٹھہرتے

انبیاء کرام اپنے منصب نبوت سے کبھی معزول نہیں ہوتے اس لئے کہ حق تعالیٰ علیم وخبیر ہیں کبھی ایسے شخص کو منصب نبوت پر فائز نہیں فرماتے جو آئندہ چل کر لائق معزولی ہو۔

عقیدہ: سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام ہیں

جو زمین پر اتارے جانے کے بعد بطور نبی مبعوث ہوئے۔

ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا رد

تمام انبیاء میں سے سب سے پہلے نبی اور پہلے رسول ہمارے جد محترم حضرت آدم علیہ السلام ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا اور اپنی خاص روح ان میں پھونکی اور بالمشافہہ ان سے کلام اور خطاب فرمایا اور مسجود ملائکہ بنایا۔

حضرت آدم علیہ السلام ایک متعین شخص تھے جن سے نسل انسانی چلی۔ قرآن پاک میں ان کی تخلیق کا تفصیلی ذکر ہے جس سے جدید دور کے نظریہ ارتقاء کی نفی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ارتقاء کا رد ان آیتوں میں ہے۔

1۔ اِنَّ مَثَلَ عِیُسٰی عِنُدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنُ تُرَابٍ (آل عمران :59)

’’بے شک عیسیٰ کی مثال ہے اللہ کے نزدیک جیسے مثال آدم کی۔ بنایا اس کو مٹی سے‘‘۔

امام رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں۔

اجمع المفسرون علی ان ھذہ الآیۃ نزلت عند حضور وفد نجران علی الرسول ﷺ وکان من جملۃ شبھھم ان قالوا یا محمد لما سلمت انہ لا اب لہ من البشروجب ان یکون ابوہ ھواللہ تعالیٰ فقال ان آدم ماکان لہ اب ولاام ولم یلزم ان یکون ابنا للہ تعالیٰ فکذا القول فی عیسی علیہ السلام

مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت نجران کے وفد کے حضور ﷺ کے پاس آنے کے وقت نازل ہوئی۔ ان کے شبہات میں سے ایک شبہ یہ تھا جو انہوں نے ذکر کیا کہ اے محمد ﷺ جب آپ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بشری والد نہ تھے تو لازم آیا کہ ان کے والد اللہ تعالیٰ ہوں۔ تو آپ نے فرمایا آدم علیہ السلام کے نہ باپ تھے نہ ماں۔ ان کے لئے تو یہ لازم نہ ہوا کہ وہ اللہ کے بیٹے ہوں تو ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں لازم نہیں ہے۔

اسی آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ماں باپ نہ تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی خاص قدرت سے پیدا فرمایا تھا جب کہ نظریہ ارتقاء کے مطابق ان کے ماں باپ کا ہونا ضروری ہے اگر چہ وہ حیوان (بندر) کی صورت میں ہوں۔

2۔ وَبَدَأَ خَلُقَ الُاِنُسَانِ مِنُ طِیُنٍ ثُمَّ جَعلَ نَسُلَہٗ مِنُ سُلٰلَۃٍ مِّنُ مَّآءٍ مَّھِیُنٍ (سورہ سجدہ :7)

’’اور انسان (یعنی آدم علیہ السلام) کی پیدائش مٹی سے شروع کی پھر اس (انسان یعنی آدم) کی نسل کو خلاصہ اخلاط یعنی ایک بے قدر پانی (یعنی نطفہ) سے۔‘‘

الانسان میں لام عہد یعنی تعین کا ہے اور مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ ان کو مٹی سے پیدا کیا۔ ثُمَّ تراخی کے لئے ہوتا ہے کہ ان کے بعد ان کی نسل کو نطفہ سے پیدا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش اور طریقے سے ہوئی اور ان کی اولاد کی پیدائش دوسرے طریقے سے ہوئی۔ نظریہ ارتقاء کے مطابق دونوں کی پیدائش نطفہ سے ہوئی۔

غرض نظریہ ارتقاء اگر چہ فی ذاتہ محض ایک قیاس آرائی ہے لیکن قرآن کے بالکل خلاف ہے۔

عقیدہ: عصمت انبیاء علیہم السلام

تمام انبیاء علیہم السلام خدا کے پاک اور برگزیدہ بندے اور صغیرہ و کبیرہ گناہ سے معصوم تھے۔

عصمت کا مطلب ہے۔ **خلق مانع عن المعصیة غیر ملجی ای بل یبقی معه الاختیار۔**

عصمت ایسا خلق اور وصف ہے جو بغیر مجبور کئے معصیت سے روکتا ہے یعنی اس وصف کے ساتھ اختیار باقی رہتا ہے۔

امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

العصمة لا تزیل المحنة ای الابتلاء المقتضی لبقا ء الاختیار

”عصمت سے ابتلاء اور آزمائش زائل نہیں ہوجاتی لہٰذا اختیار باقی رہتا ہے“۔

صاحب بدایہ کہتے ہیں کہ امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ عصمت کی وجہ سے نبی اطاعت کرنے پر مجبور اور معصیت کرنے سے عاجز نہیں ہو جاتا بلکہ عصمت تو اللہ تعالیٰ کا لطف اور اس کی مہربانی ہوتی ہے جو نبی کو بھلے عمل پر ابھارتی ہے اور برے عمل سے روکتی ہے اور عصمت کا یہ عمل اسی وقت ہوسکتا ہے جب نبی کا اختیار باقی ہو۔ (مسامرہ شرح مسایرہ ص 205)

اس لطف و مہربانی اور خلق مانع کی کیا صورت ہے؟ اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص کو کسی سے واقعی انتہائی محبت و عقیدت ہو تو وہ اپنے محبوب کی مخالفت سے بچتا ہے بلکہ اس کی مخالفت کے تصور ہی سے کانپتا ہے۔ اس عاشق اور محبّ سے مخالفت کا اختیار سلب نہیں ہوگیا لیکن محبت کی وجہ سے اس میں ایسا وصف پیدا ہوگیا ہے کہ وہ اپنے اختیار کو موافقت میں استعمال کرتا ہے مخالفت میں نہیں۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ نے وصف عصمت پیدا فرما دیا جس کے اسباب بھی بتمام و کمال ان میں موجود ہوتے ہیں یعنی کمال معرفت الٰہیہ اور کمال محبت خداوندی اور ان کا کامل نمونہ ہونا۔ یہ وصف اور خلق ان کو خیر کے اختیار کرنے پر ابھارتا ہے اور برے کاموں سے روکتا ہے۔

عصمت انبیاء کی تائید میں یہ آیات دلیل ہیں

1۔ قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡ نَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ (سورہ آل عمران: 31)

”آپ کہہ دیجئے اگر تم اللہ سے محبت چاہتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔“

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی ہر بات میں مطلق پیروی کو کہا گیا ہے کسی خاص معاملہ میں پیروی کو

مقید نہیں کیا گیا جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ نبی ﷺ کا ہر عمل نمونہ ہے۔ پھر:

لَقَدُ كَانَ لَكُمُ فِيُ رَسُوُلِ اللّٰهِ اُسُوَةٌ حَسَنَةٌ (سورہ احزاب:21)

"اور تمہارے لئے اللہ کے رسول ﷺ میں عمدہ نمونہ ہے۔"

اس آیت کے مطابق تمام زندگی نمونہ ہوئی۔ لہٰذا آپ ہر ہر عمل میں معصوم ہوں گے کیونکہ اگر کسی ایک بات میں بھی آپ کو معصومیت حاصل نہ ہوتی تو مومنین کو اس سے مستثنیٰ کر دیا جاتا۔

پھر ایک اور آیت میں فرمایا: فَبِهُدٰا هُمُ اقْتَدِهٖ (سورہ انعام:90)

یعنی آپ ﷺ انبیاء کی پیروی کیجئے: اس آیت میں بغیر کسی شرط کے پیروی کرنے کا حکم ہوا لہٰذا معلوم ہوا کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کو بھی عصمت حاصل ہے ورنہ مطلقاً ان کی اقتداء کرنے کے حکم کا کچھ مطلب نہ ہوتا۔

2۔ عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (سورہ جن:26)

"غیب کا جاننے والا وہی ہے سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا ہاں مگر اپنے کسی برگزیدہ پیغمبر کو"۔

اس آیت میں فعل ارتضیٰ کو کسی بھی شرط کے بغیر ذکر کیا ہے یعنی یہ نہیں فرمایا کہ اعمال میں یا اخلاق وعادات میں یا اس امر میں اور اس امر میں چن لیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کے تمام ہی امور اور عادات وافعال اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہیں اور وہ ہر طرح سے صغائر اور کبائر سے پاک ہیں۔

عصمت انبیاء کے ثبوت پر اعتراض

قرآن پاک میں بعض آیات ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عصمت انبیاء کا عقیدہ درست نہیں ہے مثلاً

1- حضرت آدم علیہ السلام کے بارہ میں سورہ طٰہٰ میں ہے **وَعَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (121)**

2- حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارہ میں سورۃ الانبیاء میں ہے:

بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَاسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (63)

3- حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں سورہ الشعراء میں ہے:

قَالَ فَعَلْتُهَا اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ (20) نیز وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ (14)

جواب: یہ واقعات گناہ کے نہیں ہیں بلکہ یا تو سرے سے ان میں کچھ عیب ہی نہیں ہے یا صرف بھول

چوک کے ہیں یا غلط فہمی کے ہیں جو بڑے بڑے عقل مندوں کو بھی پیش آ جاتی ہے اور سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی اس سے منزہ نہیں ہے کسی مخالف مرضی کام کو موافق مرضی اور موافق مرضی کو مخالف مرضی سمجھ جائیں اور اس وجہ سے بظاہر خلاف مرضی کام ہو جائے تو ہو جائے۔ لیکن اس کو گناہ نہیں کہتے کیونکہ گناہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ جان بوجھ کر مخالفت کی جائے۔ بلکہ اس کو لغزش کہتے ہیں۔

پہلی مثال

قصہ یہ تھا کہ شیطان انکار سجدہ کے جرم میں ملعون و مردود ہو چکا تھا چونکہ یہ زخم اس کو آدم علیہ السلام کی وجہ سے پہنچا تھا اس لئے ان کا جانی دشمن ہو گیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں تو یوں مردود کیا گیا اور ان کا اعزاز ہوا ہے اب اس فکر میں لگا کہ کسی طرح آدم کو مع ان کی بیوی کے اس عیش و عشرت سے جدا کرنا چاہئے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بھی اس کی عداوت و فکر آزار رسانی سے آگاہ کر دیا تھا غرض یہ آدم علیہ السلام کے پیچھے پڑا اور ان کو جس طرح ہو سکا بہکانا شروع کیا کہ اصل میں اس درخت کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے کھانے سے حیات ابدی حاصل ہوتی ہے یا آدمی فرشتہ بن جاتا ہے۔

فَقُلۡنَا یٰاٰدَمُ اِنَّ ھٰذَا عَدُوٌّ لَّکَ وَلِزَوۡجِکَ فَلَا یُخۡرِجَنَّکُمَا مِنَ الۡجَنَّۃِ فَتَشۡقٰی (طه :117)

’’پھر کہا ہم نے اے آدم یہ دشمن ہے تیرا اور تیری بیوی کا سو نکلوا نہ دے تم کو جنت سے پھر تو پڑ جائے تکلیف میں‘‘۔

فَوَسۡوَسَ اِلَیۡہِ الشَّیۡطٰنُ قَالَ یٰاٰدَمُ ھَلۡ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَۃِ الۡخُلۡدِ وَمُلۡکٍ لَّا یَبۡلٰی (طه :120)

’’پھر وسوسہ ڈالا اس کی طرف شیطان نے کہا اے آدم کیا میں بتاؤں تجھ کو سدا زندہ رہنے کا درخت اور ایسی بادشاہی جو پرانی نہ ہو۔‘‘

قَالَ مَا نَھٰکُمَا رَبُّکُمَا عَنۡ ھٰذِہِ الشَّجَرَۃِ اِلَّاۤ اَنۡ تَکُوۡنَا مَلَکَیۡنِ اَوۡ تَکُوۡنَا مِنَ الۡخٰلِدِیۡنَ وَقَاسَمَھُمَاۤ اِنِّیۡ لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیۡنَ (اعراف:21)

’’شیطان نے کہا تم کو نہیں روکا تمہارے رب نے اس درخت سے مگر اس لئے کہ کہیں تم ہو جاؤ فرشتے یا ہو جاؤ ہمیشہ رہنے والے اور ان کے آگے قسم کھائی کہ میں یقیناً تمہارا خیر خواہ ہوں۔‘‘

مگر جس وقت اللہ تعالیٰ نے تم کو منع کیا تھا اس وقت تمہاری حالت کے مناسب یہی تھا کہ فرشتہ ہونے یا ہمیشگی کے اسباب کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ اس وقت تمہاری استعداد ضعیف تھی (جیسا کہ ضعیف المعدہ کو

غذائے قوی سے ممانعت ہوا کرتی ہے) اور اب تمہاری استعداد قوی ہوگئی ہے۔ اس حالت کے لئے ممانعت بھی نہیں ہے کیونکہ جب علت نہیں رہتی معلول بھی نہیں رہا کرتا (جیسے ضعف معدہ دور ہونے کے بعد پھر وہ سابقہ ممانعت باقی نہیں رہتی) اور اس مضمون پر قسمیں کھا گیا۔

چونکہ تاویل بڑی نمکین تھی ادھر اللہ کی قسمیں کھا گیا جس کا نام سن کر محبت والے تو گھل ہی جاتے ہیں اور وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ کوئی اس طرح خدا کے نام کی جھوٹی قسمیں کھا سکتا ہے۔ پھر شیطان نے لالچ بھی دیا تو حیات دائمی کا اور فرشتہ ہونے کا جو نور علی نور کا مصداق ہوا۔ اور پھر ممکن ہے کہ اس کو پہچانا بھی نہ ہو کسی نئی شکل میں ملا ہو۔ غرض حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور انہوں نے اپنے اجتہاد سے اس بات کو قرین قیاس اور مناسب حال سمجھا کہ اس وقت درخت سے کھانا منع نہیں ہے اور کھالیا۔ یہ حقیقت ہے لغزش میں آجانے کی یعنی مخالف مرضی کام کو غلط فہمی سے موافق مرضی سمجھ لیا۔

اگر کسی کو خلجان ہو کہ جو خطا تاویل واجتہاد سے ہو وہ اس قدر گرفت کے قابل نہیں جواب یہ ہے کہ جو شخص بلند درجہ رکھتا ہو اور بہت سمجھ دار ہو اس پر اپنے مرتبہ سے کمتر کوئی کام کرنے پر ملامت کی جاتی ہے اگرچہ وہ کام فی نفسہ خوبی والا ہو۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے **حسنات الابرار سیات المقربین** یعنی وہ کام جو عام نیکوکاروں کے حق میں خوبی اور نیکی شمار ہوتا ہے۔ بسا اوقات مقرب اور بلند درجہ والوں کے حق میں خطا سمجھا جاتا ہے اور حاصل اس کا یہ ہوتا ہے کہ تم نے زیادہ غور سے کام کیوں نہیں لیا۔

جب قصہ یوں ہے تو اللہ تعالیٰ کا قرآن پاک میں یہ ارشاد فرمانا **وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى** (اور آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا سو غلطی میں پڑ گئے یعنی خلد وہمیشگی کے مقصود کی تحصیل کے بارے میں)

اس کا مطلب یہ ہے کہ غلط فہمی یا اجتہاد میں خطا اور چوک ہو جانے سے وہ غلطی میں مبتلا ہو گئے اور ان سے قصور ہو گیا۔ اس کو نافرمانی سمجھنا جو نفس کی سرکشی اور بغاوت سے ہوتی ہے یا نفس کی شرارت سے ہوتی ہے بہت بڑی غلطی ہے۔ غرض یہ گناہ نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کے قرب اور محبت ہی کی تحصیل کی کوشش میں خطا اور چوک تھی۔

دوسری مثال

بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا

ایک مرتبہ جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ساری قوم بادشاہ، کاہن اور مذہبی پیشوا میلہ میں مصروف

تھے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ وقت آ گیا ہے کہ میں مشاہدہ کی صورت میں لوگوں پر واضح کر دوں کہ ان کے دیوتاؤں کی حقیقت کیا ہے؟ وہ اٹھے اور مندر میں پہنچے۔ دیکھا کہ وہاں بتوں کے سامنے کھانے کی چیزوں کے چڑھاوے رکھے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام نے طنزیہ لہجہ میں چپکے چپکے ان بتوں سے خطاب کر کے کہا کہ یہ سب کچھ موجود ہے ان کو کھاتے کیوں نہیں؟ اور پھر کہنے لگے میں بات کر رہا ہوں کیا بات ہے کہ تم جواب نہیں دیتے۔ اور پھر ان سب کو توڑ پھوڑ ڈالا اور سب سے بڑے بت کو چھوڑ کر واپس چلے آئے۔

فَرَاغَ اِلٰی اٰلِھَتِھِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْکُلُوْنَ مَا لَکُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ☆فَرَاغَ عَلَیْھِمْ ضَرْبًا بِالْیَمِیْنِ (سورہ صافات 93-91)

”پس چپکے سے جا گھسا ان کے بتوں میں اور کہا (ابراہیم نے ان بتوں سے) کیوں نہیں کھاتے ہو؟ تم کو کیا ہو گیا کیوں نہیں بولتے؟ پھر اپنے داہنے ہاتھ سے ان سب کو توڑ ڈالا۔“

فَجَعَلَھُمْ جُذٰذًا اِلَّا کَبِیْرًا لَّھُمْ لَعَلَّھُمْ اِلَیْہِ یَرْجِعُوْنَ (سورہ انبیاء۔58)

پس کر دیا ان کو ٹکڑے ٹکڑے مگر ان میں سے بڑے بت کو چھوڑ دیا تاکہ (اپنے عقیدہ کے مطابق) وہ اس کی طرف رجوع کریں (کہ یہ کیا ہو گیا)۔

جب لوگ میلے سے واپس آئے تو مندر میں بتوں کا یہ حال پایا۔ سخت برہم ہوئے اور ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے کہ یہ کیا ہوا اور کس نے کیا؟ ان میں وہ بھی تھے جن کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ الفاظ کہہ چکے تھے **تَاللّٰہِ لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ** (سورہ انبیاء: 57) یعنی میں تمہارے بتوں کے ساتھ خفیہ چال چلوں گا۔ انہوں نے فوراً کہا کہ یہ اس شخص کا کام ہے جس کا نام ابراہیم ہے۔

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ ھٰذَا بِاٰلِھَتِنَا اِنَّہٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیْنَ☆قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًی یَّذْکُرُھُمْ یُقَالُ لَہٗ اِبْرَاھِیْمُ (سورہ انبیاء: 59/60)

وہ کہنے لگے یہ معاملہ ہمارے خداؤں کے ساتھ کس نے کیا بلاشبہ وہ ضرور ظالم ہے (ان میں سے بعض) کہنے لگے ہم نے ایک جوان کی زبان سے ان بتوں کا (برائی کے ساتھ) ذکر سنا ہے اس کو ابراہیم کہا جاتا ہے (یعنی یہ اس کا نام ہے)

کاہنوں اور سرداروں نے جب یہ سنا تو غضبناک ہوئے اور کہنے لگے اس کو مجمع کے سامنے پکڑ کر لاؤ تاکہ سب دیکھیں کہ مجرم کون شخص ہے۔

قَالُوْا فَأْتُوْا بِہٖ عَلٰٓی اَعْیُنِ النَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَشْھَدُوْنَ☆قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ ھٰذَا بِاٰلِھَتِنَا یٰاِبْرَاھِیْمُ

(سورہ انبیاء :61-62)

”انہوں نے کہا اس کو لوگوں کے سامنے لاؤ تا کہ وہ دیکھیں۔ کہا اے ابراہیم کیا تو نے ہمارے دیوتاؤں کے ساتھ یہ کیا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دیکھ کر کہ یہ اس کافر قوم کے باطل عقیدے پر کاری ضرب لگانے کا موقع ہے یوں جواب دیا۔“

بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (سورہ انبیاء:63)

”بلکہ ان کے اس بڑے بت نے یہ کیا ہے پس اگر یہ بولتے ہوں تو ان سے دریافت کرلو۔“

یہی وہ مقام ہے جس کو معترضین بطور اعتراض پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے غلط بیانی کی تو ان کو عصمت کہاں حاصل رہی۔ حالانکہ یہ ان لوگوں کی بدفہمی ہے۔

جواب: قوم کے سوال سے غرض تعیین تھی کیونکہ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ بتوں کو کس نے توڑا اور اسی کے لئے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا تم نے بتوں کو توڑا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توڑنے والے کی تعیین کردی۔ لیکن اب یہ اعتراض باقی رہا کہ فی الواقع بڑے بت نے تو ان کو نہیں توڑا تھا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا جواب کیوں دیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک میں ہے

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى

”ریت بھری مٹھی جب آپ نے پھینکی تو آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی“۔ (سورہ انفال:17)

رسول اللہ ﷺ نے مٹھی بھر ریت پھینکی اور قرآن نے اِذْ رَمَيْتَ کہہ کر اس کا اثبات بھی کیا لیکن پھر مَا رَمَيْتَ کہہ کر رسول اللہ ﷺ سے پھینکنے کی نسبت کی نفی کی اور وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى کہہ کر پھینکنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی۔ رسول اللہ ﷺ سے پھینکنے کی نفی اور اللہ تعالیٰ کی طرف پھینکنے کی نسبت تاثیر حقیقی کے اعتبار سے ہے یعنی بظاہر تو رسول اللہ ﷺ نے پھینکی لیکن چونکہ موثر حقیقی تو اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے اس لئے تاثیر حقیقی کے اعتبار سے اصل پھینکنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔

اور یہ بات ذہن نشین رہے کہ معبود حقیقی وہی ذات ہوسکتی ہے جو قدرت کاملہ رکھتی ہو اور موثر حقیقی ہو جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:

اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ (سورہ انبیاء:66)

”تو کیا اللہ کو چھوڑ کر تم ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو تم کو نہ کچھ نفع پہنچا سکے اور نہ ہی نقصان پہنچا

سکے۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم چونکہ ان بتوں کو معبود حقیقی اور قادر مطلق سمجھتی تھی تو ان کے عقیدے کے اعتبار سے جواب دیا بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا یعنی (ہاں میں نے ان کو توڑا ہے لیکن جب تم ان کو معبود حقیقی اور موثر حقیقی اور قادر مطلق سمجھتے ہو تو ان کی قدرت اور تاثیر حقیقی کے اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ) بلکہ اس بڑے بت نے ان کو توڑا ہے۔

اس بیان سے واضح ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام میں کچھ عیب نہیں جو ان کے لباس عصمت پر دھبہ بن سکے۔

تیسری مثال

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک اسرائیلی اور ایک فرعونی کو آپس میں لڑتے دیکھا۔ چونکہ زیادتی فرعونی کی تھی اور اسرائیلی نے ان سے مدد چاہی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اول فرعونی کو سمجھایا۔ جب وہ باز نہ آیا تو اس کو تادیب کے طور پر ایک مکا مارا۔ اتفاق سے وہ فرعونی مکا لگنے سے مر گیا۔ قتل کرنا مقصد نہ تھا لہٰذا یہ قتل خطا ہوا اور چونکہ وہ حربی بھی تھا اس لئے زیادہ سے زیادہ خلاف اولیٰ فعل ہوا جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کمال خوف الٰہی سے گناہ سمجھا۔ نبوت ابھی عطا نہیں ہوئی تھی۔ یہاں ضالین کا مطلب ہے بلا قصد خطا کرنے والے۔

باب:3

معجزات یا دلائل نبوت

معجزہ کا لفظ لغت میں عجز سے بنا ہے جو قدرت کی ضد ہے۔ اس کے آخر میں حرف ہا یا تو اس میں مبالغہ کے لئے ہے اور یا خود لفظ معجزہ صفت ہے آیت (نشانی) کی جو محذوف ہے۔

اسکو معجزہ اس لئے کہتے ہیں کہ مخلوق اس کے کرنے سے عاجز ہوتی ہے۔ خارق عادت کام کو معجزہ کہنا بطور مجاز ہے۔ درحقیقت معجز (عاجز کرنے والا) وہ فعل نہیں ہوتا جو نبی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے بلکہ اللہ کی ذات اس فعل کے ذریعے سے مکذبین و منکرین کو عاجز کرتی ہے۔

تعریف: معجزہ اس خارق عادت کام کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے پیغمبر کی تصدیق کے لئے صادر ہو۔

قرآن پاک میں اس کی جگہ آیت اور برہان کے الفاظ اور حدیث میں علامات و دلائل کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ علم عقائد والوں کے نزدیک لفظ معجزہ بطور اصطلاح رائج ہے۔

قرآن پاک کی چند آیات جن میں معجزات کو آیات (نشانیوں) اور برہان کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے

1۔ فَلَمَّا جَآئَھُمۡ مُّوۡسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوۡا مَاھٰذَا اِلَّا سِحۡرٌ مُّفۡتَرًی (سورہ قصص :36)

"پس جب موسیٰ ان کے پاس ہماری کھلی نشانیوں کے ساتھ آئے تو انھوں نے کہا یہ نہیں ہے مگر گھڑا ہوا جادو۔"

2- فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔

اِنۡ کُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰیَۃٍ فَاۡتِ بِھَا اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ (سورہ اعراف :106)

"اگر تو آیا ہے کوئی نشانی لے کر تو اس کو لا اگر تو سچا ہے۔"

3- کفار کہتے تھے۔

فَلۡیَاۡتِنَا بِاٰیَۃٍ کَمَا اُرۡسِلَ الۡاَوَّلُوۡنَ (سورہ انبیاء)

"پس چاہیئے کہ وہ لائے ہمارے پاس کوئی نشانی جیسے کہ پہلے رسول بھیجے گئے۔"

4- حضرت صالح علیہ السلام کا قول نقل کیا۔

يَا قَوۡمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمۡ اٰيَةً (سوره هود: 64)

''اے میری قوم یہ اونٹنی ہے اللہ کی تمہارے لئے نشانی۔''

5- اُسۡلُكۡ يَدَكَ فِىۡ جَيۡبِكَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَاءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡءٍ وَّاضۡمُمۡ اِلَيۡكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهۡبِ فَذَانِكَ بُرۡهَانَانِ مِنۡ رَّبِّكَ (سوره قصص: 32)

''ڈال اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں نکلے گا سفید ہو کر بغیر کسی بیماری کے اور ملا لے اپنی طرف اپنے بازو کو ڈر سے (بچنے کے لئے)۔ پس یہ دو معجزے ہیں تیرے رب کی طرف سے۔''

افعال واشیاء کے وجود میں سببیت اور شرطیت اور تاثیر کا دخل

معارف السنن ج 1 ص 142، 141 پر ہے:

هل فى الاشياء خواص مؤثرة ام لا؟ و فيه مذاهب۔

''ترجمہ: کیا اشیاء میں ایسے خواص ہوتے ہیں جو دوسری اشیاء میں تاثیر رکھتے ہوں؟'' اس بارے میں مندرجہ ذیل اقوال ہیں:

1- مذهب الامام ابى الحسن الاشعرى و هو انه لا علاقة بين الاشياء و آثارها الا يجرى العادة الالهية بخلق بعضها عقيب بعض كالاحراق عقيب مماسة النار فلا دخل للنار حقيقة فى الاحراق فله ان يخلق الاحراق من غير نار و ان يخلق نارا من غيران تحرق۔

2- مذهب ابى منصور الماتريدى و اتباعه و هو القول بخلق التاثير فى الاشياء بان فى الاشيار خواص مؤثرة مستندة الى قدرة اللّٰه و خلقه اياها، و مع هذا يقدر ان يجردها عنها متى شاء۔ و هذا المذهب هو الذى تخضع لها العقول السليمة و عليها تضافرت الادلة السمعية۔ قال تعالىٰ حكاية عن عيسىٰ عليه السلام و احى الموتى باذن الله فنسب الاحياء الى نفسه و عقبه بقوله باذن الله اشارة الى عدم استقلال قدرته فى الخلق و الاحياء۔

3- مذهب المعتزلة۔ وهو القول بالتوليد بان خلق الاشياء و فيها خواص مؤثرة تتولد هذه من تلك الاشياء وجوبا من غير ان هناك دخل لقدرة الله فى تاثيرها۔

ترجمہ:

1- امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اشیاء اور ان کے اثرات کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوتا البتہ اتنی بات ہے کہ عادۃ اللہ یوں جاری ہے کہ وہ ایک شے (مسبب) کو دوسری شے (سبب) کے موجود ہونے کے بعد پیدا کرتے ہیں مثلاً آگ کپڑے کو چھوتی ہے جو کہ سبب ہے تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کپڑے کے جلنے کو پیدا فرما دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کپڑے کو جلانے میں آگ کو حقیقت میں کچھ دخل نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کپڑے کو بغیر آگ کے جلا سکتے ہیں اور آگ کو اس طرح پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ نہ جلائے (غرض ان کے نزدیک آگ میں جلانے کی تاثیر نہیں ہوتی)۔

2- امام ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ اور ان کے پیروکاروں کا قول ہے کہ اللہ اشیاء میں تاثیر پیدا کرتے ہیں بایں طور کہ اشیاء میں ایسے خواص رکھتے ہیں جو مؤثر ہوں اور دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان خواص کو اللہ نے اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے اور اللہ جب چاہیں اشیاء میں سے ان خواص کو نکال دیں۔ عقل سلیم اس قول کو تسلیم کرتی ہے اور دلائل نقلیہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول نقل کیا کہ اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (یعنی میں مردوں کو زندہ کرتا ہوں اللہ کے حکم سے)۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پہلے مردوں کو زندہ کرنے کو اپنی طرف منسوب کیا پھر کہا کہ اللہ کے حکم سے۔ اس سے اس طرف اشارہ کیا کہ خلق و احیاء یعنی پیدا کرنے اور زندہ کرنے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مستقل قدرت حاصل نہیں تھی۔

3- معتزلہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کو پیدا اور ان میں دوسرے پر اثر انداز ہونے والے خواص رکھے۔ خواص مؤثرہ سبب بنے اور ان کی وجہ سے خود بخود اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دخل کے بغیر مسبب وجود میں آئے۔

ماتریدیہ کے قول کی وضاحت

اس میں کوئی شک نہیں کہ آگ سے حرارت، پانی سے برودت اور سورج سے فضا کی روشنی ضرور ہوتی ہے لیکن اگر کوئی یوں سمجھے کہ آگ حرارت کی اور پانی برودت کا اور سورج فضا کی روشنی کا موجد اور خالق ہے اور خدا نے ان اشیاء کو قدرت عنایت فرما دی ہے کہ اس کے ذریعہ اپنے اثرات کو ایجاد اور پیدا کریں تو یہ کفر و شرک کی بات ہے، وجود عطا کرنا اور ایجاد کرنا صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔

اشیاء میں تاثیر کس طرح اثر کرتی ہے

انسان جب کوئی فعل کرتا ہے تو اپنی ذات میں موجود قدرت کو اس فعل کو کرنے کی طرف متوجہ کر دیتا ہے

پھر اللہ تعالیٰ اپنی صفت قدرت اور صفت تکوین سے اس فعل کو پیدا کر دیتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آگ میں کپڑا جلانے کی تاثیر رکھی ہے۔ آگ جب کپڑے کو چھوتی ہے تو آگ میں جلانے کی صفت اور تاثیر کپڑے کو جلانے کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ جلانے اور جلنے کے فعل کو پیدا فرما دیتے ہیں۔

ماتریدیہ کے دلائل

(1) علامہ نسفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

السمع ھی قوۃ مودعة موضوعة فی العصب المفروش فی مقعر الصماخ تدرك بھا الاصوات بطریق وصول الھواء المتکیف بکیفیة الصوت الی الصماخ بمعنی ان اللہ تعالیٰ یخلق الادراك فی النفس عند ذلك۔ (شرح العقائد للنسفی)۔

’’سماعت وہ قوت ہے جو اس عصبی (Nervous) تار میں رکھی گئی ہے جو کان کے سوراخ کی گہرائی میں بچھی ہوئی ہے۔ اس عصبی تار (Nerve) کے سبب سے آواز کو اس ہوا کے ذریعے سنا جاتا ہے جو آواز کی کیفیت سے متکیف ہو کر کان کے سوراخ میں پہنچتی ہے۔ ایسی ہوا کے وہاں پہنچنے پر اللہ تعالیٰ اپنی عادت جاریہ کے تحت نفس میں آواز کی سماعت و ادراک کو پیدا فرماتے ہیں۔‘‘

غرض آواز کی سماعت کی خلق و ایجاد تو اللہ تعالیٰ کرتے ہیں البتہ آواز کی کیفیت والی ہوا کا کان کے سوراخ میں پہنچنا سماعت کا سبب ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم سماعت کو اس کے سبب کے ساتھ گھومتا پاتے ہیں۔ اگر سبب ہے یعنی آواز کی کیفیت والی ہوا کان کے سوراخ میں ہے تو سماعت ہے اور اگر نہیں ہے تو سماعت بھی نہیں ہے۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ کی یہ بات ہمارے ان اشعری حضرات کے نظریے کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ مذکور سبب کے اثر کے بغیر محض اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے سماعت حاصل ہوتی ہے۔ یہ حضرات تو یہاں تک کہتے ہیں:

وایضا یقول لیس ضوء الصبح من الشمس ولیس الرویة بالشعاع بل الکل بخلق اللہ تعالیٰ۔ قلنا نعم ولکن ھذا لایبطل الاسباب التی جرت بھا العادۃ الالٰھیة۔

’’ترجمہ: صبح کی روشنی سورج سے نہیں ہوتی اور رویت (روشنی کی) شعاعوں سے نہیں ہوتی بلکہ ہر

چیز (بغیر سبب کے محض) اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے ہوتی ہے۔''

''ہم (ماتریدیہ) کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا پیدا کرنا سلسلہ اسباب کو باطل نہیں کرتا جو اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ عام طور سے جب کسی شے کو پیدا کرتے ہیں مثلاً سیرابی کو پیدا کرتے ہیں تو ٹھنڈا پانی پینے کے وقت پیدا کرتے ہیں یا ٹھنڈے پانی کو آلہ وذریعہ بنا کر پیدا کرتے ہیں۔ یہ بات کہ اللہ تعالیٰ ٹھنڈے پانی کے اثر کا کچھ لحاظ نہیں کرتے ایسا نہیں ہے۔''

اہل سنت کا پھر آپس میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ:

ان اللہ تعالیٰ یفعل بالسبب او عند السبب۔

فالاول مختار الامام الغزالی والشیخ محی الدین ابن عربی فی بعض فتوحاتہ مستدلا بقولہ تعالیٰ قاتلوھم یعذبھم اللہ بایدیھم۔

والثانی ظاھر مذھب الاشعری من ان کل ممکن مستند الی الحق تعالیٰ بالواسطۃ۔

وزعم الامام الرازی ان کون السبب آلۃ لا ینافی الاستناد بلا واسطۃ۔ (نبراس وحواشی ص 67)

''ترجمہ: اللہ تعالیٰ جو (مسبب) فعل پیدا کرتے ہیں وہ سبب کو آلہ بنا کر کرتے ہیں یا سبب کی محض موجودگی میں کرتے ہیں۔''

پہلا قول امام غزالی اور امام محی الدین ابن عربی رحمہما اللہ کا اختیار کردہ ہے۔ ابن عربی رحمہ اللہ نے اس کو اپنی کتاب فتوحات مکیہ کے بعض مقام میں ذکر کیا ہے۔ ان کی دلیل قرآن پاک کی یہ آیت ہے:

قَاتِلُوْھُمْ یُعَذِّبْھُمُ اللّٰہُ بِاَیْدِیْکُمْ۔ (سورہ توبہ: ١٤)

''یعنی تم کافروں سے جنگ کرو۔ اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے ہاتھوں عذاب دیں گے۔''

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو عذاب دینے کے لیے مسلمانوں کو آلہ اور سبب بنایا۔

دوسرا قول امام اشعری رحمہ اللہ کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ممکن کی اللہ تعالیٰ کی طرف استناد اور اضافت بغیر کسی واسطہ اور آلہ کے ہے۔ لیکن امام رازی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ سبب کا آلہ ہونا بلا واسطہ نسبت و استناد کے منافی نہیں ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اعلم ان بعض افعال اللہ یترتب علی القوی المودعۃ فی العالم بوجہ من وجوہ الترتب

شهد بذلك النقل و العقل۔ النقل قال رسول الله ﷺ ان الله خلق آدم من قبضة قبضها من جميع الارض فجاء بنو آدم على قدر الارض منهم الاحمر و الابيض والاسود و بين ذلك والسهل والحزن والخبيث والطيب و ساله عبدالله بن سلام ما ينزع الولدالى ابيه او الى امه فقال اذا سبق ماء الرجل ماء المرأة نزع الولد و اذا سبق ماء المرأة ماء الرجل نزعت۔ والعقل لا ارى احدا يشك فى ان الا ماتتة تستند الى الضرب بالسيف او اكل السم و ان خلق الولد فى الرحم يكون عقيب صب المنى و ان خلق الحبوب والاشجار يكون عقيب البذر والغرس والسقى۔

(جان لو کہ اللہ تعالیٰ کے بعض افعال کا ترتب کسی نہ کسی طریقے سے عالم میں ودیعت شدہ قوتوں پر ہوتا ہے۔ نقلی اور عقلی دلائل دونوں ہی اس پر دلالت کرتے ہیں:

نقلی دلائل:

1- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک مشت مٹی سے پیدا کیا جو پوری سے زمین سے لی گئی تھی تو ان کی اولاد اسی کے مطابق پیدا ہوئی۔ کوئی سرخ یعنی گندمی رنگ کا ہے، کوئی سفید ہے، کوئی کالا ہے اور کوئی درمیانے رنگ کا ہے اور کوئی نرم طبیعت کا ہے تو کوئی سخت طبیعت کا، کوئی بری طبیعت والا ہے تو کوئی اچھی طبیعت والا ہے۔

2- حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا چیز ہے جو بچے کو اس کے باپ کی طرف یا اس کی ماں کی طرف کھینچتی ہے (اور اس کے مشابہ کر دیتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جب مرد کا نطفہ عورت کے نطفہ پر سبقت کر جائے (اور اس کے جینز Genes عورت کے Genes پر غالب آ جائیں) تو بچہ مرد کے مشابہ ہو جاتا ہے اور اگر عورت کا نطفہ سبقت کر جائے (اور اس کے جینز مرد کے جینز پر غالب آ جائیں) تو بچہ ماں کے مشابہ ہو جاتا ہے۔

عقلی دلیل

یہ ہے کہ کوئی بھی شخص کسی کے قتل کئے جانے کی استناد تلوار مارنے یا زہر کھانے کی طرف کرنے میں شک نہیں کرتا۔ اسی طرح رحم میں بچے کے بننے کو منی ڈالنے کی طرف نسبت کرنے میں شک نہیں کرتا اور اسی طرح اناج اور درختوں کے پیدا ہونے کی نسبت بیج ڈالنے اور پودا لگانے اور پانی دینے کی طرف کرنے میں شک نہیں کرتا۔

معجزہ کی حقیقت

قانون فطرت کی نوعیت دراصل قانون عادت کی ہے۔ اور اسی قانون عادت کو عادۃ اللہ بھی کہتے ہیں اسی کی بناء پر عمل فطرت میں یکسانی نظر آتی ہے۔ ان قوانین عادت کا منشا اندھے بہرے بے علم اور بے اختیار مادہ (Matter) کا اٹل وجوب ولزوم نہیں ہے بلکہ ایک علم واختیار والی ذات (اللہ تعالیٰ) ہے جو اپنی کسی حکمت ومشیت کے تحت کبھی کبھی اس عام عادت کے خلاف اور اپنی خاص عادت کے مطابق بھی کرسکتی ہے۔

یاد رہے کہ عادت اللہ کی دو قسمیں ہیں۔

(1) عام جاری عادت (یعنی عام عادت جو جاری نظر آتی ہے) (2) خاص موقت عادت (یعنی خاص خاص وقت کی عادت)۔

عادت کی یہ دونوں ہی قسمیں ہمیں نوع انسانی کے افراد میں بھی ملتی ہیں مثلاً ایک شخص کو ہم دیکھتے ہیں کہ بڑا نرم خو حلیم الطبع اور بردبار ہے۔ ہزار گالیاں سننے اور اشتعال دلانے پر بھی اسے غصہ نہیں آتا لیکن اس کے باوجود یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی مذہب پر حملہ ہو یا اس کے سامنے پیغمبر علیہ السلام کی توہین کی جائے تو اس وقت غصہ سے بے تاب ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ تو توہین کے وقت اس کی یہ سخت گیری اور درشتی اگرچہ اس کی عام عادت کے خلاف ہے لیکن وہ بجائے خود اس کی ایک خاص اور مستقل عادت ہے جس کے تجربہ کا موقع گاہ بگاہ اس کے اسباب مہیا ہونے پر ملتا رہتا ہے۔

اب جس چیز کو معجزہ کہتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک فعل ہے جو اس کی عام عادت کے گو خلاف ہے مگر خاص عادت کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ اس کے موافق ہوتا ہے کیونکہ خاص اوقات میں مخصوص مصالح کی بناء پر عادت کو چھوڑ کر خوارق ومعجزات کو ظاہر کرنا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک خاص عادت ہے اور جیسا کہ عام جاری عادت کے تحت اللہ تعالیٰ کے افعال کے وقوع میں آنے کا سلسلہ اسباب ہوتا ہے مثلاً بچہ پیدا ہوتا ہے تو مرد وعورت کے ملنے سے اور پھر کم از کم ایک مخصوص مدت تک رحم میں پرورش پانے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ کیا خاص عادت کے تحت واقع ہونے والے افعال کے پیچھے بھی کوئی مخفی سلسلہ اسباب ہوتا ہے یا وہ کسی بھی سلسلہ اسباب سے خالی ہوتے ہیں۔ اس بارے میں قرآن وحدیث میں کوئی تصریح نہیں ہے البتہ دونوں باتوں کا احتمال ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے دریا کا پھٹ جانا اور پانی کا دو پہاڑوں کی طرح کھڑے ہو جانا اس میں اس کا بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرشتوں نے اپنے عظیم الشان پروں سے پانی کو روک لیا ہو اور اس کا بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانی میں بہنے کی جو خاصیت رکھی ہے انہوں نے اس پانی سے وہ

خاصیت سلب کر لی ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس آگ میں ڈالا گیا تو اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تپش اور جلانے کی خاصیت سلب کر لی ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کسی فرشتے کی ٹھنڈی سانس نے اس آگ کی تپش کو ختم کر دیا ہو۔ غرض کسی فعل میں دونوں احتمال ہوں یا کسی میں ان میں سے متعین صرف ایک احتمال ہو یہ سب کچھ ممکن ہے اور اللہ تعالیٰ کو ہر طرح کی قدرت ہے۔ ان کا صرف یہ کہنا کہ ہو جا کسی کام کے ہونے کے لئے کافی ہے۔

قدرت اور عادت کے درمیان فرق

ایک ہے کام کی قدرت (یعنی کر سکنا) اور ایک ہے اس کی عادت (یعنی کرتے رہنا) یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ ہر انسان اپنے تئیں محسوس کرتا ہے کہ خورد و نوش، لباس، سواری اور معاشرت کے متعلق جو امور اس کی عادت میں داخل ہیں وہ ان کے خلاف پر بھی قادر ہے گو ان کے خلاف پر عمل کرنا اس کی عادت میں داخل نہیں۔ اسی طرح جو لوگ خدا کی ہستی اور اس کی قدرت کے قائل ہیں ان کو لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ خدا کی قدرت اور عادت یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل ممتاز و جدا ہیں۔ ضروری نہیں کہ جو کچھ خدا کر سکتا ہے وہ سب کر ڈالے اور جو کر ڈالے اس کو بار بار اور ہمیشہ کرتا رہے۔

ہم قادر مطلق کی یہ عادت برابر دیکھتے چلے آتے ہیں کہ وہ بچے کو رحم مادر سے نکالتا ہے اور پھر بتدریج پرورش کرتا ہے چنانچہ ہم میں سے کسی نے نہیں دیکھا کہ کوئی جوان انسان یوں ہی آسمان سے گرا دیا گیا ہو یا زمین سے اگ آیا ہو۔ مگر اس کے باوجود ہم یقین رکھتے ہیں کہ اس کی عام جاری عادت کے خلاف رحم اور نطفہ کے توسط کے بغیر انسان کو پیدا کرنا خدا کی قدرت میں شامل ہے۔ آخر ابتدائے آفرینش میں جب انسان پیدا کیا گیا تو یقیناً اس کی کیفیت اس متعارف طریقہ پیدائش سے بالکل مختلف تھی اور تمام اقوام و ملل کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اس وقت ایک یا متعدد انسان بغیر ازدواجی وسائل اور موجودہ قانون تناسل کے محض خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ سے جوان جوان پیدا ہو گئے تھے۔

جو شخص یہ سب کچھ تسلیم کرتا ہے قطعاً حق نہیں رکھتا کہ وہ اس کے بعد قادر مطلق کو ظاہری سلسلہ اسباب میں ایسا جکڑ بند کر دے کہ خواہ کیسی ہی حکمت اور مصلحت کا تقاضا ہو مگر وہ ایک منٹ کے لئے ان اسباب کے سلسلہ سے علیحدہ ہو کر کوئی بھی کام کرنے سے مجبور اور عاجز ٹھہرے۔

معجزہ کا دلیل نبوت ہونا

عام انسانوں کی فطرت ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی شخص غیر معمولی دعوی کرتا ہے تو وہ اس سے دلیل کے طلب گار ہوتے ہیں اور اس سے بڑھ کر کیا دعویٰ ہوگا کہ ایک شخص یہ کہے کہ وہ لوگوں کی طرف خدا کا فرستادہ ہے۔ چونکہ یہ دعویٰ بہت بڑا اور بہت غیر معمولی (Extra-Ordinary) ہے اس لئے اس کی دلیل اور نشانی بھی غیر معمولی (Extra-Ordinary) ہونی چاہئے۔ اور اگر چہ وہ لوگ جو عالی فہم اور سلیم الطبع ہوتے ہیں ان کے لئے اصل دلیل تو نبی کی ذات وصفات اور اس کی تعلیم ہوتی ہے لیکن عام لوگ جو ظاہری اور حسی نشانیوں سے متاثر ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بھی تشنہ نہیں چھوڑتے اور ضرورت و مصلحت کے مطابق اپنے انبیاء کو ایسی نشانیاں عطا فرماتے ہیں جن کو دکھانے سے دوسرے تمام انسان عاجز ہوں تا کہ کوئی شخص انبیاء علیہم السلام سے معارضہ نہ کر سکے کہ ایسا تو اور لوگ بھی کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت دی تو وہ کہنے لگے کہ:

مَا اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا فَاۡتِ بِاٰيَةٍ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ (سوره شعراء:154)

''تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم سو لے آ کچھ نشانی اگر تو سچا ہے۔''

اس کے جواب میں حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا:

يَا قَوۡمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمۡ اٰيَةً (سوره هود:64)

''اے میری قوم یہ اونٹنی ہے اللہ کی تمہارے لئے نشانی۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت دی تو وہ بولا:

اِنۡ كُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰيَةٍ فَاۡتِ بِهَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ (سوره اعراف :106)

اگر تو آیا ہے کوئی نشانی لے کر تو لا اگر تو سچا ہے تو جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا **فَاَلۡقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ** (اعراف:107) تب ڈال دیا اس نے اپنا عصا تو اسی وقت ہو گیا اژدھا صریح۔

لیکن جو لوگ حق اور اس کی نشانی کو دیکھنے اور پہچاننے کے باوجود ماننے پر آمادہ نہ ہوں اور محض کٹ حجتی کے طور پر قسم قسم کے مطالبے کرتے ہوں تو مصلحت وحکمت کے خلاف ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے مطالبے پورے نہیں کرتے۔

یاد رہے کہ معجزہ اور کرامت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو کسی نبی یا ولی کے ہاتھ پر ظاہر کیا جاتا ہے۔ جب اللہ چاہتے ہیں ان کو ظاہر فرماتے ہیں نبی یا ولی کو قدرت حاصل نہیں ہوتی کہ وہ از خود جب چاہیں معجزہ یا کرامت کر کے دکھا دیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے اور کوئی معجزہ دکھانے کا دعویٰ کرے تو اللہ

تعالیٰ اس کے ہاتھ پر معجزہ کو ظاہر نہیں کرتے کیونکہ اگر یوں عادت جاری نہ ہو تو انتظام عالم بگڑ جائے۔ دنیا میں اگر کوئی شخص بادشاہ کی نیابت یا سفارت کا جھوٹا دعویٰ کر کے جعلی سند بناتا ہے تو بادشاہ خبر پانے کے بعد ملکی انتظام کی خاطر اس جھوٹے کو بڑی سزا دیتا ہے۔ جب دنیا کے حاکموں اور بادشاہوں کو ملکی انتظام اس قدر مقصود ہوتا ہے تو کیا احکم الحاکمین کو اپنے عالم کا انتظام مقصود نہ ہوگا۔ لہٰذا جھوٹے شخص سے ہرگز معجزہ ظاہر نہ ہونے دے گا اور اس جھوٹے کو دنیا ہی میں رسوا کرے گا۔

1- مسلیمہ کذاب سے کسی نے کہا کہ حضرت محمد ﷺ نے فلاں شخص کی آنکھ میں اپنا لعاب مبارک ڈالا تھا تو وہ درست ہوگئی تھی اگر تو نبی ہے تو تو بھی ایسا کر۔ مسلیمہ نے خراب آنکھ میں اپنا لعاب ڈالا لیکن اس کی وجہ سے بیمار کی دوسری آنکھ بھی خراب ہوگئی۔

2- ماضی قریب میں مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا۔ مرزا نے بہت سی پیشین گوئیاں کیں۔ چونکہ پیشین گوئی سچے نبی کے حق میں معجزہ اور دلیل نبوت ہوتی ہے اور مرزا قادیانی جھوٹا مدعی نبوت تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس کی تمام پیشین گوئیوں کو غلط کر دیا۔ مثلاً
محمدی بیگم سے شادی کرنے کی پیشین گوئی
10 مئی 1888ء کے مرزائی اشتہار میں تفصیل شائع ہوئی:

”محمدی بیگم کے ماموں (مرزا امام الدین وغیرہ) جو مجھ کو میرے دعویٰ الہام میں مکار اور دروغ گو خیال کرتے تھے مجھ سے کوئی نشانی آسمانی مانگتے تھے۔ اس وجہ سے کئی دفعہ ان کے لئے دعا کی گئی۔ سو وہ دعا قبول ہو کر خدا تعالیٰ نے یہ تقریب قائم کی...... خدائے قادر وحکیم مطلق نے مجھے فرمایا کہ اس شخص کی دختر کلاں (محمدی بیگم) کے نکاح کے لئے سلسلہ جنبانی کر اور ان سے کہہ دے کہ تمام سلوک اور مروت تم سے اسی شرط سے کیا جائے گا اور یہ نکاح تمہارے لئے موجب برکت اور ایک رحمت کا نشان ہوگا۔ لیکن اگر نکاح سے انحراف کیا تو اس لڑکی کا انجام نہایت ہی برا ہوگا اور جس کسی دوسرے شخص سے بیاہی جائے گی وہ روز نکاح سے اڑھائی سال تک اور ایسا ہی والد اس دختر کا تین سال تک فوت ہو جائے گا...... پھر ان دنوں میں جو بار بار توجہ کی گئی تو معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ نے یہ مقرر کر رکھا ہے کہ وہ احمد بیگ کی دختر کلاں کو...... ہر ایک روک دور کرنے کے بعد انجام کار اسی عاجز کے نکاح میں لائے گا......“ (تبلیغ رسالت ج ا ص 117 بحوالہ رئیس قادیان)

”بدخیال لوگوں کو واضح ہو کہ ہمارا صدق یا کذب جاننے کے لئے ہماری پیش گوئی سے بڑھ کر اور کوئی محل امتحان نہیں ہوسکتا (تبلیغ رسالت 117 بحوالہ رئیس قادیان)

”میں بار بار کہتا ہوں کہ نفس پیش گوئی داماد احمد بیگ کی تقدیر مبرم (یعنی اٹل) ہے۔ اس کا انتظار کرو۔ اور اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ پیش گوئی پوری نہیں ہوگی اور میری موت آجائے گی۔“

”یاد رکھو کہ اس پیش گوئی کی دوسری جزو (سلطان محمد کی موت) پوری نہ ہوئی تو میں ہر ایک بد سے بدتر ٹھہروں گا۔ اے احمقو یہ انسان کا افتراء نہیں نہ یہ کسی خبیث مفتری کا کاروبار ہے۔ یقیناً سمجھو کہ یہ خدا کا سچا وعدہ ہے۔ وہی خدا جس کی باتیں نہیں ٹلتی ہیں۔“ (بحوالہ رئیس قادیان ص 166)

نتیجہ

لیکن نہ تو مرزا قادیانی کا نکاح مرزا احمد بیگ کی بیٹی محمدی بیگم سے ہوا اور نہ ہی محمدی بیگم کے شوہر اور مرزا احمد بیگ کے داماد مرزا سلطان محمد کا انتقال ہوا بلکہ وہ مرزا قادیانی کے انتقال کے بعد بھی بڑی عمر تک زندہ رہا۔

(ii) عیسائی مسٹر عبداللہ خاں آتھم سابق ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی ہلاکت کی پیشین گوئی

اس پیش گوئی کے بارے میں مرزا قادیانی کے الفاظ یہ تھے۔

”آج رات جو مجھ پر کھلا وہ یہ ہے کہ جب میں نے بہت تضرع اور ابتہال سے جناب الٰہی میں دعا کی کہ تو اس امر میں فیصلہ کر اور ہم عاجز بندے ہیں تیرے فیصلہ کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ تو اس نے مجھے یہ نشان بشارت کے طور پر دیا کہ اس بحث میں دونوں فریقوں میں سے جو فریق عمدا جھوٹ کو اختیار کر رہا ہے اور عاجز انسان (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو خدا بنا رہا ہے وہ انہی دنوں مباحثہ کے لحاظ سے یعنی فی دن ایک مہینہ لے کر یعنی پندرہ ماہ تک ہاویہ میں گرایا جائے گا اور اس کو سخت ذلت پہنچے گی۔ بشرطیکہ حق کی طرف رجوع نہ کرے......

”میں اس وقت اقرار کرتا ہوں کہ اگر یہ پیش گوئی جھوٹی نکلی یعنی وہ فریق جو خدا تعالیٰ کے نزدیک جھوٹ پر ہے وہ پندرہ ماہ کے عرصہ میں آج کی تاریخ سے بہ سزائے موت ہاویہ میں نہ پڑے تو میں ہر ایک سزا کے اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ مجھ کو ذلیل کیا جاوے۔ روسیاہ کیا جاوے میرے گلے میں رسہ ڈال دیا جاوے۔ مجھ کو پھانسی دیا جاوے۔ ہر ایک بات کے لئے تیار ہوں۔ اور میں اللہ جل شانہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ضرور وہ ایسا ہی کرے گا ضرور کرے گا زمین و آسمان ٹل جائیں پر اس کی باتیں نہ ٹلیں گی۔“ (بحوالہ رئیس قادیان جلد دوم ص 164)

نتیجہ

یہ آتھم جس کے سوا سال میں ہلاک ہونے کی پیش گوئی کی گئی وہ ایک ضعیف العمر بیمار شخص تھا اور ہر چند

کہ اس کمزور اور بوڑھے شخص کی موت کے تمام قرائن موجود تھے لیکن خدائے غیور کو قادیانی متنبّی کی رسوائی منظور تھی اس لئے باوجودیکہ ڈاکٹروں کی بھی رائے تھی کہ وہ چھ ماہ سے زیادہ جانبر نہ ہوسکے گا آتھم ڈھائی تین سال تک زندہ رہا۔

تنبیہ

رسول اللہ ﷺ چونکہ خاتم النبیین ہیں اور آپ ﷺ کے بعد کوئی نیا نبی نہیں اس لئے اب جو شخص بھی نبوت کا دعویٰ کرے وہ یقیناً جھوٹا ہے اور اس سے کوئی معجزہ طلب کرنا بھی بے اصولی اور بڑی غلطی ہے۔

نوٹ

1- جو خرق عادت نبی سے دعویٰ نبوت کے بعد ظاہر ہو اس کو معجزہ کہتے ہیں اور جو نبوت سے پہلے ظاہر ہو اس کو ارہاص کہتے ہیں۔

2- جو خرق عادت کسی ولی سے ظاہر ہو اس کو کرامت کہتے ہیں۔ ولی کی کرامت اس نبی کا معجزہ شمار ہوتی ہے جس کی امت میں سے وہ ولی ہوتا ہے کیونکہ یہ خود اس نبی کی صداقت پر دلیل ہے۔

حضرت مریم علیہا السلام جو کہ نبی نہ تھیں بلکہ ولیہ اور صدیقہ تھیں بطور کرامت بے موسم رزق کا ان کے پاس آنا قرآن کریم میں مذکور ہے۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيُهَا زَكَرِيَّا الُمِحُرَابَ وَجَدَ عِنُدَهَا رِزُقًا قَالَ يَا مَرُيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتُ هُوَمِنُ عِنُدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرُزُقُ مَنُ يَّشَآءُ بِغَيُرِ حِسَابٍ (سورہ آل عمران: 37)

ترجمہ: ”حضرت (زکریا جب کبھی محراب میں مریم کے پاس جاتے اور ان کے پاس) عجیب وغریب (کھانے کی چیزیں) رکھی ہوئی (دیکھتے تو پوچھتے اے مریم یہ رزق تمہارے پاس کہاں سے آیا، وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آیا بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بغیر حساب کے رزق دیتے ہیں)۔“

2- حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر اور صاحب ومشیر یعنی آصف بن برخیا جو کہ نبی نہ تھے ان کا پلک جھپکنے سے پہلے بلقیس کے تخت کو لاکر حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے رکھ دینا قرآن کریم میں مذکور ہے۔

قَالَ الَّذِىُ عِنُدَهٗ عِلُمٌ مِّنَ الُكِتَابِ اَنَا اٰتِيُكَ بِهٖ قَبُلَ اَنُ يَّرُتَدَّ اِلَيُكَ طَرُفُكَ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسُتَقِرًّا عِنُدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنُ فَضُلِ رَبِّى لِيَبُلُوَنِىُ ءَ اَشُكُرُ اَمُ اَكُفرُ (سورہ نمل: 40)

ترجمہ: ”کہا اس شخص نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہ میں اس تخت کو آپ کی پلک جھپکنے سے

پہلے آپ کے پاس لا کر رکھ دوں گا چنانچہ وہ لے آیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب اسکو اپنے سامنے رکھا ہوا دیکھا تو فرمایا کہ یہ اللہ کا فضل ہے جس سے مقصود میری آزمائش ہے کہ اس کا شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں)۔"

3- اصحاب کہف کا قصہ بھی قرآن کریم میں مذکور ہے کہ صدہا سال اللہ کے حکم سے سوئے رہے اور کروٹیں بدلتے رہے۔ یہ اصحاب کہف کی کرامت تھی۔

وہ خرق عادت جو کسی کافر کے ہاتھ سے ظاہر ہو اس کو استدراج کہتے ہیں۔

باب: 4

انبیاء علیہم السلام میں حضرت محمد ﷺ کے امتیازات

حضرت محمد ﷺ خاتم النبیین ہیں

تمام انبیاء میں سب سے آخری نبی اور آخری رسول حضرت محمد ﷺ ہیں۔ آپ کا دین اور آپ کی شریعت گزشتہ تمام دینوں اور شریعتوں کی ناسخ ہے اور آپ کی کتاب یعنی قرآن پاک آخری کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی پیغمبری سے دین کو مکمل کر دیا اب حضور ﷺ کے بعد کسی پیغمبر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

حضرت محمد ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کے دلائل

1- قرآن پاک میں ہے۔

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِکُمۡ وَلٰکِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا (سورہ احزاب:40)

> ”ترجمہ: محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے آخر میں ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔“

تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ خاتم النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپ آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد کسی کو منصب نبوت پر فائز نہیں کیا جائے گا چنانچہ امام حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

فھذہ الایة نص فی انہ لا نبی بعدہ واذا کان لا نبی بعدہ فلا رسول بالطریق الاولی......وبذالک وردت الاحادیث المتواترة عن رسول اللہ ﷺ من حدیث جماعة من الصحابة رضی اللہ عنھم (تفسیر ابن کثیر ص193 ج 3)

”یہ آیت اس مسئلہ میں نص اور صریح ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور جب آپ کے بعد کوئی نبی نہیں تو رسول بدرجہ اولیٰ نہیں ہوسکتا۔ اور اس مسئلہ پر کہ آپ کے بعد کوئی نبی و رسول نہیں آنحضرت ﷺ کی متواتر احادیث وارد ہیں جو صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت سے مروی ہیں۔“

امام قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں۔

قال ابن عطية هذه الالفاظ عند جماعة علماء الامة خلفا و سلفا متلقاة على العموم التام مقتضية نصا انه لا نبى بعده ﷺ

”ابن عطیہ فرماتے ہیں کہ خاتم النبیین کے یہ الفاظ تمام قدیم وجدید علماء امت کے نزدیک کامل عموم پر ہیں جو نص قطعی کے ساتھ تقاضا کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی بھی نبی نہیں۔“

حجتہ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ ”الاقتصاد“ میں فرماتے ہیں

ان الامة فهمت بالاجماع من هذا اللفظ ومن قرائن احواله انه افهم عدم نبى بعده ابدا......وانه ليس فيه تاويل ولا تخصيص فمنكر هذا لا يكون الا منكر الاجماع (الاقتصاد فى الاعتقادص123)

”بے شک امت نے بالاجماع اس لفظ (خاتم النبیین) کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ آپ ا کے بعد کوئی نبی (اور رسول) نہ ہوگا۔ اور اس پر اجماع ہے کہ اس لفظ میں کوئی تاویل و تخصیص نہیں۔ پس اس کا منکر یقیناً اجماع امت کا منکر ہے۔“

2- آنحضرت ﷺ نے متواتر احادیث میں (وہ احادیث جن کو روایت کرنے والے ہر زمانہ میں اتنی کثیر تعداد میں ہوں کہ ان کے جھوٹ پر متفق ہونے یا سب کے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا احتمال باقی نہ رہے۔ یہ احادیث یقین کا فائدہ دیتی ہیں) اپنے خاتم النبیین ہونے کا اعلان فرمایا۔ اور ختم نبوت کی ایسی تشریح بھی فرمادی کہ اس کے بعد آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے میں کسی شک وشبہ اور تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

1۔ عن ابى هريرة رضى الله عنه ان رسول الله ﷺ قال مثلى ومثل الانبياء من قبلى كمثل رجل بنى بنيانا فاحسنه واجمله الاموضع لبنة من زاوية من زواياه فجعل الناس يطوفون به ويعجبون له ويقولون هلا وضعت هذه اللبنة قال فانا اللبنة وانا خاتم النبيين(بخارى ومسلم واللفظ لمسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے بہت ہی حسین وجمیل محل بنایا مگر اس کے کسی کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ اس کے گرد گھومنے اور اس پر عش عش کرنے لگے اور یہ کہنے لگے کہ یہ ایک اینٹ بھی کیوں نہ لگا دی گئی؟ آپ نے فرمایا میں وہی (کونے کی آخری) اینٹ ہوں اور میں نبیوں کو ختم کرنے والا ہوں۔

ب۔ عن سعد بن ابی وقاص رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ لعلی انت منی بمنزله هارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی (بخاری)

’’حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا تم مجھ سے وہی نسبت رکھتے ہو جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں۔‘‘

ج۔ عن ثوبان رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ انه سیکون فی امتی کذابون ثلا ثون کلهم یزعم انه نبی وانا خاتم النبیین لا نبی بعدی (ابو داؤد)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں تیس جھوٹے پیدا ہوں گے۔ ہر ایک یہی کہے گا کہ میں نبی ہوں حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کسی قسم کا نبی نہیں۔

د۔ عن انس بن مالك رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی (ترمذی)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلا شبہ رسالت ونبوت ختم ہو چکی ہے پس میرے بعد نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔

3- مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ اپنی کتاب تحذیر الناس میں ختم نبوت پر جو دلیل لائے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے۔

سید المرسلین حضرت محمد ﷺ جیسے امت کے نبی ہیں اسی طرح انبیاء کے بھی نبی ہیں جس کے دلائل یہ ہیں۔

ا۔ وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّ حِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآئَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ (سوره آل عمران : 81)

’’اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم پھر آئے تمہارے پاس کوئی

رسول کہ سچا بتادے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔“

ب۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر (حضرت) موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو میرا ہی اتباع کرتے۔

ج۔ نزول کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنحضرت ﷺ کی شریعت پر عمل کریں گے۔

جب آپ نبی الانبیاء ہیں تو آپ ﷺ تمام انبیاء سے مرتبہ میں فائق ہیں۔ کوئی اور نہ آپ کے برابر کا ہے اور نہ ہی آپ سے بڑھ کر۔ اور سلسلہ نبوت مرتبہ میں آپ تک جا کر ختم ہو جاتا ہے۔

اور چونکہ نبوت کمالات علمی سے ہے تو نبوت میں تمام انبیاء سے فائق بلند مرتبہ ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ﷺ کو دیگر تمام انبیاء سے زیادہ علم حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کو قرآن ملا جو تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ ہے یعنی ایسی کتاب ہے جس میں تمام علوم ہدایت اور اصول دین اور فلاح دارین سے متعلق ضروری امور کا نہایت مکمل اور واضح بیان ہے۔ اور جب آپ کو قرآن ہی ملنا تھا جس کے بارے میں یہ محکم وعدہ الٰہی ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (سورہ حجر:9)

”ہم نے خود اتاری ہے یہ کتاب اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں)۔“

تو قرآن کے علوم کا باقی اور محفوظ رہنا بھی ضروری تھا۔

اب اگر آپ ﷺ سب سے پہلے آتے یا سلسلہ نبوت کے درمیان میں آتے تو آپ کے بعد آنے والے انبیاء کا دین اگر دین محمدی کے مخالف ہوتا تو اعلیٰ کا ادنیٰ سے منسوخ ہونا لازم آتا حالانکہ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا (سورہ بقرہ:106)

”جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلوا دیتے ہیں تو بھیج دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر“

اور انبیاء متاخرین کا دین اگر مخالف نہ ہوتا تو چونکہ وحی انبیاء کا خاصہ لازم ہے اس لئے ان پر وحی آتی اور افاضہ علوم کیا جاتا ہے اور اس صورت میں اگر وحی علوم محمدی ہی ہوتے تو اس وحی کی کیا ضرورت ہوتی اور اگر علوم محمدی کے علاوہ ہوتے تو پھر قرآن کا تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ ہونا غلط ہوتا۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ آپ ﷺ سب سے آخر میں آئیں اور آپ کے بعد کوئی بھی نبی نہ ہو۔ بالفاظ دیگر آپ ﷺ کی خاتمیت مرتبہ (یعنی مرتبہ نبوت کے آپ پر ختم ہونے) کو آپ کی تاخر زمانی (یعنی تمام انبیاء کے بعد ہونا) لازم ہے۔

حضرت محمد ﷺ کی نبوت کا سابقہ آسمانی کتابوں سے ثبوت

قرآن پاک اس بارے میں گواہ ہے کہ یہود و نصاری اپنی آسمانی کتابوں کی وجہ سے کہ ان میں نبی ﷺ کے بارے میں بڑی کھلی کھلی بشارتیں تھیں آپ ﷺ کو خوب اچھی طرح پہچانتے تھے۔

1۔ اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰھُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآئَھُمۡ (سورہ بقرہ:146)

”جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے ہیں اس کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو“

2۔ وَاِذۡ قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ یٰبَنِیۡ اِسۡرَآئِیۡلَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرَاۃِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡ بَعۡدِی اسۡمُہٗ اَحۡمَدُ (سورہ صف:6)

”اور جب کہا عیسیٰ بن مریم نے اے بنی اسرائیل میں بھیجا ہوا ہوں اللہ کا تمہارے پاس اس حال میں کہ تصدیق کرنے والا ہوں اپنے سے پہلی کتاب تورات کی اور خوشخبری سنانے والا ہوں ایک رسول کی جو آئے گا میرے بعد اس کا نام ہے احمد۔“

چند ایک بشارتیں یہ ہیں۔

پہلی بشارت

تورات سفر استثناء کے باب 23 میں ہے۔

”خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا۔ وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی۔ ہاں وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے۔“

پہاڑ سینا سے رب کا آنا یہ تھا کہ اس نے وہاں موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی اور کوہ شعیر پر طلوع ہونے سے مراد ہے عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی اور فاران مکہ مکرمہ کے پہاڑوں کو کہتے ہیں پس کوہ فاران سے خدا کے جلوہ گر ہونے سے قرآن اتارنا مراد ہے کہ وہاں اترنا شروع ہوا اور فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار صحابہ تھے اور آتشیں شریعت بھی آپ کے ہاتھ میں تھی۔ آتشیں شریعت سے مراد یہ ہے کہ مشرکوں، راہزنوں اور حرام کاروں اور چوروں بدمعاشوں کے لئے اس شریعت میں سخت احکام ہیں۔

اور یہ بات کہ فاران مکہ کے پہاڑ کو کہتے ہیں تورات سفر تکوین باب 21 میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں یوں ذکر ہے۔ ”اور وہ فاران کے بیابان میں رہا۔“ اور یہ بات متفق علیہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام مکہ کے بیابان میں رہا کرتے تھے اور وہاں ہی انہوں نے پرورش پائی ہے۔

دوسری بشارت

انجیل متی کے تیسرے باب میں لکھا ہے

’’ان دنوں میں یوحنا بپتسمہ دینے (یعنی اس وقت کے خدائی دین کو قبول کرنے والوں کو رنگین پانی میں غوطہ دینے یا ان کے سر پر وہ پانی چھڑکنے) والا یہودیہ کے بیابان میں ظاہر ہو کے منادی کرنے اور یہ کہنے لگا کہ توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت نزدیک ہے‘‘۔

اور اسی انجیل کے چوتھے باب میں یوں ہے

’’جب یسوع نے سنا کہ یوحنا گرفتار ہوا تب جلیل کو چلا گیا۔ اور اسی وقت سے عیسیٰ نے منادی کرنی اور یہ کہنا شروع کیا کہ توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آئی۔ اور عیسیٰ جلیل کے عبادت خانوں میں تعلیم دیتا اور آسمانی بادشاہت کی خوشخبری سناتا تھا۔‘‘

اور اسی انجیل کے دسویں باب میں یوں ہے کہ

’’عیسیٰ نے اپنے شاگردوں کو یہ تعلیم کی کہ چلتے ہوئے منادی کرو اور کہو کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آئی۔‘‘

ان حوالجات سے معلوم ہوا کہ حضرت یحییٰ (یوحنا) علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کے عہد میں آسمانی سلطنت ظاہر نہ ہوئی تھی اور آسمانی سلطنت سے لباس شاہی میں نبوت مراد ہے یعنی اندر تو فقر اور ترک دنیا اور محبت الٰہی وغیرہ ہو اور ظاہر میں حکمرانی بایں طور کہ آسمانی احکام کا اجراء ہے اور شیاطین و سرکشوں کے شر کا دفعیہ ہے۔ یہ آسمانی سلطنت حضرت محمد ﷺ کو حاصل ہوئی۔

تیسری بشارت

انجیل یوحنا کے چودہویں باب میں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمایا۔

’’اگر تم مجھے دوست رکھتے ہو تو میری وصیتوں کو یاد رکھو اور میں باپ سے مانگتا ہوں وہ تمہیں فارقلیط دے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے...... اور اب میں نے تم کو اس کے آنے سے پہلے خبر دے دی تا کہ جب وہ آئے تب تم ایمان لاؤ۔ اس کے بعد میں تم سے بہت کلام نہ کروں گا اس لئے کہ اس جہان کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کی کوئی چیز نہیں۔‘‘

سولہویں باب میں ہے۔

لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تمہارے لئے میرا جانا ہی بہتر ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو فارقلیط تمہارے پاس نہ آوے گا۔ پر اگر میں جاؤں گا تو میں اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔

فارقلیط کا لفظ پیرکلوطوس کا معرب ہے جس کا معنی محمد یا احمد کے قریب ہیں۔

ہمارے نبی ﷺ کے زمانہ تک لوگ فارقلیط کے منتظر تھے چنانچہ بعض لوگوں نے فارقلیط ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔ چنانچہ منتس مسیحی نے دوسری صدی میں دعویٰ کیا تھا کہ میں وہ فارقلیط نبی ہوں جس کی عیسیٰ علیہ السلام نے خبر دی ہے۔ بہت سے عیسائی لوگ اس پر ایمان لائے۔ لب التواریخ کا مصنف جو عیسائی ہے وہ بھی لکھتا ہے کہ محمد ﷺ کے زمانے کے یہود ونصاریٰ ایک نبی کے منتظر تھے۔ اسی وجہ سے حبشہ کا بادشاہ نجاشی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے نبی ﷺ کا حال سن کر ایمان لایا اور کہا کہ بے شک یہ وہی نبی ہیں کہ جن کی عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل میں خبر دی ہے۔ اور نجاشی عیسائی تھا اور تورات وانجیل کو خوب جانتا تھا۔ اسی طرح قبط کے بادشاہ مقوقس نے حضرت کی نبوت کا اقرار کیا اور بہت سے ہدیے آپ کی خدمت میں روانہ کئے اور یہ عیسائی بادشاہ بھی تورات وانجیل کا بڑا عالم تھا۔ اور جارود بن العلاء جو اپنی قوم میں عیسائیوں کے بڑے عالم تھے حضرت پر ایمان لائے اور کہا کہ بے شک آپ کی خبر انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی ہے۔ اور ہرقل شاہ روم نے بھی اقرار کیا تھا۔

چوتھی بشارت

تورات سفر استثناء کے اٹھارہویں باب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

> ”میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا“

یہ بشارت بھی حضرت محمد ﷺ پر صادق آتی ہے کیونکہ آپ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح کے صاحب شریعت رسول تھے اور بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے تھے۔

عقیدہ: حضرت محمد ﷺ کی بعثت ونبوت تمام عالم کے لئے ہے

آنحضرت ﷺ کی بعثت اور نبوت تمام عالم کے لئے عام ہے یعنی آپ عیسائیوں اور یہودیوں سمیت تمام جہان کے لئے نبی ہیں اور آپ کی نبوت کی دعوت جن وانس سب کو شامل ہے جیسا کہ قرآن کریم اور احادیث متواترہ سے قطعی دلالت کے ساتھ ثابت ہے۔

1- وَمَا اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سورہ سبا: 28)

’’ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے۔‘‘

2- قُلۡ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعًا (سورہ اعراف: 158)

’’آپ یہ اعلان کر دیجئے اے لوگو میں تم سب کے لیے اللہ کی طرف سے رسول ہو کر آیا ہوں۔‘‘

3- تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِهٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرًا (سورہ فرقان: 1)

’’بابرکت ہے وہ ذات جس نے قرآن اپنے بندے پر اتارا تاکہ تمام جہانوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائے۔‘‘

پس آپ تمام عالم کے لئے نبی ہیں اور قیامت تک آپ ہی کی نبوت کا دور دورہ ہے اور دین اسلام کے سوا کوئی اور دین قبول نہ ہوگا۔

4- اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ (سورہ آل عمران:19)

’’بلاشبہ دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔‘‘

5- وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا (سورہ مائدہ :3)

’’اور میں نے اسلام کو تمہارے دین بننے کے لئے پسند کر لیا۔‘‘

6- وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡهُ وَهُوَ فِی الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ (سورہ آل عمران:85)

’’اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ اس سے مقبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔‘‘

7- یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ قَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمۡ عَلٰی فَتۡرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا جَآءَنَا مِنۡۢ بَشِیۡرٍ وَّ لَا نَذِیۡرٍ فَقَدۡ جَآءَکُمۡ بَشِیۡرٌ وَّ نَذِیۡرٌ وَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (سورۃ مائدہ:19)

’’اے اہل کتاب (یعنی اے یہودیو اور عیسائیو) تمہارے پاس یہ ہمارے رسول (ﷺ) آ پہنچے جو تم کو (شریعت کی باتیں) صاف صاف بتاتے ہیں ایسے وقت میں کہ رسولوں (کے آنے) کا سلسلہ (مدت سے) موقوف تھا (اور مختلف حوادث کی وجہ سے سابقہ شریعتیں مفقود ہو گئی تھیں اور فترت رسل کی وجہ سے ان کے علم کا کوئی ذریعہ نہ تھا اس لیے کسی رسول کے آنے کی بہت ضرورت تھی۔ تو ایسے وقت میں آپ کی تشریف آوری کو بڑی نعمت سمجھنا چاہئے) تاکہ تم (قیامت میں) یوں نہ کہنے لگو کہ (ہم دین کے باب میں کوتاہی کرنے میں اس لیے معذور تھے کہ) ہمارے پاس کوئی (رسول جو کہ) بشیر ونذیر (ہو جس سے ہم کو دین کے بارے میں

صحیح علم ہوتا) نہیں آیا (اور پہلی شریعتیں ضائع ہو چکی تھیں۔ اس لیے ہم سے کوتاہیاں ہو گئیں) سو (سمجھ رکھو کہ اب عذر کی گنجائش نہیں رہی کیونکہ) تمہارے پاس بشیر اور نذیر (یعنی (محمد ﷺ) آ چکے ہیں (اب ماننا نہ ماننا اس کو تم دیکھ لو) اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

8- اور حدیث میں ہے کہ جس یہودی اور نصرانی کو میری خبر پہنچے اور وہ مجھ پر ایمان نہ لائے اور اسی حالت میں مر جائے تو وہ دوزخیوں میں سے ہوگا (مسلم)

چونکہ آپ جن وانس دونوں کے رسول ہیں اس لئے حضور کو رسول الثقلین کہتے ہیں۔ آپ ﷺ کے حضور میں جنات کا حاضر ہونا اور قرآن شریف کا سننا اور ایمان لانا اور پھر واپس جا کر اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دینا قرآن کریم کی سورہ جن اور سورہ احقاف میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔

عقیدہ: حضرت محمد ﷺ تمام پیغمبروں کے سردار اور سب سے افضل ہیں

حضرت محمد ﷺ تمام پیغمبروں کے سردار اور سب سے افضل اور بہتر ہیں۔ اس بات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔

1- قرآن کریم میں ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے تمام پیغمبروں سے اس بات کا عہد لیا کہ اگر محمد رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پاؤ تو ضرور بالضرور ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد اور نصرت کرنا جیسا کہ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتَابٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآئَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ (سورہ آل عمران:81) کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا ہے۔ آیت کا ترجمہ ہے: "اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دی کتاب اور حکمت پھر آئے تمہارے پاس رسول کہ سچا بتائے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ضرور ایمان لاؤ گے اور اس کی ضرور مدد کرو گے۔

2- ایک حدیث میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا انا سید ولد آدم (میں اولاد آدم کا سردار ہوں) اور ایک اور حدیث میں ہے آدم ومن دونہ تحت لوائی (قیامت کے دن آدم اور ان کے سوا سب میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے)۔

3- ترمذی کی ایک حدیث میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا: اذا کان یوم القیامة کنت امام النبیین (قیامت کے دن میں تمام انبیاء کا امام اور پیشوا ہوں گا)۔

4- ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ سب سے پہلے قبر سے اٹھیں گے اور سب سے پہلے بہشت میں داخل ہوں گے۔

5- ایک حدیث میں ہے:

عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال فضلت علی الانبیاء بست اعطیت جوامع الکلم و نصرت بالرعب و احلت لی الغنائم و جعلت لی الارض مسجدا وطهورا و ارسلت الی الخلق کافة و ختم بی النبیون (مسلم)

آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھ کو تمام انبیاء پر چھ چیزوں کے ذریعہ فضیلت دی ہے۔ اول یہ کہ مجھ کو جوامع الکلم عطا کئے گئے (یعنی ایسے جامع کلمات جن کے الفاظ تو بہت مختصر ہوں مگر بے شمار علوم اور معارف کے جامع ہوں جیسے انما الاعمال بالنیات) دوسرے یہ کہ (ایک مہینے کی مسافت تک رہنے والے کافروں کے دل میں بلا سبب ظاہری) میرا رعب ڈال کر میری مدد کی گئی ہے۔ تیسرے یہ کہ مال غنیمت میری امت کے لئے حلال کر دیا گیا جو پہلی امتوں کے لئے حلال نہ تھا۔ چوتھے یہ کہ میرے لئے پوری زمین کو سجدہ گاہ اور تیمّم کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ پانچویں یہ کہ مجھ سے پہلے ہر نبی ایک خاص قوم کے لئے مبعوث ہوتا اور میں قیامت تک کے لئے تمام عالم کا نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں چھٹے یہ کہ مجھ پر نبوت ختم کی گئی۔

عقیدہ

آنحضرت ﷺ کو تمام مخلوقات سے زیادہ وہ علوم عطا ہوئے جن کو ذات وصفات الٰہیہ اور عملی احکام اور نظری حکمتوں اور حقائق حقہ اور اسرار خفیہ وغیرہ سے تعلق ہے کہ مخلوق میں کوئی بھی آپ کے برابر نہیں ہو سکتا نہ مقرب فرشتہ اور نہ ہی کوئی نبی و رسول۔ آپ کو اولین و آخرین کے وہ علوم عطا ہوئے جو آپ کے منصب اعلیٰ کے مناسب ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کو زمانہ کی ہر آن میں واقع ہونے والے ہر ہر واقعہ کی اطلاع ہو اور کوئی ذرہ بھی آپ کے مشاہدہ سے باہر نہ ہو۔

باب: 5

عقیدہ حیات النبی

مقدمہ کے طور پر چند باتوں کو جان لینا ضروری ہے۔

1- قبر کے لفظ کا حقیقی اطلاق اس گڑھے پر کیا جاتا ہے جس میں میت دفن ہوتی ہے اور مجازی طور پر اس برزخی مقام پر بھی بولا جاتا ہے جہاں میت یا اس کے اجزاء ہوں خواہ وہ اجزاء ایک جگہ مجتمع ہوں یا مختلف جگہوں پر بکھرے ہوئے ہوں یعنی ریزہ ریزہ ہو کر اس کے خلیات (Cells) متفرق ہو گئے ہوں پھر خواہ وہ درندوں پرندوں کا پیٹ ہو یا دریا کی گہرائی ہو یا آتش کدہ میں راکھ کی صورت میں ہو۔

2- موت کا مطلب ہے قیامت تک کے لئے روح کو بدن سے نکال لینا۔ روح فنا نہیں ہوتی بلکہ اس کو مناسب حال ٹھکانا دے دیا جاتا ہے۔ جب میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اپنے مستقر میں رہتے ہوئے روح کا میت کے مادی جسم کے ساتھ ایک تعلق قائم کر دیا جاتا ہے روح کا وہ کلی تعلق جو جسم کے ساتھ دنیا میں تھا موت کے بعد وہ تو باقی نہیں رہتا البتہ اتنا تعلق قائم کر دیا جاتا ہے جس سے علم وشعور وغیرہ حاصل ہوتا ہے۔ حدیث میں جو اعادۂ روح کا ذکر ہے اس سے یہی تعلق مراد ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ ایک انصاری کے جنازہ کے لئے نکلے اور قبرستان میں پہنچے لیکن ابھی قبر تیار نہیں ہوئی تھی۔ آپ بھی وہاں تشریف فرما ہوئے اور ہم بھی آپ کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ آپ نے (ایک طویل حدیث میں) مومن اور کافر کی وفات کا تذکرہ فرمایا۔ اس میں مومن کے بارے میں یہ ارشاد بھی مذکور ہے۔

حتی ینتهی بها الی السماء السابعة فیقول الله اکتبوا کتاب عبدی فی علیین واعیدوه الی الارض فانی منها خلقتهم وفیها اعیدهم ومنها اخرجهم تارة اخری فتعاد روحه فی جسده فیاتیه ملکان فیجلسانه فیقولان له من ربك ......الحدیث

”مومن کی روح کو پھر ساتویں آسمان پر پہنچا دیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے کا نام علیین میں درج کردو اور اس کو زمین کی طرف لوٹا دو کیونکہ میں نے ان کو زمین سے پیدا کیا ہے اور اسی میں ان کو لوٹاؤں گا اور اسی سے دوسری مرتبہ نکالوں گا۔ پس اس کی روح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں۔ اور اس کو بٹھا کر من ربک الخ سے سوال کرتے ہیں (مسند احمد)“

یہ مذکورہ بالا تعلق ہی کی وجہ ہے کہ فرشتے میت کو قبر میں بٹھاتے ہیں اور اس سے سوال جواب کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد عذاب و راحت کے حالات مردہ پر گزرتے ہیں۔ ان تمام حالات کے واقع ہونے کے لئے تو اتنا بھی کافی ہے کہ اگر میت کا صرف ایک خلیہ (Cell) بھی موجود ہو تو روح کا اس کے ساتھ تعلق قائم کر دیا جائے اور تمام حالات اس ایک خلیہ پر گزریں اور روح ان کا ادراک و احساس کر سکے اور ان سے متاثر ہو سکے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

ومقام علیین بالائے ہفت اسمان است وپائین آں متصل سدرة المنتهی است وبالائے آں متصل بپایه راست عرش مجید وارواح نیکاں بعد از قبض دراں جا میرسند ومقرباں یعنی انبیاء واولیاء دراں مستقرمی مانند وعوام و صلحاء را بعد از نویسانیدن ورسیدن نامهائے اعمال برحسب مراتب درآسمان دنیا......وتعلقے به قبر نیز ایں ارواح را میباشد که بحضور زیارت کنندگاں اقارب ودیگر دوستاں برقبر مطلع ومستانس میگردند زیرا که روح را قرب وبعد مکانی مانع ایں دریافت نمیشود۔ (تفسیر عزیزی پاره نمبر 30)

”اور علیین کا مقام سات آسمانوں کے اوپر ہے اور اس کا زیریں حصہ سدرۃ المنتہی سے متصل ہے اور اس کا بالائی حصہ عرش مجید کے دائیں پائے کے ساتھ متصل ہے اور نیک لوگوں کی ارواح کو قبض کرنے کے بعد وہاں پہنچا دیا جاتا ہے اور مقربین یعنی حضرات انبیاء کرام و اولیاء کی ارواح کا مستقر بھی وہی ہے اور عام صلحاء کو ان کے نامہ اعمال علیین پہنچانے کے بعد حسب مراتب آسمان دنیا میں ٹھکانا ملتا ہے......اور ان ارواح کا قبر کے ساتھ بھی تعلق ہوتا ہے کہ جو لوگ ان کی زیارت کیلئے آتے ہیں اور جو ان کے اقارب اور دوسرے دوست آتے ہیں ان کی آمد سے وہ مطلع اور ان سے مانوس ہوتے ہیں کیونکہ روح کے لئے قرب اور بعد مکانی اس دریافت سے مانع نہیں ہے۔“

تنبیہ:

جن اموات کو عالم برزخ میں جسم مثالی دیئے جاتے ہیں روح کا اپنے مستقر میں رہتے ہوئے جسم مادی کے ساتھ ساتھ اس جسم مثالی کے ساتھ بھی ایسا ہی تعلق ہوتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں

اللہ تعالیٰ روح آں میت را بقدریکه ادراك وتالم وتلزذ ازو حاصل شود ببدنے ازابدان عنصریه موجوده یا مثالیه مخترعه متعلق میسازد(تحفه اثنا عثریه بحواله تسکین الصدور ص146)

”اللہ تعالی اس میت کی روح کو اس انداز سے کہ ادراک اور تکلیف اور لذت اس سے حاصل ہو موجود اجسام عنصریہ یا نئے دیئے ہوئے اجسام مثالیہ میں سے بدن کے ساتھ متعلق کر دیتا ہے۔“

4- روح کا جسم مادی کے ساتھ تعلق متفاوت ہوتا ہے۔ عام اموات میں جتنا تعلق ہوتا ہے شہداء میں یہ تعلق اس سے قوی تر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جسم بہت مدت تک باقی رہتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام میں یہ تعلق تو شہداء سے بھی زیادہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اجسام مبارکہ محفوظ رہتے ہیں اور ان سے بعض افعال مثلاً نماز پڑھنا صادر ہوتا ہے۔

5- قبر میں مادی جسم پر جو حالات گزرتے ہیں ان کا تعلق چونکہ عالم برزخ سے ہے جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے اس لئے مادی اور حسی دنیا میں گو ہمیں یہ حالات اور افعال (جیسے انبیاء کا اپنی قبروں میں نماز پڑھنا) ہوتے نظر نہ آئیں لیکن ہمارے حواس سے ماوراء اور ہمارے عالم مادی سے علیحدہ عالم برزخ میں بہرحال یہ واقع ہوتے ہیں۔

اہل سنت کا حیات النبی کے نام سے جو عقیدہ ہے وہ فقط یہ ہے کہ وہ حیات (یعنی روح مبارکہ کا اپنے مستقر اعلی علیین میں رہتے ہوئے جسم مبارک کے ساتھ قوی ترین تعلق) عالم برزخ میں ہوتی ہے لیکن قوی ترین تعلق کی بنا پر عالم برزخ میں اس جسم مادی کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ (اگرچہ اس حسی اور مادی عالم میں وہ ہمیں نماز پڑھتے ہوئے نظر نہ آئیں) اس لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی حیات دنیا کی سی ہے۔

حیات النبی کا یہ عقیدہ اجماعی ہے۔

علامہ داؤد بن سلیمان بغدادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں

والحاصل ان حیاۃ الانبیاء ثابتة بالاجماع (بحواله تسکین الصدور 241)

’’حاصل یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات بالاجماع ثابت ہے۔‘‘

اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

حیاة النبی صلی الله علیه وسلم فی قبره هو وسائر الانبیاء معلومة عندنا علما قطعیا لما قام عندنا من الادلة فی ذلك وتواترت به الاخبار الدالة علی ذلك (بحواله تسکین الصدور ص 241)

آنحضرت ﷺ کی اپنی قبر مبارک میں اور اسی طرح دیگر انبیاء کی حیات ہمارے نزدیک قطعی طور پر ثابت ہے کیونکہ اس پر ہمارے نزدیک دلائل قائم ہیں اور تواتر کے ساتھ اخبار موجود ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں۔

تنبیہ: فرشتے جو آ کر قبر میں مدفون میت کو بٹھاتے ہیں اور اس سے سوال جواب کرتے ہیں یا انبیاء علیہم السلام اپنے اجسام مبارکہ کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں تو ایسا عالم برزخ میں ہوتا ہے ورنہ عالم مادی میں تو وہ ہمیں لیٹے ہی ہوئے نظر آئیں جیسے عالم خواب میں ایک شخص بیٹھا یا کھڑا ہوتا ہے یا دوڑ رہا ہوتا ہے حالانکہ عالم مادی میں وہ اپنے بستر پر لیٹا ہوا نظر آ رہا ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ عالم خواب عام طور سے ایک خیالی عالم ہے جب کہ عالم برزخ ایک واقعی عالم ہے۔

تنبیہ:

1- حضرت انس رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

الانبیاء احیاء فی قبورهم یصلون

’’یعنی انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔‘‘ (تسکین الصدور ص 220)

2- حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مررت علی موسیٰ لیلة اسری بی عند الکثیب الاحمر وهو قائم یصلی فی قبره (مسلم)

’’میں معراج کی رات موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا جو سرخ رنگ کے ٹیلے کے پاس اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔‘‘

3- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من صلی عند قبری سمعته و من صلی علی من بعید اعلمته (تسکین الصدور ص 327)

’’جس نے میری قبر کے پاس درود پڑھا تو میں اسے خود سنتا ہوں اور جس نے مجھ پر دور سے درود پڑھا تو وہ مجھے (بواسطہ فرشتوں کے) بتلایا جاتا ہے۔‘‘

4- حضرت اوس بن اوس سے روایت ہے:

قالوا یا رسول الله و کیف تعرض صلوتنا علیك وقد ارمت......فقال ان الله عزوجل حرم علی الارض اجساد الانبیاء (مشکوٰۃ)

”لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہمارا درود آپ پر کس طرح پیش کیا جائے گا جب کہ آپ ریزہ ریزہ ہو چکے ہوں گے آپ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے اجسام حرام کر دیئے ہیں۔“

اہلسنت کا جو عقیدہ ذکر ہوا یہ قرآن پاک کے عین موافق ہے قرآن پاک میں ہے۔

اَللّٰـهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَاالْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَل مُسَمًّى (سورہ زمر:42)

”ترجمہ: اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہو ان کے مرنے کا اور جو نہیں مریں ان کو کھینچ لیتا ہے ان کی نیند میں پھر رکھ چھوڑتا ہے جن پر مرنا ٹھہرا دیا ہے اور چھوڑ دیتا ہے دوسروں کو ایک مقررہ وقت تک۔“

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ارواح کو نیند میں کھینچ لیتے ہیں تو سوئے ہوئے آدمی کی روح اس کے جسم سے خارج ہوتی ہے لیکن جسم کے ساتھ اس کا تعلق منقطع نہیں ہوتا۔ اب اس بے روح جسم پر نیند کے عالم میں کیا کچھ حالات نہیں گزرتے۔ جسم سے افعال تک صادر ہوتے ہیں۔ مثلاً کروٹ بدلنا، ٹانگ سکیڑنا بولنا یہاں تک کہ بعض لوگ تو نیند میں چلنا شروع کر دیتے ہیں اور بچے اپنا سبق دہرانے لگتے ہیں۔

جو عقیدہ بیان ہوا وہ اس کیفیت کے ساتھ موافقت رکھتا ہے روح جسم مادی سے علیحدہ اپنے مستقر میں رہے البتہ جسم کے ساتھ اس کا تعلق ہو جو اگر قوی ترین ہو تو جسم سے نماز کا فعل صادر ہونے لگے۔ بس اتنا فرق ہے کہ نیند میں ہمیں جسم سے صادر ہونے والے افعال کا شعور نہیں ہوتا اور عالم برزخ میں یہ شعور ہونا ناممکن نہیں ہے۔ بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھیں تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تو بعینہ یہ معاملہ حیات دنیوی میں پیش آتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

ان عینی تنامان ولا ینام قلبی یعنی میری دونوں آنکھیں سوتی ہیں لیکن میرا دل نہیں سوتا (بخاری)

اس حدیث کے ساتھ جب مذکورہ بالا آیت کا مضمون ملایا جائے تو بات یوں بنے گی کہ نیند کے وقت

رسول اللہ ﷺ کی روح مبارکہ آپ کے جسم سے خارج ہوتی ہے لیکن روح کے ساتھ قوی ترین تعلق کی بنا پر آپ کا قلب مبارک کام کرتا رہتا ہے اور آپ ﷺ کو نیند کی حالت میں بہت سے امور کا شعور و ادراک بھی حاصل رہتا ہے۔

باب: 6

بعض بدعتیوں کا نبی ﷺ کی شان میں غلو

پہلا غلو۔ نبی ﷺ کے لئے جمیع ما کان و ما یکون کا علم ماننا

یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو اپنی ذات و صفات سے متعلق علم کے علاوہ ازل سے ابد تک یعنی روز اول سے جنت و دوزخ میں داخلہ تک عالم اور کائنات میں ہونے والی ہر ہر حرکت اور ہر ہر ارادے کا علم عطا فرمایا۔ آپ کو لوگوں کے دلوں کے ارادوں اور خواہشوں اور نیتوں پر اطلاع ہے۔ لوح محفوظ کے جمیع مندرجات کا آپ کو علم ہے حتی کہ مغیبات خمسہ کا بھی آپ کو علم حاصل ہے۔

مغیبات خمسہ سے مراد وہ پانچ غیب کی باتیں ہیں جن کا ذکر سورہ لقمان کی آخری آیت میں ہے۔ غیب کی وہ پانچ باتیں یہ ہیں: (1) قیامت کب ہوگی۔ (2) بارش کب ہوگی۔ (3) رحم میں کیا ہے۔ (4) آدمی کل کیا کرے گا۔ (5) آدمی کس جگہ مرے گا۔

بدعتیوں کی پہلی دلیل

چونکہ آپ ﷺ تمام مخلوقات سے افضل ہیں لہٰذ ضروری ہے کہ آپ سب کے علوم پر حاوی ہوں۔ اصول ہوں تو اصول سے اور تفصیلات ہوں تو تفصیلات سے واقف ہوں۔

جواب: یہ دلیل باطل ہے کیونکہ ہر مسلمان کو شیطان پر فضل و شرف حاصل ہے لہٰذا مذکورہ دلیل کی رو سے ضروری ہوگا کہ ہر مسلمان شیطان کے تمام علوم پر حاوی ہو۔ حالانکہ یہ بات بالبداہت باطل ہے۔

اس طرح قرآن پاک میں ہے ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا۔

(اَحَطۡتُّ بِمَا لَمۡ تُحِطۡ بِهٖ وَجِئۡتُكَ مِنۡ سَبَاءٍ بنبأٍ يَقِيۡنٍ (سوره نمل:22)

”میں ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں ہوئی اور میں آپ کے پاس قبیلہ سبا کی ایک تحقیقی خبر لایا ہوں۔“

چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو بلا شبہ ہد ہد پر فضیلت حاصل تھی لہٰذا مذکورہ دلیل سے لازم آئے گا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس قصہ کا پہلے سے علم ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ قرآن پاک میں ہد ہد کا قول **اَحَطتُّ بِمَا لَم تُحِط بِہٖ** (میں نے ایسی بات معلوم کی جو آپ کو معلوم نہیں ہوئی) بلانکیر نقل ہوا ہے۔

دوسری دلیل

قرآن پاک میں ہے:

وَنَزَّلنَا عَلَیکَ الکِتٰبَ تِبیَاناً لِّکُلِّ شَیءٍ (سورہ نمل :89)

''آپ پر قرآن کو ہر چیز کا بیان بنا کر نازل کیا۔''

جواب: 1- علامہ سیوطی رحمہ اللہ اپنی کتاب الاتقان میں لکھتے ہیں۔ کہ ''علماء نے کہا ہے کہ جو شخص قرآن کی تفسیر کا ارادہ کرے تو اولاً اسے قرآن ہی سے طلب کرے کیونکہ قرآن میں جو بات ایک جگہ مجملا بیان ہوتی ہے کبھی دوسری جگہ اس کی تفسیر کر دی جاتی ہے اور جو بات ایک جگہ مختصراً بیان ہوتی ہے بسا اوقات دوسری جگہ وہ تفصیل سے ذکر کر دی جاتی ہے...... اور اگر وہ قرآن میں نہ پائے تو سنت سے طلب کرے کیونکہ سنت قرآن کی شرح اور اس کی وضاحت ہے۔ اس ضابطہ کے مطابق اس آیت کی تفسیر میں جب دوسری آیتوں کو دیکھیں تو یہ آیتیں ملتی ہیں۔

1۔ یَسئَلُونَکَ عَنِ السَّاعَۃِ اَیَّانَ مُرسٰھَا قُل اِنَّمَا عِلمُھَا عِندَ رَبِّی لَا یُجَلِّیھَا لِوَقتِھَا اِلَّا ھُوَ (سورہ اعراف:187)

ترجمہ: ''اے پیغمبر یہ لوگ آپ سے قیام قیامت کب ہونے کا پوچھتے ہیں۔ آپ کہئے کہ اس کی خبر تو میرے رب ہی کے پاس ہے وہی ظاہر کرے گا اس کو اس کے وقت پر۔'')

2۔ قُل اِن اَدرِی اَقَرِیبٌ مَّا تُوعَدُونَ اَم یَجعَلُ لَہٗ رَبِّی اَمَدًا (سورہ جن :25)

ترجمہ: آپ کہئے میں نہیں جانتا کہ نزدیک ہے جس چیز (یعنی قیامت) کا تم سے وعدہ ہوا ہے یا کر دے اس کو میرا رب ایک مدت کے بعد۔''

3۔ وَعِندَہٗ مَفَاتِحُ الغَیبِ لَا یَعلَمُھَا اِلَّا ھُوَ (سورہ انعام:59)

ترجمہ: ''اور اسی کے پاس کنجیاں ہیں غیب کی کہ ان کو کوئی نہیں جانتا اس کے سوا۔''

4۔ اِنَّ اللّٰہَ عِندَہٗ عِلمُ السَّاعَۃِ (سورہ لقمان:34)

”اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم“۔

5- حدیث صحیح میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مفاتیح الغیب خمس لا یعلمهن الا الله یعنی غیب کی کنجیاں پانچ ہیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّ اللّٰـهَ عِـنْـدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ۔

ان آیات و احادیث سے معلوم ہوا کہ ارشاد الٰہی تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ کے عموم سے یہ امور مستثنیٰ ہیں۔

غرض یہ بات واضح ہوئی کہ قرآن میں ہر ہر بات کا ذکر نہیں ہے اور مغیبات خمسہ (یعنی قیامت کب آئے گی، آدمی کل کیا کسب کرے گا، بارش کب ہوگی، آدمی کی موت کہاں ہوگی اور رحم میں کیا ہے) کا علم بھی نہ قرآن میں ہے اور نہ ہی نبی ﷺ کو دیا گیا ہے۔

جب حقیقت یہ ہے تو قرآن کے تِبْیَانًا لِکُلِّ شَیْءٍ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ایسی کتاب ہے جس میں تمام علوم ہدایت اور اصول دین اور فلاح دارین سے متعلق ضروری امور کا نہایت مکمل اور واضح بیان ہے۔

اور ابن جریر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

اللہ فرماتے ہیں اے محمد ﷺ آپ پر یہ قرآن اتارا گیا ہے اس حال میں کہ یہ حلال وحرام اور ثواب وعقاب ایسے تمام امور کو بیان کرنے والا ہے جن کی لوگوں کو ضرورت ہے۔

دوسرا غلو۔ نبی ﷺ کو مختار کل ماننا

بعض بدعتی یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ اللہ عزوجل کے نائب مطلق ہیں۔ تمام جہان آپ کے تصرف میں دے دیا گیا ہے جو چاہیں کریں جسے جو چاہیں دیں اور جس سے جو چاہیں واپس لیں تمام جہانوں میں ان کے حکم کا پھیرنے والا کوئی نہیں۔ تمام زمین ان کی ملک ہے اور تمام جنت ان کی جاگیر ہے۔ ملکوت السموات والارض آپ کے زیر فرمان ہیں جنت وجہنم کی کنجیاں آپ کے ہاتھ میں دے دی گئی ہیں۔ غرض آپ ہر قسم کی حاجت روائی کر سکتے ہیں اور دنیا و آخرت کی سب مرادیں آپ کے اختیار میں ہیں۔

بدعتیوں کے اس عقیدے کے خلاف قرآن پاک کی یہ آیات صریح ہیں۔

1۔ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِی ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَاشَآءَ الله (سورہ یونس: 49)

”آپ فرما دیجئے کہ میں اپنی ذات خاص کے لئے تو کسی ضرر اور نفع کا اختیار رکھتا ہی نہیں مگر جتنا خدا کو منظور ہو۔“

2۔ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ (سورہ

انعام:50)

”آپ کہہ دیجئے کہ نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس خدا تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ ہی میں تمام غیب کو جانتا ہوں اور نہ ہی میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔“

تیسرا غلو: رسول اللہ ﷺ کو عالم الغیب کہنا

صحیح بات یہ ہے کہ نبی ﷺ کی ذات مقدسہ پر عالم الغیب کا اطلاق و استعمال ناجائز ہے جس کے دلائل یہ ہیں:

پہلی دلیل

عام طور پر شریعت کے محاورات میں عالم الغیب اسی کو کہا جاتا ہے جس کو غیب کی باتیں بلا واسطہ اور ذریعہ اور بغیر کسی کے بتلائے ہوئے معلوم ہوں اور یہ شان صرف حق تعالیٰ کی ہے لہٰذا اگر کسی دوسرے کو عالم الغیب کہا جائے تو اس عرف عام کی وجہ سے لوگوں کا ذہن اس طرف جائے گا کہ اس کو بھی بلا واسطہ غیب کا علم ہے حالانکہ یہ عقیدہ شرک کا ہے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو عالم الغیب کہنا بغیر کسی ایسے قرینہ کے جس سے معلوم ہو سکے کہ قائل کی مراد غیب بلا واسطہ نہیں ہے اس لئے غلط ہوگا کہ اس سے ایک مشرکانہ خیال کا شبہ ہوتا ہے۔ اور قرآن و حدیث میں ایسے کلمات سے منع فرمایا گیا ہے جن سے اس قسم کی غلط فہمیوں کا اندیشہ ہو مثلاً

1- قرآن پاک میں نبی ﷺ کو لفظ رَاعِنَا سے خطاب کرنے کی ممانعت ہے۔ بعض یہودیوں نے ایک شرارت ایجاد کی کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے حضور میں آ کر لفظ رَاعِنَا سے آپ کو خطاب کرتے جس کے معنی ان کی عبرانی زبان میں برے ہیں (یعنی احمق کے ہیں) اور وہ اس نیت سے کہتے تھے اور عربی میں اس کے معنی بہت اچھے ہیں کہ ہماری مصلحت کی رعایت فرمایئے اس لئے عربی دان اس شرارت کو نہ سمجھ سکتے اور اس اچھے معنی کے قصد سے بعض مسلمان بھی حضور ﷺ کو اس کلمہ سے خطاب کرنے لگے اس سے ان شریروں کو اور گنجائش ملی۔ حق تعالیٰ نے اس گنجائش کے قطع کرنے کے لئے مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ تم لفظ ”رَاعِنَا“ مت کہا کرو بلکہ اس کی جگہ اُنْظُرْنَا کہہ دیا کرو جس سے تمہارا مطلب بھی حاصل ہو سکتا ہے۔

2- حدیث میں اپنے غلاموں اور باندیوں کو عبدی (میرا غلام) اور امتی (میری باندی) کہنے سے ممانعت اسی لئے آئی ہے کہ یہ کلمات چونکہ بندے اور بندی کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں لہٰذا سننے والوں کو وہم ہوسکتا ہے کہ یہ کہنے والا ان کو اپنا بندہ اور بندی کہہ رہا ہے اگرچہ خود کہنے والے کا ایسا قصد نہ ہو۔

دوسری دلیل

اگر آپ ﷺ پر عالم الغیب کا اطلاق کیا جاتا تو یا تو اس وجہ سے کہ آپ کو بعض غیب کا علم ہے یا اس وجہ سے کہ آپ کو کل غیب کا علم ہے۔

یہ دوسری شق تو اس لئے باطل ہے کہ آنحضرت ﷺ کو بعض غیب کی باتوں کا علم نہ ہونا عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت ہے مثلاً قرآن پاک میں ہے۔

1۔ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَا سْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ (سورہ اعراف:188)

''اور اگر میں جان لیا کرتا غیب کی بات تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا۔''

ب۔ اسی طرح یہ علم کہ قیامت کب ہوگی؟ اس کی آپ ﷺ سے نفی قرآن وحدیث میں مذکور ہے۔

ج۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بعض منافقین نے تہمت لگائی جو قصہ افک کے نام سے مشہور ہے آپ کی فکر اور پریشانی اور تحقیق وتفتیش کے باوجود انکشاف نہیں ہوا۔ ایک ماہ بعد جب وحی نازل ہوئی اور سورہ نور کی آیتیں اتریں تو آپ ﷺ کو صحیح صورت حال سے باخبر کیا گیا اور تب آپ ﷺ کو اطمینان ہوا۔

اور پہلی شق (یعنی بعض غیب کے علم کی وجہ سے نبی ﷺ کو عالم الغیب کہنا) اس لئے باطل ہے کہ اس صورت میں لازم آئے گا کہ ہر انسان کو عالم الغیب کہا جائے کیونکہ غیب کی بعض باتوں کا علم تو سب کو ہے (مثلاً جنت دوزخ کا علم اور فرشتوں کا علم) اور چونکہ سب کو عالم الغیب کہنا ہر اعتبار سے (یعنی عقلاً، نقلاً اور عرفاً) باطل ہے لہٰذا مذکورہ وجہ کی بنیاد پر نبی ﷺ پر عالم الغیب کا اطلاق بھی جائز نہیں ہوگا۔

باب: 7

فرشتوں کا بیان

قرآن واحادیث بلکہ کتب سابقہ بھی فرشتوں کے ذکر سے پر ہیں۔ فرشتے نورانی مخلوق ہیں اللہ تعالیٰ کے مکرم بندے ہیں۔ نور سے پیدا کئے گئے ہیں اور لطیف جسم والے ہیں جس شکل میں چاہیں ظاہر ہو سکتے ہیں کیونکہ بدن ان کے حق میں لباس کا حکم رکھتا ہے۔

نہ وہ مرد ہیں نہ عورت یعنی وہ مرد وعورت کی جنس سے ماوراء ہیں۔

کھانے پینے اور پہننے اور زن ومرد اور توالد وتناسل سے پاک ہیں بلکہ صفات بشریہ جیسے بغض اور حسد اور غضب اور تکبر اور حرص وظلم سب سے بری ہیں۔

وہ حق تعالیٰ کی نافرمانی سے پاک ہیں۔ جس چیز کا ان کو حکم ہوتا ہے اس کو بجالاتے ہیں۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (سورہ تحریم:6)

”وہ اللہ کی کسی امر میں نافرمانی نہیں کرتے اور جس چیز کا ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو کرتے ہیں۔“

لہٰذا سب فرشتے کبیرہ صغیرہ گناہ سے پاک ہیں۔

ہروقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور تسبیح وتہلیل میں مشغول رہتے ہیں کسی وقت بھی عبادت میں سستی نہیں کرتے۔

يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْأَمُوْنَ (سورہ فصلت:38)

”دن رات اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور تھکتے نہیں۔“

اللہ تعالیٰ نے ان سے سفارت کا کام لیا ہے۔ پیغمبروں پر حق تعالیٰ کی کتابیں اور صحیفے انہی کے ذریعے نازل ہوتے رہے۔ یہ ان کو نہایت امانت اور حفاظت سے پہنچانے والے ہیں اور خطا اور غلطی سے مامون اور محفوظ ہیں۔ فرشتوں نے جو کچھ حق تعالیٰ کی طرف سے پہنچایا ہے وہ سب حق اور صدق اور صواب ہے اس

میں ذرہ برابر کسی غلطی کا احتمال اور اشتباہ نہیں۔ قرآن پاک میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی یہ صفات بیان ہوئیں۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ۔

”وہ پیغام لے جانے والے ہیں، عزت والے ہیں، قوت والے ہیں۔ عرش والے کے پاس درجہ پانے والے ہیں۔ سب کے مانے ہوئے ہیں اور امانت دار ہیں“۔

فرشتے بہت ہیں ان کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اس کثرت سے ہیں کہ آسمان و زمین کی کوئی جگہ ان سے خالی نہیں ہے۔

ملائکہ (فرشتوں) کی اقسام

آسمان اور زمین بلکہ تمام اجزاء عالم پر فرشتے مقرر ہیں۔ بحکم خداوندی اس کے مدبر اور نگہبان ہیں۔ ان میں سے بعض حاملین عرش ہیں اور بعض عرش کے گرد صف بستہ کھڑے ہیں اور بعض عرش کے طواف میں مشغول ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ **(سورہ غافر:7)**

”جو فرشتے عرش کو اٹھاتے ہیں اور جو اس کے گرد ہیں اللہ کی حمد کے ساتھ پاکی بیان کرتے ہیں۔“

بعض جنت کے خازن ہیں:

حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ **(سورہ زمر:73)**

”یہاں تک کہ جب پہنچ جائیں جنت پر اور کھولے جائیں اس کے دروازے اور کہنے لگیں ان کو اس کے داروغہ سلام پہنچے تم پر تم لوگ پاکیزہ ہو سو داخل ہو جاؤ اس میں سدا رہنے کو۔“

بعض دوزخ کے خازن ہیں:

حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ **(سورہ زمر:71)**

”یہاں تک کہ جب پہنچ جائیں گے جہنم پر کھولے جائیں گے اس کے دروازے اور کہیں گے ان کو اس کے داروغہ کیا نہ آئے تھے تمہارے پاس رسول۔“

بعض قبض ارواح پر مقرر ہیں۔

قُلۡ يَتَوَفّٰکُمۡ مَلَكُ الۡمَوۡتِ الَّذِیۡ وُکِّلَ بِکُمۡ (سورہ سجدہ: 11)

’’آپ کہہ دیجئے قبض کر لیتا ہے تم کو موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔‘‘

بعض آدمیوں کو شیطان اور موذی چیزوں سے بچانے کے لئے مقرر ہیں۔

يَحۡفَظُوۡنَهٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ (سورہ رعد: 11)

’’یعنی انسان کی امر الٰہی سے (ان بلاؤں سے) حفاظت کرتے ہیں (جن سے اللہ تعالیٰ بندہ کو بچانا چاہتے ہیں)۔‘‘

بعض فرشتے اعمال لکھنے پر مقرر ہیں:

وَاِنَّ عَلَيۡكُمۡ لَحٰفِظِيۡنَ كِرَامًا كَاتِبِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ (سورہ مطففین: 11-10)

’’یعنی تم پر بزرگ محافظ چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ تمہارے اعمال لکھتے ہیں اور جو جو تم کرتے ہو اس کو وہ جانتے ہیں۔‘‘

بعض قبر میں مردہ سے سوال کرنے پر مقرر ہیں۔ ان کو منکر نکیر کہتے ہیں۔

بعض کو اللہ نے ہوا سے متعلق کر رکھا ہے اور بعض کو ابر سے اور بعض روزی پہنچانے پر مقرر ہیں۔

غرض یہ کہ دنیا اور آخرت کے مختلف کاموں پر فرشتے مقرر ہیں اور مختلف کام ان کو تقسیم کر دیئے گئے ہیں۔ فرشتوں پر ایمان لانا ضروریات دین میں سے ہے اور ان کا انکار بلاشبہ کفر ہے۔

سب سے زیادہ مقرب چار فرشتے

1- حضرت جبرئیل علیہ السلام۔ یہ انبیاء پر وحی لایا کرتے تھے اور وحی کا لانا اصلاً ان کے سپرد تھا۔

2- حضرت میکائیل علیہ السلام جو اصلاً اللہ تعالیٰ کے حکم سے مخلوق کی روزی پہنچانے پر مقرر ہیں۔

3- حضرت اسرافیل علیہ السلام جن کے سپرد قیامت کے دن صور پھونکنا ہے۔

4- حضرت عزرائیل علیہ السلام جو انسانوں کی روح قبض کرنے پر مقرر ہیں۔

جمہور علماء کے نزدیک حضرت جبرئیل امین سب سے افضل ہیں اور بعض احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

تنبیہ: فرشتوں سے محض غیر جاندار قدرتی قوتیں (Natural Forces) مراد لینا صحیح نہیں کیونکہ قرآن پاک میں ملائکہ (فرشتوں) کے جو احوال ذکر ہیں ان سے ان کے جاندار مخلوق ہونے کا ہی علم ہوتا ہے

مثلاً

1- حضرت زکریا علیہ السلام نے اولاد کی دعا مانگی

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُّصَلِّيْ فِى الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنُ اللّٰهِ (سورہ آل عمران: 39)

’’تو ان کو آواز دی فرشتوں نے جب وہ محراب کے اندر کھڑے نماز پڑھ رہے تھے کہ اللہ تم کو خوشخبری دیتا ہے یحییٰ کی جو تصدیق کرنے والا ہے اللہ کے ایک کلمہ (یعنی حضرت عیسیٰ السلام) کی۔‘‘

2- اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ جٰعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا اُولِىْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (سورہ فاطر: 1)

’’تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پیدا کرنے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا جو بنانے والا ہے فرشتوں کو پیغام پہنچانے والے جو پروں والے ہیں دو دو تین تین اور چار چار‘‘۔

3۔ هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ۔ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلَامٍ عَلِيْمٍ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِىْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ۔ قَالُوْا كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ۔ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ۔ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ (سورہ ذاریات: 34-24)

’’کیا ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت آپ تک پہنچی ہے جبکہ وہ ان کے پاس آئے پھر ان کو سلام کیا ابراہیم نے بھی کہا سلام۔ انجان لوگ ہیں۔ پھر اپنے گھر کی طرف چلے اور (بھونا ہوا) ایک فربہ بچھڑا لائے اور اس کو ان کے پاس لا کر رکھا۔ (ان کے نہ کھانے پر) کہنے لگے آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں تو ان سے دل میں خوفزدہ ہوئے۔ انہوں نے کہا تم ڈرو مت اور ان کو ایک فرزند کی بشارت دی جو بڑا عالم ہوگا۔ اتنے میں ان کی اہلیہ بولتی پکارتی آئیں پھر ماتھے پر ہاتھ مارا اور کہنے لگیں کہ بڑھیا بانجھ (کیا بچہ جنے گی؟) فرشتے کہنے لگے کہ تمہارے پروردگار نے ایسا ہی فرمایا ہے کچھ شک نہیں کہ وہ بڑا حکمت والا جاننے والا ہے۔ ابراہیم کہنے لگے اچھا تم کو بڑی مہم کیا درپیش ہے اے بھیجے ہوؤ۔ فرشتوں نے کہا ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ ہم ان پر کھنگر کے پتھر برسائیں جن پر آپ کے رب کے پاس سے خاص نشان بھی ہے حد سے گزرنے والوں کے لئے۔‘‘

باب:8

کتب الٰہیہ کا بیان

حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں پر جو کتابیں اور صحیفے نازل کئے وہ سب حق ہیں اور ان پر ایمان لانا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کتابیں اور صحیفے انبیاء و مرسلین پر نازل فرمائے ان کی تعداد بعض روایتوں کے مطابق ایک سو چار ہے۔ ان میں سے چھوٹے چھوٹے پچاس صحیفے حضرت شیث علیہ السلام پر اور تیس حضرت ادریس علیہ السلام پر اور دس حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اور دس حضرت آدم علیہ السلام پر اترے۔ اور بڑی اور مشہور کتابیں توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور قرآن کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوئیں۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اور گزشتہ تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے لئے ناسخ ہے۔ دیگر کتابیں اور صحیفے صرف مضمون کے اعتبار سے معجز تھے جب کہ قرآن پاک نظم (لفظ) اور معنی دونوں کے اعتبار سے معجز ہے۔

تنبیہ: 1- قرآن پاک کے علاوہ جو کتابیں اس وقت یہود و نصاری کے ہاتھ میں ہیں ہم پر ان کی تصدیق لازم نہیں ہم فقط اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ جو توریت اور انجیل اور زبور اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں پر نازل فرمائی تھی وہ برحق تھی اور اس زمانہ کے لوگوں پر اس پر ایمان لانا اور اس پر عمل کرنا فرض تھا۔ اسی طرح ہم بھی ان تمام کتابوں پر ایمان لاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں پر اتاریں لیکن موجودہ توریت و انجیل سب تحریف شدہ ہیں۔ قرآن و حدیث سے ان میں تحریف ہونا ثابت ہے۔ اس لئے اس میں وہی حصہ ماننے کے قابل ہے جس کی تصدیق ہم کو قرآن و حدیث سے ملتی ہے۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (سورہ نساء:46)

’’بعض یہود پھیرتے ہیں بات کو اس کے ٹھکانے سے (یعنی بدلتے ہیں اور تحریف کرتے ہیں)‘‘

وَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ یَکۡتُبُوۡنَ الۡکِتٰبَ بِاَیۡدِیۡهِمۡ ثُمَّ یَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ لِیَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا **(سورہ بقرہ:79)**

’’سوخرابی ہے ان کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے پھر کہہ دیتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ لیں اس پر تھوڑی سی قیمت۔‘‘

2- جو قرآن پاک ہمارے پاس موجود ہے اس میں کوئی تحریف نہیں ہوئی اور نہ ہی ممکن ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

i۔ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ (سورہ حجر:9)

’’بے شک ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔‘‘

ii- اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِالذِّکۡرِ لَمَّا جَآءَهُمۡ وَاِنَّهٗ لَکِتَابٌ عَزِیۡزٌ لَا یَاۡتِیۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡ بَیۡنِ یَدَیۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ تَنۡزِیۡلٌ مِنۡ حَکِیۡمٍ حَمِیۡدٍ (سورہ فصلت:42)

’’جن لوگوں نے انکار کیا ذکر کا جب وہ ان کے پاس آیا حالانکہ وہ تو غلبہ والی کتاب ہے جس میں جھوٹ نہ آگے سے داخل ہو اور نہ پیچھے سے۔ اتاری ہوئی ہے حکمت والے اور تعریف والے کی طرف سے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو جو یہ خصوصی وصف اور خصوصی حفاظت عطا فرمائی یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں ایک شوشہ کی بھی تحریف وتبدیلی ممکن نہیں ہوئی اور قرآن جیسے نازل ہوا تھا ویسا ہی آج بھی موجود ہے۔

قرآن پاک میں تحریف کئے جانے کو ماننا اور اس کا قول کرنا کفر ہے۔

باب: 9

جنات کا بیان

جنات بھی اللہ تعالیٰ کی ایک لطیف مخلوق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش سے بہت پہلے آگ

سے بنایا تھا۔ قرآن پاک میں ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَاءٍ مَسْنُوْنٍ۔ وَالْجآنَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُوْمِ (سورہ حجر:26)

''اور بنایا ہم نے انسان کو کھنکھناتے سنے ہوئے گارے سے اور جنوں کو بنایا ہم نے اس سے پہلے لو کی آگ سے۔''

جنوں کے لئے بھی جسم بمنزلہ لباس کے ہوتا ہے اور وہ مختلف جسم اختیار کر سکتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ یہ سانپ کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں۔

یہ کھانے پینے کے بھی محتاج ہوتے ہیں اور ان میں نر و مادہ بھی ہوتے ہیں اور ان میں توالد و تناسل بھی چلتا ہے۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری کے مکلّف ہیں۔ ابلیس جس نے حضرت آدم علیہ السلام کے آگے جھکنے کے حکم الٰہی سے سرتابی کی اور انسانوں کو بہکانے کے لئے مہلت حاصل کی جنات میں سے تھا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰ دَمَ فَسَجَدُوْآ اِلَّا اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (سورہ کھف:50)

''اور جب کہا ہم نے فرشتوں کو (ابلیس سمیت) سجدہ کرو آدم کو تو وہ سجدہ میں گر پڑے سوائے ابلیس کے وہ تھا جنوں میں سے سو نافرمانی کی اس نے اپنے رب کے حکم کی۔''

اور جب اللہ تعالیٰ نے پوچھا

مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ

''تجھ کو کس چیز نے روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جب میں نے تجھ کو حکم دیا تو اس نے جواب دیا''

اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (سورہ اعراف: 12)

''میں آدم سے بہتر ہوں آپ نے مجھے آگ سے بنایا ہے اور آپ نے اس کو گارے سے بنایا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس کی نافرمانی کا منشا تکبر تھا

اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ (سورہ بقرہ: 34)

''ابلیس نے اللہ کا حکم ماننے سے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔''

تکبر کی وجہ سے وہ کبھی توبہ پر آمادہ نہیں ہوا اور اس نے اللہ تعالیٰ سے مخلوق کو بہکانے کی قیامت تک کے

لئے مہلت مانگ لی۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت اس کو مہلت دے دی گئی لیکن اس کا انجام بتا دیا۔

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُ وْمًا مَدْحُوْرًا لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ (سورہ اعراف:18)

’’اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا تو نکل یہاں سے برے حال میں مردود ہو کر۔ جو کوئی انسانوں میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں ضرور بھر دوں گا دوزخ کو تم سب سے۔‘‘

انسانوں کی طرح جنات بھی مکلّف ہیں اور اخروی نجات کے لئے ہدایت کے محتاج ہیں۔ ان میں بھی مسلمان کافر اور فاسق سب طرح کے ہوتے ہیں اور ان کا انجام بھی انسانوں کی طرح ہو گا کہ مسلمان جن جنت میں جائیں گے اور کافر جن جہنم میں جائیں گے۔ یہ بھی انسانی نبیوں کی لائی ہوئی ہدایت کے پابند ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

وَاِذْ صَرَفْنَا اِلَيْكَ نَفَراً مِنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُنْذِرِيْنَ قَالُوْا يٰقَوْمَنَا اِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُسْتَقِيْمٍ يٰقَوْمَنَا اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْلَكُمْ مِنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْ كُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ وَمَنْ لَا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَاءُ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلَالٍ مُبِيْنٍ (سورہ احقاف: 32-29)

’’اور جبکہ ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف لے آئے جو قرآن سننے لگے تھے۔ غرض جب وہ لوگ قرآن کے پاس آ پہنچے تو کہنے لگے کہ خاموش رہو۔ پھر جب قرآن پڑھا جا چکا تو وہ لوگ اپنی قوم کے پاس خبر پہنچانے کے لئے گئے۔ کہنے لگے اے ہماری قوم ہم ایک کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد نازل کی گئی جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اے ہماری قوم تم اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا مانو اور اس پر ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے محفوظ رکھے گا۔ اور جو شخص اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا نہ مانے گا تو وہ زمین میں (خدا کو) ہرا نہیں سکتا اور خدا کے سوا اور کوئی اس کا حامی بھی نہ ہو گا۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو حکومت عطا کی اس کے بارے میں فرمایا۔

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَاءً حَيْثُ اَصَابَ وَالشَّيَاطِيْنَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَّغَوَّاصٍ وَّ اٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ (سورہ ص38-36)

> ”سو ہم نے ہوا کو ان کے تابع کر دیا کہ وہ ان کے حکم سے جہاں وہ چاہتے نرمی سے لے چلتی اور جنات کو بھی انکے تابع کر دیا یعنی معماروں کو بھی اور غوطہ خوروں کو بھی اور دوسرے جنات کو بھی جو (خدمت سے کوتاہی پر) زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے۔ “

جنات کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ قوت دی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے غوطہ خوری کر کے موتی نکالتے تھے اور بڑی بڑی تعمیرات کرتے تھے۔

یَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِيۡبَ وَتَمَاثِيۡلَ وَجِفَانٍ كَالۡجَوَابِ وَقُدُوۡرٍ رّٰسِيٰتٍ (سورہ سبا:11)

> ”جنات سلیمان (علیہ السلام) کے لئے وہ چیزیں بناتے جو سلیمان چاہتے بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیاں اور حوض کی طرح (بڑے بڑے) لگن وتسلے اور (بہت ہی بڑی بڑی) دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں۔ “

جب ملکہ سبا حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں آنے لگی تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے درباریوں سے پوچھا کہ ملکہ سبا کے آنے سے پہلے اس کا تخت کون لے کر آئے گا تو:

قَالَ عِفۡرِيۡتٌ مِّنَ الۡجِنِّ اَنَا اٰتِيۡكَ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ تَقُوۡمَ مِنۡ مَّقَامِكَ وَاِنِّىۡ عَلَيۡهِ لَقَوِىٌّ اَمِيۡنٌ (سورہ نمل:39)

> ”ایک قوی ہیکل جن نے عرض کیا کہ میں اس کو آپ کی خدمت میں حاضر کروں گا اس سے پہلے کہ آپ اپنے اجلاس سے اٹھیں۔ “

باب: 10

علامات قیامت

قرآن اور حدیث اور تمام انبیاء کرام کی شریعتوں سے اور تمام صحابہ وتابعین اور علماء سلف اور خلف کے اجماع سے یہ بات درجہ تواتر کو پہنچ چکی ہے کہ ایک دن تمام دنیا کی زندگی صوراسرافیل کے نفخہ اماتت سے تمام ہو جائے گی۔ حضرت اسرافیل کے صور پھونکتے ہی زمین اور آسمان اوران میں جو کچھ ہے وہ سب فنا ہو جائیں گے اور چالیس سال بعد حضرت اسرافیل دوبارہ صور پھونکیں گے جس کے سبب تمام مردے جی اٹھیں گے۔ پہلے صور پھونکنے کا نام نفخہ اماتت ہے اور دوسری بار صور پھونکنے کا نفخہ احیاء ہے اور ایک مرتبہ تمام عالم کے فنا ہو جانے اور اس کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر کھڑے ہو جانے کا نام قیامت ہے۔ اس دوبارہ زندہ کرنے کا مقصد یہ ہوگا کہ جو لوگ دنیا میں انبیاء کرام کی ہدایتوں پر چلے ان کو جزا اور انعام ملے اور جو لوگ انبیاء کرام کی ہدایتوں سے منحرف رہے ان کو اس اعراض اور انحراف کی سزا دی جائے اور مظلوم کا ظالم سے انتقام لیا جائے۔

قرآن اور حدیث اس آنے والے حادثہ یعنی قیامت کی خبر سے بھرا پڑا ہے اس پر ایمان لانا فرض اور لازم ہے۔ حق جل شانہ نے قیامت کے قائم ہونے کا وقت کسی کو نہیں بتلایا کہ قیامت کس تاریخ میں آئے گی البتہ انبیاء کرام کو اس آنے والے واقعہ کی علامتوں سے بذریعہ وحی کے آگاہ فرمایا ہے۔ حضرت رسول اکرم ﷺ نے بطور پیشن گوئی قیامت سے پہلے پیش آنے والے بہت سے واقعات اور فتنوں کی خبر دی ہے اور امت کو قیامت کی علامتوں سے خوب آگاہ کر دیا ہے۔

فَهَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنۡ تَاۡتِیَهُمۡ بَغۡتَةً فَقَدۡ جَآءَ اَشۡرَاطُهَا (سورہ محمد: 18)

”اب یہی انتظار کرتے ہیں قیامت کا کہ آ کھڑی ہو ان پر اچانک سو آ چکی ہیں اس کی (کچھ) نشانیاں“۔

قیامت کی علامات دو قسم کی ہیں ایک صغریٰ اور دوسری کبریٰ۔

علامات صغریٰ وہ کہلاتی ہیں جو حضور ﷺ کی پیدائش سے لے امام مہدی کے ظاہر ہونے سے پہلے ظہور میں آئیں گی۔

2- علامات کبریٰ

اور علامات کبریٰ وہ کہلاتی ہیں کہ جو امام مہدی کے ظہور کے وقت سے نفخ صور تک ظہور میں آئیں گی۔

قیامت کی علامات صغریٰ کا بیان

قیامت کی علامات صغریٰ میں سب سے پہلی علامت خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت اور وفات ہے اسی وجہ سے کتب سابقہ میں حضور کا لقب نبی الساعۃ تھا یعنی قیامت کا نبی کہ جو آخری نبی ہوگا اور قیامت اس کی امت پر قائم ہوگی۔

مزید یہ ہیں

1- علم کا اٹھ جانا اور جہل کا زیادہ ہونا

2- زنا کاری اور شراب خوری کی کثرت

3- مزامیر اور معازف یعنی گانے بجانے کے سامان اور گانے والی عورتوں کا علانیہ طور پر ہو جانا۔

4- جھوٹ کا عام طور پر پھیل جانا۔

5- ماں کی نافرمانی اور بیوی کی اطاعت

6- دوستوں کو قریب بٹھلانا اور باپ کو دور کرنا۔ یاروں سے رغبت اور باپ سے نفرت۔

7- حکام کا ملک کے محاصل کو اپنی ذاتی دولت سمجھنا۔

8- امانت کو لوٹ کا مال سمجھ کر دبا لینا۔

9- احمقوں اور نالائقوں کا امیر اور حاکم ہونا۔

10- رذیلوں اور فاسقوں کا اپنے اپنے قبیلہ کا سردار ہونا۔

11- حیا اور شرم کا اٹھ جانا۔

12- ظلم اور ستم کا رواج ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔

ان کے علاوہ اور بھی قیامت کی بہت سی علامتیں ہیں جو احادیث صحیحہ میں آئی ہیں۔ وہ سب حق اور

درست ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر ظاہر ہو چکی ہیں اور وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔

قیامت کی علامات کبریٰ کا بیان

وہ نشانیاں جن کی نسبت آنحضرت ﷺ نے خبر دی ہے کہ وہ قیامت کے قریب ظاہر ہوں گی جیسے امام مہدی کا ظہور اور دجال کا خروج اور حضرت عیسیٰ بن مریم کا آسمان سے نزول اور یاجوج ماجوج اور دابتہ الارض کا خروج وغیرہ

1- ظہور مہدی

قیامت کی علامات کبریٰ میں پہلی علامت امام مہدی کا ظہور ہے۔

مہدی لغت میں ہر ہدایت یافتہ کو کہتے ہیں۔ لغوی معنی کے لحاظ سے ہر اس عالم کو جس کا علم صحیح ہو اس کو مہدی کہا جا سکتا ہے بلکہ ہر سچے اور پکے مسلمان کو مہدی کہا جا سکتا ہے لیکن جس مہدی موعود کا ذکر احادیث میں آیا ہے اور آنحضرت ﷺ نے اخیر زمانہ میں اس کے ظہور کی خبر دی ہے اس سے ایک خاص شخص مراد ہے جو سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اولاد سے ہوگا۔ ان کا نام محمد اور ان کے باپ کا نام عبداللہ ہوگا۔ سیرت میں رسول اللہ ﷺ کے مشابہ ہوں گے۔ مدینہ کے رہنے والے ہوں گے۔ مکہ میں ظہور ہوگا۔ شام اور عراق کے اولیاء اور ابدال ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے اور جو خزانہ خانہ کعبہ میں مدفون ہے وہ نکال کر مسلمانوں پر تقسیم فرمائیں گے۔ اولاً عرب اور پھر تمام روئے زمین کے بادشاہ ہوں گے۔ دنیا کو عدل اور انصاف سے بھر دیں گے جیسا کہ اس سے پیشتر ظلم و ستم سے بھری ہوگی۔ شریعت محمدیہ کے مطابق انکا عمل ہوگا۔ امام مہدی کے زمانہ میں دجال نکلے گا۔ اور انہی کے زمانہ بادشاہت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے دمشق کے شرقی منارہ پر عصر کی نماز کے قریب نازل ہوں گے اور امام مہدی کے پیچھے نماز ادا فرمائیں گے امام مہدی نصاریٰ سے جہاد کریں گے اور قسطنطنیہ کو فتح کریں گے۔

فائدہ: اہل سنت والجماعت کے عقائد میں سے ہے کہ امام مہدی کا اخیر زمانہ میں ظہور حق اور صدق ہے۔ اس لئے کہ امام مہدی کا ظہور احادیث متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے اگرچہ اس کی بعض تفصیلات اخبار آحاد سے ثابت ہوں۔ عہد صحابہ و تابعین سے لے کر اس وقت تک امام مہدی کے ظہور کو مشرق و مغرب میں ہر طبقہ کے مسلمان علماء اور صلحاء عوام اور خواص ہر زمانہ میں نقل کرتے چلے آئے ہیں۔

2- خروج دجال

قیامت کی علامات کبریٰ میں سے دوسری علامت خروج دجال ہے جو احادیث متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

دجال دجل سے مشتق ہے جس کے معنی لغت میں بڑے جھوٹ اور مکر اور فریب اور حق اور باطل کو خلط ملط کرنے کے ہیں۔ لغوی معنی کے لحاظ سے ہر جھوٹے اور مکار کو دجال کہہ سکتے ہیں لیکن حدیث شریف میں جس دجال موعود کے خروج کی خبر دی گئی ہے وہ ایک خاص کافر شخص کا نام ہے جو قوم یہود سے ہوگا اور مسیح اس کا لقب ہوگا اس لقب کی وجہ یہ ہے کہ وہ کانا ہوگا اور مسیح کا مطلب ہوا جس کی آنکھ ہاتھ پھیر کر ہموار کر دی گئی ہو۔ ایک آنکھ میں انگور کے دانہ کے برابر ناخونہ ہوگا۔ دونوں آنکھوں کے درمیان ک ف ر لکھا ہوا ہوگا۔ سب سے پہلے اس کا ظہور شام اور عراق کے درمیان ہوگا اور نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ پھر اصفہان آئے گا وہاں ستر ہزار یہودی اس کے تابع ہو جائیں گے۔ بعدازاں وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا اور زمین میں فساد پھیلاتا پھرے گا۔ حق تعالیٰ بندوں کے امتحان کے لئے اس کے ہاتھ سے قسم قسم کے کرشمے اور شعبدے ظاہر فرمائیں گے۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا...... دجال چالیس دن تک زمین میں رہے گا لیکن پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا، پھر دوسرا ایک ماہ کے برابر ہوگا اور تیسرا ایک ہفتے کے برابر ہوگا۔ اس کے بعد باقی دن تمہارے عام دنوں کے برابر ہوں گے۔ صحابی نواس بن سمعان کہتے ہیں ہم نے پوچھا جو دن ایک سال کے برابر ہوگا کیا اس دن میں ہم کو ایک ہی دن کی نمازیں ادا کرنا ہوں گی۔ فرمایا نہیں بلکہ تمام دنوں کے برابر نمازوں کا اندازہ کر کے نمازیں ادا کرتے رہنا۔ (کیونکہ اس دن کی طوالت بھی دجال کی محض شعبدہ بازی ہوگی ورنہ سورج فی الواقع اپنے وقت پر طلوع وغروب ہوتا رہے گا)...... فرمایا وہ اس تیز رفتار بادل کی طرح پوری زمین میں گھومے گا جس کو نیچے سے ہوا اڑائے لا رہی ہو (ممکن ہے کہ اس کو آج کے دور کی تیز رفتار سواریوں کی طرح یا ان سے بھی زیادہ تیز رفتار سواریاں حاصل ہوں یا اس کے خرق عادت کا معاملہ ہو)۔ وہ کچھ لوگوں کے پاس آ کر اپنی خدائی پر ایمان لانے کی دعوت دے گا۔ وہ اس پر ایمان لے آئیں گے۔ وہ خوش ہو کر آسمان کو بارش برسانے کا حکم دے گا۔ فوراً بارش آجائے گی اور زمین کو حکم دے گا اسی وقت وہ سبزہ زار ہو جائے گی اور شام کو جب ان کے جانور چراگاہوں سے چر کر واپس ہوں گے تو ان کے اونٹوں کے کوہان پہلے سے زیادہ اونچے اونچے، ان کے تھن پہلے سے زیادہ دودھ سے بھرے ہوئے اور ان کی کوکھیں پہلے سے زیادہ تنی ہوئی ہوں گی۔ اس کے بعد وہ کچھ اور لوگوں کے پاس جائے گا اور ان کو بھی اپنی خدائی کی دعوت دے گا۔ مگر وہ اس کو نہ مانیں گے۔ جب وہ ان کے پاس سے واپس ہوگا تو یہ سب قحط میں مبتلا ہو جائیں گے اور ان کے قبضہ

میں کوئی مال نہ رہے گا۔ (سب دجال کے ساتھ چلا جائے گا) پھر وہ ایک ویران زمین سے گزرے گا اور اس کو حکم دے گا کہ وہ اپنے تمام خزانے اگل دے۔ وہ سب کے سب خزانے اس کے پیچھے اسی طرح ہولیں گے جیسے مکھیوں کی ملکہ کے پیچھے سب مکھیاں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ایک شخص کو بلائے گا جو اپنے پورے شباب پر ہو گا اور تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر کے ان کو ایک دوسرے سے اتنی دور پھینک دے گا جتنا تیر انداز اور اس کے نشانہ کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے۔ پھر اس کو آواز دے کر بلائے گا۔ وہ (زندہ ہو کر ہنستا کھلھلا تا ہوا چلا آئے گا اور کہے گا کہ یہ (دجال) خدا کیسے ہوسکتا ہے۔ دجال غصے میں اس کو دوبارہ قتل کرنا چاہے گا لیکن قتل نہ کر سکے گا۔

غرض یہ شخص دعوائے خدائی میں بالکل جھوٹا ہوگا اس لئے کہ اول تو اس کا کانا ہونا ہی اس کے خدا نہ ہونے کی نہایت روشن اور بین دلیل ہے۔ دوم یہ کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ک ف ر لکھا ہوا ہوگا سوم یہ کہ قتل کرنا ایسا فعل ہے جو بشر کی قدرت میں داخل ہے۔ جب اس میں اب یہ قدرت باقی نہ رہی کہ وہ دوبارہ قتل کر سکے تو وہ خدا کیونکر ہوسکتا ہے اور یہ جو چند روز اس کے ہاتھ پر احیاء موتی کا ظہور ہوتا رہا وہ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کا فعل تھا جو اس کے ہاتھ سے محض استدراج اور ابتلاء اور امتحان کے طور پر کرایا گیا۔

خروج دجال کب ہوگا

امام مہدی ظاہر ہونے کے بعد نصاری سے جہاد و قتال کریں گے یہاں تک کہ جب قسطنطنیہ کو فتح فرما کر شام واپس ہوں گے اور شہر دمشق میں مقیم ہوں گے اور مسلمانوں کے انتظام میں مصروف ہوں گے۔ اس وقت دجال کا خروج ہوگا۔ دجال مع اپنے لشکر کے زمین میں فساد مچاتا پھرے گا۔ یمن سے ہو کر مکہ مکرمہ کا رخ کرے گا مگر مکہ مکرمہ پر فرشتوں کا پہرہ ہوگا اس لئے دجال مدینہ منورہ کا ارادہ کرے گا۔ مدینہ منورہ کے دروازوں پر بھی فرشتوں کا پہرہ ہوگا۔ اس لئے دجال مدینہ منورہ میں بھی داخل نہ ہو سکے گا۔ بالآخر پھر پھرا کر شام واپس آئے گا کہ عیسیٰ علیہ السلام دمشق کی جامع مسجد کے شرقی منارہ پر دو فرشتوں کے بازوؤں پر ہاتھ رکھے ہوئے آسمان سے نازل ہوں گے اور اس لعین کو قتل فرمائیں گے جیسا کہ آئندہ علامات کے بیان میں آئے گا۔

3- نزول عیسیٰ ابن مریم علیہ الصلوۃ والسلام

قیامت کی علامات کبریٰ میں سے تیسری علامت قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نازل ہونا اور دجال لعین کو قتل کرنا ہے جو حق اور سچ ہے اور قرآن کریم اور احادیث متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے اس کی تصدیق کرنا اور اس پر ایمان لانا فرض اور ضروری ہے۔

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ ’’ایک طرف دجال شعبدہ بازیاں دکھارہا ہوگا دوسری طرف اللہ تعالیٰ عیسی بن مریم کو بھیجے گا۔ وہ دمشق (کی مسجد) کے مشرقی (یا دمشق کے مشرق میں بیت المقدس کے کسی سفید منارہ پر اتریں گے اور دو زعفرانی رنگ کی چادریں اوڑھے ہوئے دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے ہوئے ہوں گے۔ سر جھکائیں گے تو پانی کے قطرے ٹپکتے معلوم ہوں گے اور جب سر اٹھائیں گے تو بالوں میں چاندی کے سے موتی محسوس ہوں گے‘‘۔

صحیح مسلم کی ایک اور حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا .... عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام آسمان سے) اتریں گے تو مسلمانوں کا امیر (نماز کے وقت ان سے) درخواست کرے گا کہ آگے آئیے اور ہمیں نماز پڑھائیے عیسیٰ (علیہ السلام) فرمائیں گے کہ نہیں۔ تم ہی م سے کچھ دوسروں پر امیر ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے امت کا اکرام ہے۔ نماز سے فراغت کے بعد امام مہدی کی معیت میں دجال پر چڑھائی کریں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سانس میں یہ تاثیر ہوگی کہ کافر اس کی تاب نہ لا سکے گا۔ اس کے پہنچتے ہی مر جائے گا۔ اور دجال حضرت عیسیٰ کو دیکھتے ہی ایسا پگھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں پگھل جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کا تعاقب کریں گے اور باب لد پر جا کر اس کو اپنے نیزہ سے قتل کریں گے اور اس کا خون مسلمانوں کو دکھلائیں گے۔ بعد ازاں لشکر اسلام دجال کے لشکر کا مقابلہ کرے گا۔ جو یہودی ہوں گے ان کو خوب قتل کرے گا اور اس طرح زمین دجال اور یہود کے ناپاک وجود سے پاک ہو جائے گی۔ جن کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم نے اللہ کے رسول عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اب تک آسمان پر زندہ تھے اور اب آسمان سے ہمارے قتل کے لئے زمین پر اترے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں کے شر سے بچانے کے لئے کسی حکمت اور مصلحت کی بنا پر ایک معین مدت کے لئے آسمان پر اٹھا لیا تھا۔ مگر چونکہ عیسیٰ ابن مریم بنی آدم میں سے ہیں اور کوئی انسان حقیقی آسمان پر فوت نہیں ہو سکتا۔ فوت اور دفن کا محل زمین ہے۔ مِنۡهَا خَلَقۡنَاكُمۡ وَفِيهَا نُعِيدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً أُخۡرَىٰ (سورہ طٰہٰ :55)۔ ’’یعنی اسی زمین سے ہم نے تم کو بنایا اور اسی میں پھر تم کو لوٹا دیتے ہیں اور اسی سے تم کو نکالیں گے دوسری بار‘‘ اس لئے اللہ تعالیٰ آسمان پر رہنے کی مدت معینہ ختم ہونے کے بعد حضرت عیسیٰ کو زمین پر نازل فرمائیں گے تا کہ چند روز زمین پر رہنے کے بعد زمین پر وفات پائیں اور زمین ہی میں نبی اکرم ﷺ کے قریب دفن ہوں۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ دجال یہودیوں میں سے ہوگا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن اور ان کی جان

کے در پے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہود سے بچا لیا اور پھر ان ہی کے ہاتھوں وہ قتل ہوں گے تو اس میں یہود کی رسوائی اور ذلت اور زیادہ ہے۔

تیسری حکمت یہ ہے کہ دجال کفر کا بہت بڑا مظہر ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ڈھیل ملنے کی وجہ سے بڑے کرشمے دکھائے گا۔ اس کے مقابلے میں اسلام اور اتباع حق کے بڑے مظہر انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں۔ مقابلہ اصل میں وہ ہوتا ہے جو برابر کے درجے کی قوتوں کا ہو۔ اس کی وجہ سے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ رکھا گیا اور دجال کے مقابلہ کے لئے آپ کو آسمان سے اتارا جائے گا۔ کفر کا مظہر اعلیٰ دجال ان کی قوت کے مقابلہ میں ٹھہر ہی نہ سکے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ ہونے اور مصلوب نہ ہونے کے دلائل

پہلی دلیل

قرآن پاک میں ہے:

وَقَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَلٰكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ(سورہ نساء: 157)۔

”(یہود ملعون ہوئے بسبب) ان کے قول کے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو جو اللہ کے رسول تھے قتل کیا حالانکہ نہ انہوں نے ان کو قتل کیا اور نہ ہی ان کو صلیب پر لٹکایا لیکن ان کو اشتباہ ہو گیا۔“

آگے فرمایا:

وَمَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًا بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا (سورہ نساء 157)

”یہود نے یقینی طور پر ان (عیسیٰ علیہ السلام) کو قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ نے اپنی طرف (یعنی آسمان پر) اٹھالیا۔“

یہ بات مسلم ہے کہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جانی دشمن تھے اور انہوں نے آپ کو قتل کرنے کی سازش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی سازش کو ناکام بنا دیا اور وہ نہ ان کو قتل کر سکے اور نہ ہی ان کو صلیب پر لٹکا سکے۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ صلیب پر لٹکایا گیا ہو لیکن قتل نہ کر پائے ہوں کیونکہ صلیب پر ہی لٹکا کر قتل کیا جاتا تھا۔ جب قرآن نے قتل کی نفی کی تو معلوم ہوا کہ صلیب پر قتل نہیں کئے گئے اور جب صلیب کی نفی کی تو معلوم ہوا کہ

صلیب پر لٹکائے بھی نہیں گئے۔

دوسری دلیل

وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ (سورہ نساء :159)

''(اب قرب قیامت کے زمانہ میں) نہیں کوئی اہل کتاب مگر یہ کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام پر ان کی موت سے پہلے ایمان لائے گا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نزول کے بعد دجال اور اس کا لشکر جو سب یہودی ہوں گے قتل کر دیئے جائیں گے اور باقی یہودی یا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھ ایمان لے آئیں گے یا قتل کر دیئے جائیں گے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ''صحیح قول فقط یہی ہے کہ دونوں ضمیریں (یعنی بہ اور موتہ میں) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہیں۔''

اس قول کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اہل کتاب میں سے عیسائی) تو اپنی موت سے پہلے یعنی زندگی میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں پھر اس کو ذکر کرنے میں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ہاں اگر یہ مراد ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے تو اس ذکر میں بلاشبہ فائدہ ہے کہ ان کی وفات سے پیشتر جب ان کا آسمان سے نزول ہوگا تو اہل کتاب ان کو دیکھ کر ان کو مانیں گے اور ان کے بارے میں اپنے عقیدے کی تصحیح کریں گے۔

ان دو آیتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ قتل کیا گیا اور نہ ہی صلیب پر لٹکایا گیا بلکہ خود ارادہ بد رکھنے والوں کو اشتباہ میں ڈال دیا گیا اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی زندہ ہیں اور ایک وقت آئے گا کہ لوگوں کے سامنے آئیں گے اور اس وقت موجود اہل کتاب یعنی عیسائی اور کچھ یہودی ان کو سچا تسلیم کریں گے۔

اب رہا یہ سوال کہ پھر اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہاں ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے۔

اِذۡ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيۡسٰۤى اِنِّىۡ مُتَوَفِّيۡكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ (سورہ آل عمران:55)

''جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ بے شک میں آپ کو پورا لینے والا ہوں اور آپ کو اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔''

جب اوپر کے دلائل سے واضح ہوگیا کہ ابھی تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت نہیں ہوئی تو مُتَوَفِّیْكَ اس معنی میں تو نہیں ہوسکتا کہ میں آپ کو وفات یعنی موت دینے والا ہوں بلکہ عربی لغت کے اعتبار سے یہ مطلب بنے گا کہ میں آپ کو پورا لینے والا ہوں (یعنی جسم وروح سمیت)

علاوہ ازیں اگر مُتَوَفِّیْكَ کا مطلب وفات اور موت دینے کا لیا جائے تو پھر رَافِعُكَ اِلَیَّ کا کیا مطلب اور اسکے ذکر کی کیا ضرورت ہوئی؟ کیونکہ قدرتی موت ہو یا قتل ہو دونوں صورتوں میں نیک لوگوں اور خصوصاً انبیاء علیہم السلام کی ارواح کو بلند مقام ہی دیئے جاتے ہیں اور اگر بلند مرتبہ مراد ہو تو قتل وشہادت کی صورت میں تو درجہ زیادہ بلند ہوجاتا ہے پھر قدرتی موت کے ساتھ اس کے ذکر کا کیا فائدہ؟

غرض قرآن پاک نے خوب وضاحت کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے روح وجسم سمیت دنیا سے اوپر اٹھالیا یعنی آسمان پر اٹھالیا اور وہ ابھی تک زندہ ہیں اور قیامت سے پیشتر دنیا میں اتارے جائیں گے۔

ایک اعتراض اوراس کا جواب

وقیل الآیة محمولة علی ظاهرها فقد اخرج ابن جریر عن وهب انه قال توفی اللّٰه تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم ثلاث ساعات من النهار حتی رفعه الیه۔ و اخرج الحاکم عنه ان اللّٰه تعالیٰ توفی عیسیٰ سبع ساعات ثم احیاه...... و ورد ذلك فی روایة ضعیفة عن ابن عباس۔ والصحیح کما قاله القرطبی۔ ان اللّٰه تعالیٰ رفعه من غیر وفاة ولا نوم وهو اختیار الطبری والروایة الصحیحة عن ابن عباس۔ وحکایة ان اللّٰه تعالیٰ توفاه سبع ساعات وذکر ابن اسحاق انها من زعم النصاری۔ (روح المعانی ج 3 ص 237)

> ترجمہ: ’’یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت انی متوفیك و رافعك الی ظاہری معنی پر محمول ہے۔ ابن جریری طبری نے جوکہ بڑے مفسر ہیں وھب بن منبہ کی یہ بات نقل کی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دن کے تین گھنٹوں تک موت دیے رکھی پھر ان کو اپنی طرف اٹھالیا۔ حاکم نے بھی وھب بن منبہ سے نقل کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو سات گھنٹوں تک موت دیئے رکھی پھر ان کو دوبارہ زندہ کیا۔ موت والی بات ضعیف روایت سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی منقول ہے۔ صحیح قول وہ ہے جو قرطبی نے ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو موت اور نیند کے بغیر اوپر آسمان پر اٹھالیا۔ خود طبری نے بھی اس قول کو اختیار کیا اور حضرت

عبداللہ بن عباسؓ سے صحیح روایت بھی اسی کی ہے۔ یہ حکایت کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سات گھنٹوں تک موت دیے رکھی اس کے بارے میں ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ یہ عیسائیوں کا دعویٰ ہے۔‘‘

ہم کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے صحیح روایت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندہ آسمان پر اٹھانے کی ہے تو ان سے ضعیف روایت کو کالعدم سمجھیں گے کیونکہ نفس الامر میں واقعہ کی ایک ہی صورت ہوسکتی ہے دو نہیں۔ لہٰذا اب صرف وہب بن منبہ کی روایت رہ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پہلے موت دی پھر چند گھنٹے بعد ان کو زندہ کر دیا اور زندہ آسمان پر اٹھالیا۔ ایسی موت دینے میں کیا فائدہ تھا؟ کیا زندہ اٹھایا جانا محال تھا۔ حضرت محمد ﷺ معراج کے موقع پر زندہ بدن سمیت آسمان پر گئے تھے اور زندہ اٹھائے جانے میں ان کا اکرام تھا۔ غرض موت دینا اور چند گھنٹے بعد دوبارہ زندہ کرنا پھر زندہ آسمان پر جانا یہ عیسائیوں کی کہانی ہے جو وہب بن منبہ نے سچ سمجھ کر اختیار کر لی۔ اس کے بعد متوفیک کی تفسیر کا ایک قول ہی رہ گیا اور وہ یہ کہ میں آپ کو پورا ہی یعنی روح و بدن سمیت آسمانوں پر اٹھالوں گا۔

آسمان پر اٹھائے جانے اور قرب قیامت میں زمین پر نازل کئے جانے پر تو پوری امت محمدیہ کا اجماع ہے۔ تفسیر جامع البیان میں ہے۔

الا جماع علی انه حیی فی السماء وینزل ویقتل الدجال ویوید الدین

’’اس پر امت کا اجماع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں اور نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے اور دین کی مدد کریں گے۔‘‘

یہی مضمون قدرے تفصیل سے حدیث میں بھی وارد ہے۔

1- امام حسن بصری رحمہ اللہ سے مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود سے فرمایا عیسیٰ علیہ السلام ابھی نہیں مرے وہ قیامت کے قریب ضرور لوٹ کر آئیں گے۔

2- امام ابوداؤد اپنی سنن میں اور امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمام انبیاء باپ شریک بھائی ہیں مائیں مختلف ہیں یعنی شریعتیں مختلف ہیں جب کہ دین جو کہ اصول شریعت ہیں وہ سب کا ایک ہے۔ اور میں عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سب سے زیادہ قریب ہوں اس لئے کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ وہ نازل ہوں گے جب ان کو دیکھو تو پہچان لینا وہ میانہ قد ہوں گے۔ ان کا رنگ سرخ اور سفیدی کے درمیان ہوگا۔ ان پر دو

رنگے ہوئے کپڑے ہوں گے۔ سر کی یہ شان ہوگی کہ گویا پانی ٹپک رہا ہے اگر چہ اس کو کسی قسم کی تری نہیں ہوگی۔ صلیب کو توڑیں گے جزیہ کو ختم کر دیں گے۔ سب کو اسلام کی طرف بلائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے زمانہ میں سوائے اسلام کے تمام مذاہب کو نیست و نابود کر دے گا اور اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں مسیح دجال کو قتل کرائے گا۔ پھر تمام روئے زمین پر ایسا امن ہو جائے گا .... عیسیٰ علیہ السلام زمین پر چالیس یا پینتالیس سال ٹھہریں گے پھر وفات پائیں گے اور مسلمان ان کے جنازہ کی نماز پڑھیں گے۔

رہی یہ آیت: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (سورہ آل عمران: 144)

"اور نہیں محمد مگر رسول۔ یقیناً ان سے پہلے بھی رسول گزرے"۔

خَلَتْ کا ترجمہ ہے گزر گئے یعنی روئے زمین سے گزر گئے اور چلے گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی یہ معنی صادق آتا ہے کیونکہ آپ کو جب آسمان پر اٹھا لیا گیا تو آپ روئے زمین پر سے گزر گئے اور چلے گئے۔ اس کا یہ ترجمہ کرنا کہ وفات پا گئے بالکل غلط ہے۔ مندرجہ بالا دلائل سے بھی یہی بات حاصل ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے لَوْ کَانَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی حَیَّیْنَ (اگر موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام زندہ ہوتے ......)

حَیَّیْنَ تثنیہ ہے حَیٌّ کا جیسا کہ کتاب کا تثنیہ کتابین ہوتا ہے۔ پھر عربی زبان میں یہ بھی طریقہ مستعمل ہے کہ دو مختلف چیزوں کو لے کر ان پر ایک کے نام کے تثنیہ کا اطلاق کیا جاتا ہے مثلاً والد اور والدہ کو لے کر والدین کہا جاتا ہے حالانکہ والدین صرف والد کے لفظ کا تثنیہ ہے۔ اور مثلاً شمس (سورج) اور قمر (چاند) کو لے کر کبھی شمسین کہہ دیتے ہیں اور کبھی قمرین کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح حدیث میں ایک زندہ اور ایک وفات یافتہ کو لے کر تغلیباً کہا گیا ہے کہ اگر دونوں زندہ ہوتے لہٰذا اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات پر دلیل بنانا غلط ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد شریعت محمدیہ کا اتباع کریں گے

وجہ یہ ہے کہ جب شریعت محمدیہ آئی تو تمام جن اور انس پر قیامت تک اس کا اتباع واجب ہوا کیونکہ آپ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ کی شریعت تمام شریعتوں کی ناسخ ہے۔ اور تمام شریعتوں سے اکمل ہے۔ لہٰذا اس وقت عیسیٰ علیہ السلام کا تمام عمل اور حکم کتاب وسنت کے موافق ہوگا۔ انجیل پر نہ ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد بھی نبی ہوں گے کیونکہ انبیاء کرام اپنی نبوت سے کبھی معزول نہیں ہوتے لیکن یہ نزول نبی ہونے کی حیثیت سے نہ ہوگا بلکہ عادل حکمران اور شریعت محمدیہ کے مجدد اور تابع ہونے کی حیثیت سے ہوگا۔ اس کی مثال

ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ کسی دوسرے ملک میں جائے تو وہ اگرچہ اب بھی بادشاہ ہے لیکن اس وقت وہ دوسرے ملک کے قانون کا پابند ہوتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شریعت محمدیہ کا علم کیسے ہوگا؟

اس بارے میں قرآن وحدیث میں کوئی تصریح تو موجود نہیں ہے البتہ چند ممکنہ صورتیں ہیں اسی وجہ سے بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نزول سے قبل ہی آسمان پر شریعت محمدیہ کا علم عطا فرمادے گا یا کتاب وسنت کو دیکھ کر علم ہو جائے گا یا روحانی طور پر آنحضرت ﷺ سے علم حاصل ہو جائے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور امام مہدی دو شخص ہیں

ظہور مہدی اور نزول عیسیٰ بن مریم کے بارہ میں جو احادیث آئی ہیں ان سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور امام مہدی دو شخص علیحدہ علیحدہ ہیں صحابہ اور تابعین کے وقت سے لے کر اس وقت تک کوئی اس کا قائل نہیں ہوا کہ نازل ہونے والا مسیح اور ظاہر ہونے والا مہدی ایک ہی شخص ہوں گے اس لئے کہ

1- حضرت عیسیٰ بن مریم نبی اور رسول ہیں اور امام مہدی امت محمدیہ کے خلیفہ ہوں گے نبی نہ ہوں گے۔

2- حضرت مسیح بن مریم حضرت مریم کے بطن سے بغیر باپ نبی اکرم ﷺ سے چھ سو سال پہلے بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے اور امام مہدی قیامت کے قریب مدینہ منورہ میں پیدا ہوں گے ان کے والد کا نام عبداللہ ہوگا۔

3- حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل میں سے ہیں اور امام مہدی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی اولاد سے ہوں گے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

ایک روایت میں آیا ہے کہ **لا مھدی الا عیسی بن مریم** نہیں ہے کوئی مہدی مگر عیسیٰ بن مریم۔ اس روایت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہدی اور عیسیٰ دونوں ایک ہی شخص ہیں۔

جواب: یہ ہے کہ اول تو یہ روایت محدثین کے نزدیک ضعیف اور غیر مستند ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری ص 358 ج 6 میں اس کی تصریح کی ہے۔

دوم یہ کہ یہ روایت ان بے شمار احادیث صحیحہ اور متواترہ کے خلاف ہے جن سے حضرت عیسیٰ اور امام

مہدی کا دو شخص ہونا خوب ظاہر ہے اور متواتر کے مقابلہ میں ضعیف اور منکر روایت معتبر نہیں۔

4- خروج یاجوج وماجوج

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور دجال کی ہلاکت کے کچھ عرصہ بعد امام مہدی انتقال فرما جائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کی نماز جنازہ پڑھائیں گے۔ بیت المقدس میں ان کا انتقال ہوگا اور وہیں مدفون ہوں گے اس وقت امام مہدی کی عمر پینتالیس یا اڑتالیس یا انچاس (49) سال ہوگی۔ امام مہدی کی وفات کے بعد تمام انتظام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں ہوگا اور زمانہ نہایت سکون اور راحت سے گزر رہا ہوگا کہ یکایک وحی نازل ہوگی کہ ''اے عیسیٰ تم میرے بندوں کو کوہ طور کے پاس لے جاؤ۔ میں اب ایک ایسی قوم کو نکالنے والا ہوں کہ جس کے ساتھ کسی کو لڑائی کی طاقت نہیں۔ وہ قوم یاجوج وماجوج کی قوم ہے جو یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے۔

یاجوج وماجوج کون ہیں؟

قصص القرآن میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ ان کے بارے میں طویل تحقیق کے بعد لکھتے ہیں:

''یاجوج وماجوج (Gog and Magog) کے متعلق جس قدر بحث اس وقت تک کی جا چکی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کوئی عجیب الخلقت مخلوق نہیں بلکہ دنیائے انسانی کی عام آبادی کی طرح وہ بھی حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور یہ کہ یاجوج وماجوج منگولیا (تاتار) کے ان وحشی قبائل کو کہا جاتا رہا ہے جو یورپ اور روس کی اقوام کے منبع ومنشا ہیں۔

گزشتہ بحث میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ منگولیا یا کاکیشیا (Caucasia) کے یہ قبائل جب تک اپنے مرکز میں رہتے ہیں یاجوج وماجوج کہلاتے ہیں اور جب وہاں سے نکل کر کہیں بس جاتے ہیں اور تمدن اختیار کر لیتے ہیں تو اب ان پر اس نام کا اطلاق نہیں کیا جاتا کیونکہ اس وقت یہ اپنے مرکز سے اس قدر اجنبی ہو جاتے ہیں کہ مرکز کے وحشی قبائل ان کو بھی اپنا حریف بنا لیتے ہیں اور ان پر غارت گری کرتے رہتے ہیں۔ (ص 205 ج 3)

ذوالقرنین کی بنائی ہوئی دیوار کہاں ہے؟

یہ دیوار دربند (قزوین) یا کاتین وال (Cothian Wall) کے مغرب کی جانب میں ایک درہ کو بند کرتی ہے۔ یہ درہ (Pass) بند سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں آگے بڑھتے ہوئے ملتا

ہے اور درہ داریال کے نام سے مشہور ہے اور قفقاز اور تعلس کے درمیان واقع ہے۔ یہ درہ کاکیشیا کے بہت بلند حصوں سے ہو کر گزرا ہے اور قدرتی طور پر پہاڑ کی دو بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے اس کو فارسی میں درہ آہنی اور ترکی میں دامر کپو کہتے ہیں۔ اس درہ ہے متعلق امام رازی رحمہ اللہ کی تفسیر میں ہے کہ یہ قفقاز میں ہے۔

درہ داریال کی یہ سد (روک اور دیوار) سائرس کی تعمیر کردہ ہے...... یہ ان وحشی قبائل کے لیے اس نے بنائی تھی جو کاکیشیا کے انتہائی علاقوں سے آ کر اس درہ میں سے گزر کر قفقاز کے پہاڑوں کے اس طرف بسنے والوں پر لوٹ مار مچاتے تھے۔

حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ بَیۡنَ السَّدَّیۡنِ وَجَدَ مِنۡ دُوۡنِهِمَا قَوۡماً لَا یَكَادُوۡنَ یَفۡقَهُوۡنَ قَوۡلاً ٥ قَالُوۡا یٰذَا الۡقَرۡنَیۡنِ اِنَّ یَاۡجُوۡجَ وَمَاۡجُوۡجَ مُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَهَلۡ نَجۡعَلُ لَكَ خَرۡجًا عَلٰٓی اَنۡ تَجۡعَلَ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَهُمۡ سَدًّا ٥ قَالَ مَا مَكَّنِّیۡ فِیۡهِ رَبِّیۡ خَیۡرٌ فَاَعِیۡنُوۡنِیۡ بِقُوَّةٍ اَجۡعَلۡ بَیۡنَكُمۡ وَبَیۡنَهُمۡ رَدۡمًا اٰتُوۡنِیۡ زُبَرَ الۡحَدِیۡدِ حَتّٰٓی اِذَا سَاوٰی بَیۡنَ الصَّدَفَیۡنِ قَالَ انۡفُخُوۡا حَتّٰٓی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا قَالَ اٰتُوۡنِیۡٓ اُفۡرِغۡ عَلَیۡهِ قِطۡرًا ٥ فَمَا اسۡطَاعُوۡٓا اَنۡ یَّظۡهَرُوۡهُ وَمَا اسۡتَطَاعُوۡا لَهٗ نَقۡبًا ٥ قَالَ هٰذَا رَحۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّیۡ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ رَبِّیۡ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعۡدُ رَبِّیۡ حَقًّا ٥ (سورہ کهف: **93-98**)

یہاں تک کہ جب ذوالقرنین دو پہاڑوں کے درمیان پہنچے تو ان پہاڑوں کے ورے ایک قوم کو پایا جو (اجنبی زبان ہونے کی وجہ سے) بات کو سمجھتے ہی نہ تھے۔ (ترجمان کی معرفت) انہوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین یاجوج ماجوج (نام کی قوم کے لوگ) اس سرزمین میں (بڑا) فساد مچاتے ہیں تو کیا ہم آپ کے لئے کچھ محصول جمع کر دیں جس سے آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنا دیں۔ (ذوالقرنین نے) کہا کہ میرے پروردگار نے مجھے جو کچھ دے رکھا ہے وہ بہت کچھ ہے سو تم میری مدد محنت سے کرو تو میں تمہارے اور ان کے درمیان خوب مضبوط دیوار بنا دوں۔ تم لوگ میرے پاس لوہے کی چادریں لاؤ۔ یہاں تک کہ جب ان دونوں پہاڑوں کے سروں کے درمیان کو برابر کر دیا تو کہا کہ دھونکو۔ یہاں تک کہ جب اسے آگ بنا دیا تو کہا کہ (اب) میرے پاس پگھلا ہوا تانبا لاؤ تو میں اس پر ڈال دوں۔ سو (یاجوج ماجوج) نہ اس پر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس میں نقب ہی لگا سکتے تھے۔ (ذوالقرنین نے) کہا کہ یہ (بھی) میرے رب کی ایک رحمت ہی ہے۔ پھر جب میرے رب کا وعدہ آ پہنچے گا تو وہ اسے ڈھا کر برابر کر دے گا اور میرے رب کا (ہر) وعدہ برحق ہے۔

یاجوج ماجوج کے خروج کا ذکر قرآن پاک میں ہے اور اہم بات یہ ہے کہ اس کا تعلق علامات قیامت سے ہے۔

قرآن پاک میں یاجوج ماجوج کا ذکر دو جگہوں پر ہے ایک سورہ کہف میں اور دوسرا سورہ انبیاء میں۔

سورہ کہف میں اس طرح مذکور ہے:

فَمَا اسْطَاعُوْا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِنْ رَّبِّىْ فَاِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّىْ جَعَلَهٗ دَكَّاءَ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّىْ حَقًّا۔

(ترجمہ: پس طاقت نہیں رکھتے یاجوج ماجوج اس سد پر چڑھنے کی اور نہ وہ اس میں سوراخ کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔ ذوالقرنین نے کہا یہ میرے رب کی رحمت ہے۔ پھر جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو اس کو گرا کر ریزہ ریزہ کر دے گا اور میرے رب کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے۔)

اور سورہ انبیاء میں اس طرح ذکر ہے:

حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاجُوْجُ وَمَاجُوْجُ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ۔ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِيْنَ۔

(ترجمہ: یہاں تک کہ جب کھول دیے جائیں گے یاجوج اور ماجوج اور وہ زمین کی بلندیوں سے دوڑتے ہوئے اتر آئیں گے اور خدا کا سچا وعدہ قریب آ جائے تو اس وقت اچانک ایسا ہوگا کہ جن لوگوں نے کفر کیا ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی اور پکار اٹھیں گے کہ ہائے ہماری کم بختی کہ ہم بے خبر رہے بلکہ ہم ظالم تھے)۔

ان دونوں مقامات میں قرآن پاک نے ایک تو یہ بتایا کہ جس زمانہ میں ذوالقرنین نے یاجوج و ماجوج پر سد قائم کی تو اس کے استحکام کی یہ حالت تھی کہ یہ قومیں نہ اس کو پھاند کر اس جانب آ سکتی تھیں اور نہ اس میں سوراخ کر کے اس کو عبور کر سکتی تھیں۔ لیکن چونکہ ہر چیز کو فنا ہے تو اگرچہ یہ دیوار بہت مضبوط سہی لیکن جب اس کی فنا کا وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ریزہ ریزہ کر دیں گے۔

بہت سے مفسرین نے یہ سمجھا کہ یاجوج و ماجوج سد ذوالقرنین کی وجہ سے اپنے علاقے میں اس طرح محصور ہو گئے ہیں کہ یہ سد قیامت تک اسی طرح صحیح وسالم کھڑی رہے گی اور قیامت کے قریب وہ ٹوٹے گی اور یاجوج و ماجوج نکل کر دنیا میں پھیل جائیں گے چنانچہ انہوں نے دونوں مقامات میں اسی کے مطابق آیات کی تفسیر کی اور سورہ انبیاء کی آیت کو سورہ کہف کی آیت کے ساتھ یوں جوڑا کہ جب میرے رب کا وعدہ آئے گا یعنی قرب قیامت میں تو وہ اس کو ریزہ ریزہ کر دے گا اور یاجوج و ماجوج کھول دیئے جائیں گے۔

دیگر بعض مفسرین نے ان کو علیحدہ علیحدہ رکھا ہے یعنی سد ذوالقرنین کی مضبوطی اور بالآخر اس کے ٹوٹنے

اور فنا ہونے کو علیحدہ رکھا اور قرب قیامت میں یاجوج وماجوج کے خروج کو علیحدہ رکھا اور دونوں کو آپس میں جوڑا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سد ذوالقرنین کا قرب قیامت تک باقی رہنا کوئی یقینی نہیں، اللہ کے یہاں کا لکھا ہوا ہو تو پہلے بھی ٹوٹ سکتی ہے۔ سد کے بنانے سے غرض یہ تھی کہ درے سے ورے اور اس طرف کو جو لوگ تمدنی زندگی گزار رہے ہیں وہ ان وحشی قبائل کے حملوں سے محفوظ رہیں۔ درہ اگر بند ہو جائے گا تو حملے رک جائیں گے۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ یاجوج وماجوج کے قبائل اس دیوار کی وجہ سے باقی پوری دنیا سے کٹ جائیں اور یہ مطلب ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ یاجوج وماجوج صرف ایک اس درہ سے ہی نکل کر غارت گری نہیں کرتے تھے بلکہ کاکیشیا کے اس کونہ سے چین کے علاقے منچوریا تک ان کے خروج کے بہت سے مقامات تھے۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث اور اس دوسری تفسیر کے مابین مطابقت

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نیند سے بیدار ہوئے تو یہ حالت تھی کہ چہرہ مبارک سرخ تھا اور یہ ارشاد فرما رہے تھے:

لا إلـه الا الله ويل للعرب عن شرقد اقترب فتح اليوم من ردم يا جوج و ماجوج مثل هذا و حلق۔

(ترجمہ: لا إلـه الا الله۔ عرب کے لیے ہلاکت ہے اس شر سے جو قریب آ رہا ہے۔ آج یاجوج و ماجوج پر قائم شدہ سد اس طرح کھول دی گئی ہے اور انگوٹھے پر انگلی رکھ کر اور گول حلقہ بنا کر دکھایا۔)

شارحین بخاری مثلاً حافظ بدرالدین عینی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور کرمانی نے جو بات اجمالاً کہی اس کی تفصیل یہ ہے کہ یاجوج وماجوج قبائل کی اس تاخت وتاراج کے بعد جس کا ذکر ذوالقرنین کے ضمن میں آیا ہے تاریخ میں ان قبائل کا پھر کوئی یادگار حملہ مذکور نہیں ہے۔

البتہ ساتویں صدی عیسوی میں ان کے لیے ذوالقرنین کی یہ روک بیکار ہوگئی اور انہوں نے بحر خزر اور بحر اسود کے اس درے کے علاوہ جو ان پر بند کر دیا گیا تھا بحیرہ یورال اور بحر خزر کا درمیانی راستہ پا لیا۔ نیز ادھر سد ذوالقرنین کی مضبوطی میں بھی فرق آنا شروع ہوا۔ اس طرح ذوالقرنین کے بعد اب یاجوج وماجوج کے ایک نئے فتنے کا آغاز ہو چلا تھا اور صدیوں سے ان خاموش اور فتنہ جو قبائل میں پھر حرکت شروع ہوگئی تھی۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کو رویا صادقہ میں یہ دکھایا گیا کہ اگرچہ وہ وقت ابھی دور ہے جب قیامت کے قریب یاجوج وماجوج کے تمام قبائل عالم انسانیت پر چھا جائیں گے لیکن وہ وقت قریب ہے جب ذوالقرنین کے بعد ان کا ایک اہم خروج پھر ہوگا اور وہ عرب کی طاقت اور فرمان روائی کی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ اور اسی خروج کو اس

طرح حسی طور پر دکھایا گیا کہ گویا دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہوگیا ہے اور آہستہ آہستہ وہ دیوار گر کر منہدم ہو جانے والی ہے۔

چنانچہ زمانہ نبوی میں یہ وہ وقت تھا کہ ان قبائل میں سے چند منگول قبائل نے اپنے مرکز سے نکل کر قرب وجوار میں پھیلنا اور چھوٹے چھوٹے حملے کرنا شروع کر دیا تھا اور آخر کار چھٹی صدی ہجری میں چنگیز خان ان کا قائد بن گیا اور اس نے منتشر قبائل کو ایک جگہ جمع کرنا شروع کیا۔ پھر اس کے بیٹے اوکتائی خان نے ایک بے پناہ طاقت کے ساتھ اٹھ کر مغرب اور جنوب پر حملہ کر دیا اور 686ھ میں آخر ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کی عرب خلافت کا خاتمہ ہوگیا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے ایک صبح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

......پھر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اللہ تعالیٰ وحی فرمائیں گے کہ اب میں اپنی ایسی مخلوق کو نکالنے لگا ہوں جس کے مقابلہ کی کسی میں طاقت نہیں ہے میرے بندوں کو کوہ طور کی طرف لے جا کر جمع کر دیں اور اللہ تعالیٰ یاجوج وماجوج کو نکالیں گے جو ہر بلند زمین سے نکل پڑیں گے۔ ان کے اگلے لوگوں کا گزر بحیرہ طبریہ پر ہوگا تو وہ اس کو پی کر ختم کر دیں گے اور جب ان کے پیچھے کے لوگ وہاں سے گزریں گے تو کہیں گے (معلوم ہوتا ہے) کبھی یہاں پانی تھا۔ پھر بیت المقدس کے خمر پہاڑ پر پہنچیں گے اور اپنی قوت کے گھمنڈ میں کہیں گے ہم زمین والوں کو تو ختم کر چکے (کیونکہ بہت سے لوگوں کو وہ قتل کر دیں گے اور باقی چھپ جائیں گے) لو آؤ اب آسمان والوں کا بھی کام تمام کر دیں اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے۔ قدرت ان کے تیروں کو خون آلود کر کے واپس کرے گی۔ ادھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی جماعت کوہ طور میں محصور ہوگی (اور حالات بہت تنگ ہو جائیں گے) یہاں تک کہ بیل کی ایک سری اتنی قیمتی ہو جائے گی جیسا کہ آج تمہارے نزدیک سو دینار ہیں۔ (اس تنگی کی حالت میں عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی جماعت مل کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگی۔ (ان کی دعا سے) یاجوج وماجوج کے لوگوں کی گردنوں میں پھوڑے نکل آئیں گے اور وہ سب کے سب ایک دم میں اس طرح پھول پھٹ کر مر جائیں گے جیسے ایک آدمی مرتا ہے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے اتر کر آئیں گے تو زمین پر کہیں بالشت بھر جگہ نہ ہوگی جہاں ان کے سڑے ہوئے گوشت کی بدبو اور سڑاند نہ ہو۔ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی جماعت پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے آہ وزاری کرے گی۔ اس پر اللہ تعالیٰ ایک خاص قسم کے پرندے بھیجے گا جن کی گردنیں بختی اونٹوں کی طرح لمبی لمبی ہوں گی۔ وہ ان لاشوں کو اٹھا کر جہاں اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا ڈال دیں گے اور اللہ تعالیٰ اس زور کی بارش برسائیں گے کہ کوئی بستی (کوئی گھر) نہ رہے گا اور جنگل

میں کوئی خیمہ نہ بچے گا جس میں بارش نہ ہو یہاں تک کہ بارش تمام زمین کو آئینہ کی طرح صاف کردے گی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد 40 یا 45 سال زندہ رہ کر مدینہ منورہ میں انتقال فرمائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے بعد ایک قحطانی شخص کو اپنا خلیفہ مقرر کر جائیں گے جس کا نام جہجاہ ہوگا۔ یہ خوب اچھی طرح عدل وانصاف کے ساتھ حکومت کرے گا مگر ساتھ ہی ساتھ شر اور فساد کا پھیلنا بھی شروع ہو جائے گا۔

5- خروج دخان یعنی دھویں کا ظاہر ہونا

جہجاہ کے بعد اور چند بادشاہ ہوں گے اور کفر اور الحاد شر اور فساد بڑھنا شروع ہوگا۔ یہاں تک کہ ایک مکان مغرب میں اور ایک مکان مشرق میں جہاں منکرین تقدیر رہتے ہوں گے وہ دھنس جائے گا اور انہیں دنوں آسمان سے ایک بہت بڑا دھواں ظاہر ہوگا جو آسمان سے لے کر زمین تک تمام چیزوں کو گھیر لے گا جس سے لوگوں کا دم گھٹنے لگے گا وہ دھواں چالیس دن تک رہے گا۔ مسلمانوں کو زکام سا معلوم ہوگا اور کافروں پر بے ہوشی طاری ہو جائے گی۔ کسی کو دو دن میں اور کسی کو تین دن میں ہوش آئے گا۔ قرآن کریم میں اس دخان کا ذکر ہے۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ يَغْشَى النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (سورہ دخان:10)

”پس آپ اس روز کا انتظار کیجئے کہ آسمان کی طرف سے ایک دھواں نمودار ہوگا۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ دخان کی علامت گزر چکی ہے۔ حضور ﷺ کی بددعا سے اس زمانہ میں ایک سخت قحط پڑا تھا جس کی شدت سے کفار زمین پر دھواں دیکھتے تھے۔

6- مغرب سے طلوع آفتاب

قیامت کی علامات کبریٰ میں سے ایک بڑی علامت آفتاب کا مغرب کی جانب سے طلوع ہونا ہے اور اس آیت شریفہ:

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيَاتِ رَبِّكَ (سورہ انعام:158)

”کیا لوگ ایمان لانے میں اس کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا خود تیرا رب آئے یا خدا کی نشانیوں میں سے کوئی بڑی نشانی آئے۔“

اس آیت میں بَعۡضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ سے آفتاب کا جانب مغرب سے طلوع ہونا مراد ہے۔ حدیث میں ہے کہ جس رات کی صبح کو آفتاب مغرب سے طلوع کرے گا وہ رات نہایت دراز ہوگی۔ یہاں تک کہ لوگ خوفزدہ ہو جائیں گے کہ کوئی بڑا حادثہ ظاہر ہونے والا ہے۔ لہٰذا دعا اور استغفار میں سربسجود مصروف ہو جائیں گے۔ اتنے میں آفتاب مغرب کی جانب سے طلوع کرے گا۔ مگر اس میں روشنی نہ ہوگی جیسے گہن کے وقت ہوتا ہے۔ اس قسم کا بے نور ہوگا اور اتنا بلند ہو کر جتنا کہ چاشت کے وقت ہوتا ہے پھر غروب ہو جائے گا اور پھر اپنی قدیم عادت کے مطابق مشرق سے نکلتا رہے گا تمام لوگ اس حالت کا مشاہدہ کرلیں گے۔ اس عظیم الشان نشان کے بعد نہ کسی کافر کا ایمان معتبر ہوگا اور نہ کسی گنہگار مسلمان کی توبہ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

يَوۡمَ يَاۡتِىۡ بَعۡضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنۡفَعُ نَفۡسًا اِيۡمَانُهَا لَمۡ تَكُنۡ اٰمَنَتۡ مِنۡ قَبۡلُ اَوۡ كَسَبَتۡ فِىۡۤ اِيۡمَانِهَا خَيۡرًا (سورہ انعام: 158)

> ”جس دن تیرے رب کی ایک خاص نشانی آجائے گی یعنی آفتاب کا مغرب سے طلوع ہو جانا تو اس دن کسی شخص کو ایمان لانا نفع نہ دے گا جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو اور نہ اس شخص کو توبہ نفع دے گی جس نے پہلے سے توبہ نہ کی۔“

بخاری اور مسلم اور دیگر احادیث صحیحہ میں تصریح ہے کہ بعض آیات ربک سے آفتاب کا مغرب کی جانب سے طلوع کرنا مراد ہے۔

تنبیہ: جس وقت آفتاب مغرب سے طلوع کرے گا وہ وقت اس تمام عالم کے نزع اور جان کنی کے شروع ہو جانے کا وقت ہوگا۔ صور پھونکنے کے بعد تمام عالم کی پوری جان نکل جائے گی اور جس طرح نزع اور جان کنی کے وقت ایمان اور توبہ معتبر نہیں اسی طرح مغرب سے آفتاب طلوع ہونے کے بعد کسی کا ایمان اور توبہ قبول نہ ہوگی کیونکہ پوری دنیا کی نزع اور جان کنی شروع ہوگئی ہے اور وہ آخرت جو اب تک غیب تھی اب وہ محسوس اور مشاہد ہوگئی اور ایمان وہی معتبر ہے جو بالغیب ہو۔ مشاہدہ کے بعد ایمان معتبر نہیں۔

حق جل شانہ جب اس نظام کو درہم برہم کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو اس کی ابتداء اس عظیم الشان نشان سے ہوگی تا کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ دنیا کا کام اب انتہا کو پہنچ چکا ہے اور قیامت کے بارہ میں انبیاء کرام نے خلق خدا کو جو خدا کا پیغام پہنچایا تھا وہ سب بجا اور درست ہے اور وہ خبر اب آنکھوں کے سامنے آگئی ہے۔

قرآن کریم کی صرف دو ہی سورتوں کو پڑھ لیجئے یعنی سورت اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ اور سورت اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ جن میں اس امر کی پوری تفصیل ہے کہ جب قیامت قائم ہوگی تو آسمان اور زمین کا نظام اور

شمس وقمر اور نجوم وکواکب کا تمام نظام شمسی اور فلکی درہم برہم ہو جائے گا۔

7- دابتہ الارض کا نکلنا

قیامت کی ایک بڑی نشانی زمین سے دابتہ الارض کا نکلنا ہے جو نص قرآنی سے ثابت ہے۔

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ (سورہ نمل: 82)

اور جب قیامت کا وعدہ پورا کرنے کا وقت قریب الوقوع ہو جائے گا تو اس وقت ہم لوگوں کی عبرت کے لئے زمین سے ایک عجیب وغریب جانور نکالیں گے جو لوگوں سے باتیں کرے گا (اور کہے گا کہ اب قیامت قریب آ گئی ہے یہ جانور ہم زمین سے اس لئے نکالیں گے) کہ لوگ ہماری نشانیوں کا یقین نہیں کرتے تھے۔

جس روز آفتاب مغرب سے طلوع کرے گا اسی دن یہ عجیب الخلقت جانور زمین سے نکلے گا۔ مکہ مکرمہ کا ایک پہاڑ جس کو کوہ صفا کہتے ہیں وہ پھٹے گا اس میں سے ایک عجیب الخلقت جانور نکلے گا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو پتھر سے نکالا تھا اسی طرح اپنی قدرت سے قیامت کے قریب زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو لوگوں سے کلام کرے گا اور قیامت کی خبر دے گا۔ مومنوں کے چہروں پر ایک نورانی نشانی لگائے گا جس سے مومنین کے چہرے روشن ہو جائیں گے اور کافروں کی آنکھوں کے درمیان ایک مہر لگائے گا جس سے ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے اور حسب ارشاد باری **وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ**۔ مسلم اور مجرم کا امتیاز اس طرح شروع ہو جائے گا اور پورا امتیاز حساب وکتاب کے بعد ہوگا۔

8- ٹھنڈی ہوا کا چلنا

دابتہ الارض کے نکلنے کے کچھ عرصہ بعد ایک ٹھنڈی ہوا چلے گی جس سے تمام اہل ایمان اور اہل خیر مر جائیں گے یہاں تک کہ اگر کوئی مومن کسی غار یا پہاڑ میں چھپا ہوا ہوگا تو وہاں بھی یہ ہوا پہنچے گی اور وہ شخص اس ہوا سے مر جائے گا نیک لوگ سب مر جائیں گے اور نیکی اور بدی میں فرق کرنے والا بھی کوئی باقی نہ رہے گا۔ (مسلم)

9- حبشیوں کا غلبہ اور خانہ کعبہ کو ڈھانا

بعد ازاں حبشہ کے کافروں کا غلبہ ہوگا اور زمین پر ان کی سلطنت ہوگی۔ ظلم اور فساد عام ہوگا بے شرمی اور بے حیائی کھلم کھلا ہوگی۔ چوپایوں کی طرح لوگ سڑکوں پر جماع کریں گے۔ وہ خانہ کعبہ کو ایک ایک اینٹ کر

کے توڑ دیں گے۔ حدیث میں ہے۔

لا يستخرج كنز الكعبة الا ذو السويقتين من الحبشة۔ (ابو داؤد)

”خانہ کعبہ کے (امام مہدی علیہ السلام کے بعد جمع ہونے والے) خزانہ کو چھوٹی پنڈلیوں والا حبشہ کا رہنے والا نکالے گا۔“

10- آگ کا نکلنا

قیامت کی آخری نشانی یہ ہے کہ وسط عدن سے ایک آگ نکلے گی لوگوں کو گھیر کر ملک شام کی طرف لائیگی جہاں مرنے کے بعد حشر ہوگا (یعنی قیامت میں جو نئی زمین بنائی جائے گی اس کا وہ حصہ جو موجودہ زمین کے ملک شام کے مقابل ہوگا)۔ یہ آگ لوگوں سے دن رات میں کسی وقت جدا نہ ہوگی جب شام کا وقت ہوگا اور لوگ ٹھہر جائیں گے تو یہ آگ بھی ٹھہر جائے گی اور جب صبح ہوگی اور آفتاب بلند ہو جائے گا تو یہ آگ لوگوں کو ہنکائے گی جب لوگ ملک شام میں پہنچ جائیں گے تو یہ آگ غائب ہو جائے گی۔

صحیح مسلم میں حذیفہ بن اسید غفاری سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے قیامت کی دس علامتیں بیان فرمائیں ان میں سے آخری علامت یہ ہے۔

نار تخرج من اليمن تطرد الناس الى محشرهم

”ایک آگ یمن سے نکلے گی اور لوگوں کو ارض محشر یعنی سرزمین شام کی طرف ہنکا کر لے جائے گی۔“

اس کے بعد کچھ عرصہ نہایت عیش و آرام سے گزرے گا کفر اور بت پرستی پھیل جائے گی اور زمین پر کوئی خدا کا نام لینے والا باقی نہ ہوگا۔ اس وقت قیامت قائم ہوگی اور اسرافیل علیہ السلام کو صور پھونکنے کا حکم ہوگا۔

تنبیہ: اکثر احادیث میں خروج نار کو قیامت کی آخری نشانی بتایا گیا ہے لیکن صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ اول نشانی قیامت کی وہ آگ ہوگی جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی طرف نکالے گی ان دونوں روایتوں میں تطبیق یہ ہے کہ گزشتہ علامتوں کے اعتبار سے یہ آخری نشانی ہے لیکن اس اعتبار سے کہ اس علامت کے ظہور کے بعد اب دنیا کی کوئی چیز باقی نہ رہے گی بلکہ اس کے بعد متصل نفخ صور واقع ہوگا۔ اس کو اول نشانی کہا گیا۔

باب: 11

قبر میں عذاب وراحت اور فرشتوں کا سوال کرنا حق ہے

1- سورہ مومن میں ہے:

فَوَقٰهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَامَكَرُوۡا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ☆ اَلنَّارُ يُعۡرَضُوۡنَ عَلَيۡهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَّ يَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ اَدۡخِلُوۡٓا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ (سورہ غافر:45,46)

ترجمہ: ’’پھر خدا تعالیٰ نے اس (مومن) کو ان لوگوں کی تدبیروں سے محفوظ رکھا اور فرعون والوں پر (مع فرعون کے) موذی عذاب نازل ہوا (جس کا بیان یہ ہے) کہ وہ لوگ (برزخ میں) صبح وشام آگ پر پیش کئے جاتے ہیں (یعنی جلائے جاتے ہیں) اور جس روز قیامت قائم ہوگی (تو حکم ہوگا کہ) فرعون والوں کو (مع فرعون کے) نہایت سخت عذاب میں داخل کرو۔‘‘

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن سے پہلے بھی فرعون اور اس کے لوگوں پر عذاب ہو رہا ہے۔ یہی قبر کا اور برزخ کا عذاب ہے۔

2- سورہ نوح میں ہے:

مِمَّا خَطِيۡٓـئٰتِهِمۡ اُغۡرِقُوۡا فَاُدۡخِلُوۡا نَارًا

ترجمہ: ’’اپنے گناہوں کے سبب وہ (یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے لوگ) غرق کئے گئے پھر آگ میں داخل کئے گئے۔‘‘

ان لوگوں کا قیامت سے پہلے آگ میں داخلہ سے مراد برزخ اور قبر کی آگ میں داخلہ ہے جس کے یہ دلائل ہیں۔

1- فَاُدۡخِلُوۡ میں حرف فاء ہے جو اپنے ماقبل کے متصل بعد ہونے پر دلالت کرتا ہے لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ آگ میں داخلہ غرق ہونے کے متصل بعد ہوا۔

ب۔ ادخلوا فعل ماضی کا لفظ ہے جو اس پر دلیل ہے کہ آگ میں داخلہ ہو چکا ہے۔

3- قبر میں عذاب وراحت اور فرشتوں کے سوال کے بارے میں احادیث متواتر ہیں اور کثیر صحابہ سے منقول ہیں۔ مثلاً حضرات عمر بن الخطاب' عثمان بن عفان' زید بن ثابت، انس بن مالک، براء بن عازب، تمیم داری، ثوبان، جابر بن عبداللہ، حذیفہ، عبادۃ بن صامت، عبداللہ بن رواحہ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود، عمرو بن العاص، معاذ بن جبل، ابوامامہ، ابوالدرداء ابوہریرہؓ اور عائشہ رضی اللہ عنہا وعنہم۔ پھر ان سے بے شمار لوگوں نے روایت کیا۔

چند ایک احادیث یہ ہیں۔

i۔ عن انس قال قال رسول الله ﷺ ان العبداذا وضع فی قبره وتولی عنه اصحابه انه ليسمع قرع نعالهم اتاه ملكان فيقعدانه فيقولا ن ما كنت تقول فی هذا الرجل لمحمد فاما المومن فيقول اشهد انه عبدالله ورسوله فيقال له انظر الی مقعدك من النار قد ابدلك الله به مقعدا من الجنة فيراهما جميعا واما المنافق اوالكافرفيقال له ماكنت تقول فی هذا الرجل فيقول لا ادری كنت اقول مايقول الناس فيقال له لا دريت ولا تليت ويضرب بمطارق من حديد ضربة فيصيح صيحة يسمعها من يليه غيرالثقلين (بخاری ومسلم)

> ’’حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ بلاشبہ جب بندے کو اس کی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی اس سے پھر جاتے ہیں اور وہ ان کی جوتیوں کی چاپ سنتا ہے تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں (ایک اور حدیث میں ان کا نام منکر اور نکیر ذکر ہے) جو اس کو بٹھاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ تم ان صاحب یعنی محمد ﷺ کے بارے میں کیا کہتے تھے۔ جو مومن ہوتا ہے وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اس سے کہا جائے گا تو اپنے جہنم کے ٹھکانے کو دیکھ جس کو اللہ نے جنت کے ٹھکانے سے بدل دیا ہے۔ وہ مومن دونوں ٹھکانوں کو دیکھے گا۔ اور جو کافر یا منافق ہوتا ہے اس سے پوچھا جاتا ہے تو ان صاحب کے بارے میں کیا کہتا تھا تو وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا جو لوگ کہتے تھے میں بھی وہی کہتا تھا۔ اس کو کہا جاتا ہے کہ نہ تو نے عقل سے کام لیا اور نہ ہی نقلی دلیل کو اختیار کیا اور اس کو لوہے کے گرزوں سے مارا جاتا ہے جس سے وہ چیخ مارتا ہے جو سوائے انسانوں اور جنوں کے آس پاس موجود جانور سنتے ہیں۔‘‘

ii۔ عن زيد بن ثابت قال بينما رسول الله ﷺ فی حائط لبنی النجار علی بغلة له ونحن

معه اذ حادت به فكادت تلقيه واذا اقبرستة او خمسة فقال من يعرف اصحاب هذه الاقبر قال رجل انا قال فمتى ماتوا قال فى الشرك فقال ان هذه الامة تبتلى فى قبورها فلولا ان لا تدافنوا لدعوت الله ان يسمعكم من عذاب القبر الذى اسمع منه (مسلم)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس دوران کہ رسول اللہ ﷺ بنونجار کے باغ میں اپنے خچر پر سوار تھے اور ہم آپ کے ساتھ تھے کہ اچانک آپ کا خچر بدکا اور قریب تھا کہ وہ آپ کو گرادے۔ ناگہاں سامنے پانچ یا چھ قبریں تھیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ ان قبر والوں سے کون واقف ہے۔ ایک شخص نے جواب دیا کہ میں (واقف ہوں) آپ ﷺ نے پوچھا کہ ان کی وفات کب ہوئی تھی۔ اس شخص نے جواب دیا کہ (زمانہ) شرک میں۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کی ان قبروں میں آزمائش کی جاتی ہے اور اگر مجھے ڈر نہ ہوتا کہ تم لوگ مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ جو عذاب قبر میں سن رہا ہوں اللہ وہ تم کو بھی سنوادے۔

iii۔ عن ابن عباس رضى الله عنهما ان النبى صلى الله عليه وسلم مربقبرين فقال انهما ليعذبان وما يعذبان فى كبيراما احدهما فكان لا يستبرى من البول واما الآخر فكان يمشى بالنميمة ......الخ (بخارى ومسلم)

> ”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کا دو قبروں پر گزر ہوا تو فرمایا ان دونوں قبر والوں کو عذاب دیا جارہا ہے اور ان کو بڑی مشکل چیز پر عذاب نہیں دیا جارہا (کہ ان سے پرہیز مشکل ہو) ایک تو پیشاب (کی چھینٹوں) سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چغلیاں لگاتا تھا۔“

تنبیہ 1: فرشتوں کے سوال اور عذاب وراحت کے سلسلہ میں جب قبر کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ہر وہ جگہ ہے جہاں میت دفن ہو یا اس کے اجزاء موجود ہوں خواہ وہ اجزاء اکٹھے ہوں یا متفرق ہوں اور خواہ اپنی اصلی شکل میں ہوں یا (مثلاً جل کر) کسی اور شکل میں تبدیل ہو گئے ہوں اور خواہ وہ خشکی میں ہوں یا پانی میں ہوں یا درندے کسی کے پیٹ میں ہوں اور خواہ میت کے تمام اجزاء ہوں یا صرف ایک خلیہ (Cell) ہی ہو۔

تنبیہ 2: آدمی کے مرنے کے بعد اس کی روح کو اس کے ٹھکانے اور مستقر میں پہنچا دیا جاتا ہے اور وہیں ہوتے ہوئے روح کا تعلق اپنے مادی جسم یا اس کے اجزاء کے ساتھ قائم کردیا جاتا ہے جس کی بنا پر مردے یا اس کے اجزاء بلکہ ایک ہی خلیہ پر (اگر فقط وہی ہو) عذاب وراحت کے جو حالات گزرتے ہیں روح ان کو محسوس کرتی ہے۔

تنبیہ 3: ہم ایک مادی اور حسی عالم میں رہ رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں عالم خواب کا تجربہ ہے جو مادی نہیں ہے۔ آدمی پر عالم خواب میں بہت سے حالات گزرتے ہیں لیکن پاس بیٹھے ہوئے بیدار شخص کو اس کا کچھ علم نہیں ہوتا اور وہ ان کو محسوس نہیں کرتا۔ اسی طرح ہمارے اس مادی وحسی عالم سے مختلف ایک اور عالم ہے جو عالم برزخ کہلاتا ہے۔ جیسے سویا ہوا شخص باوجودیکہ اس کا جسم عالم مادی میں ہوتا ہے عالم خواب میں چلا جاتا ہے۔ اسی طرح وفات پانے والا شخص باوجود اس کے کہ جسم کے اجزاء عالم مادی میں ہوتے ہیں عالم برزخ میں منتقل ہوجاتا ہے۔ جیسے سوئے ہوئے شخص کا جسم ہمارے سامنے ہوتا ہے لیکن عالم خواب میں اس پر گزرنے والے حالات کو ہم نہیں دیکھ سکتے اسی طرح میت کا جسم ہمارے سامنے ہوتا ہے لیکن عالم برزخ میں اس پر گزرنے والے حالات کو ہم محسوس نہیں کرسکتے اور دیکھ نہیں سکتے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ کسی پر عالم برزخ کو منکشف فرمادیں تو وہ شخص عالم برزخ کے حالات کو دیکھ لے گا جیسا کہ عذاب قبر کی وجہ سے میت کی چیخ جانوروں کو سنوا دی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اگر میت کے اجزاء اور خلیے کسی جانور کے پیٹ اور جسم میں ہوں اور میت پر عذاب ہو تو جانور پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

تنبیہ 4: بعض مردوں کو اپنے جسم یا اس کے اجزاء کے علاوہ برزخی جسم بھی دیئے جاتے ہیں اور ان پر عذاب وراحت کے حالات گزرتے ہیں جیسا کہ حدیث میں آتا ہے اپنے مستقر میں رہتے ہوئے روح کا تعلق دونوں جسموں سے قائم کردیا جاتا ہے۔

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ اتيت ليلة اسری بی علی قوم بطونهم كالبيوت فيها الحيات تری من خارج بطونهم فقلت من هولآء ياجبرئيل قال هولاء اكلة الربا رواه احمد وابن ماجه (مشكوة ص:226)

> ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس رات مجھے معراج کرائی گئی میرا گزر ایسے لوگوں پر ہوا جن کے پیٹ کمروں کی طرح (پھولے ہوئے تھے) اور ان میں سانپ تھے جو باہر سے نظر آرہے تھے۔ میں نے پوچھا اے جبرئیل یہ کون لوگ ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ سود خور ہیں۔“

تنبیہ 5: حدیث میں جو یہ آیا کہ قبر کے عذاب کو جانور سنتے ہیں تو اس پر بعض لوگوں کو یہ اشکال ہوتا ہے کہ حدیث کے مطابق نبی ﷺ کا خچر تو بدکا تھا لیکن ہم کسی جانور کو کافروں کے قبرستان میں بھی بدکتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں فقط اتنا ہے کہ جانور اس کو سنتے ہیں جب کہ یہ ہوتا ہے کہ چیخ پکار کی کچھ آواز ان تک پہنچتی ہے جس سے ان کے معمولات میں کچھ فرق نہیں آتا چیخ پکار کی پوری شدت ان

تک بھی نہیں پہنچائی جاتی اور حدیث کے واقعہ میں تعلیم امت کی غرض سے جانور پر چیخ پکار کی اصل شدت ایک آن کے لئے ظاہر کر دی گئی جس سے وہ بدک گیا۔

باب: 12

عقائد متعلقہ عالم آخرت

قیامت کا دن حق ہے اور ضرور آنے والا ہے اس دن اسرافیل علیہ السلام بحکم خداوندی صور پھونکیں گے جس سے تمام عالم فنا ہو جائے گا آسمان پھٹ جائیں گے اور ستارے گر جائیں گے اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ صور بگل کے مانند ایک چیز ہے جس کو اسرافیل علیہ السلام اپنے منہ سے لگا کر بجائیں گے جس کی آواز اس درجہ شدید ہوگی کہ اس کی شدت سے عالم کی ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ اس کے بعد پھر دوبارہ صور پھونکیں گے جس سے تمام مردے جی اٹھیں گے پہلی مرتبہ صور پھونکنے کا نام نفخہ اولی ہے اور اس کو نفخہ اماتت بھی کہتے ہیں اور دوسری مرتبہ صور پھونکنے کا نام نخفہ ثانیہ ہے اور اس کو نفخہ احیاء بھی کہتے ہیں اور دونوں نفخوں کی درمیانی مدت چالیس سال ہوگی۔ نفخہ اولیٰ سے لے کر جنت اور جہنم میں داخل ہونے تک کے سارے زمانہ کو قیامت کہتے ہیں۔

قیامت کا آغاز نفخہ اولی سے ہوگا جس سے تمام عالم تباہ اور برباد ہو جائے گا تمام جاندار مر جائیں گے قرآن پاک میں ہے:

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِيْ الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِيْ السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِيْ الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ (سورہ نمل:87)

”جس دن صور پھونکا جائے گا سو تمام آسمان و زمین والے گھبرا جائیں گے مگر جس کو خدا چاہے۔“

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ۔ (سورہ زمر:68)

”اور قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا تو آسمان اور زمین والوں کے ہوش اڑ جائیں گے (اور زندہ تو مر جائیں گے اور مردوں کی روحیں بے ہوش ہو جائیں گی۔) مگر جس کو خدا چاہے وہ بے ہوشی سے محفوظ رہے گا۔ (مثلاً حضرت جبرئیلؑ، میکائیلؑ، اسرافیلؑ اور ملک الموت اور حاملین عرش۔ یہ نخفہ کے وقت کی بات

ہے بعد میں ان پر بھی موت طاری کر دی جائے گی)۔

چالیس سال کے بعد دوبارہ صور پھونکا جائے گا اور یہ دوسرا نفخہ مردوں کو قبروں سے زندہ کرنے کے لئے ہوگا جیسا کہ اسی آیت میں ہے:

ثُمَّ نُفِخَ فِيۡهِ اُخۡرٰى فَاِذَا هُمۡ قِيَامٌ يَّنۡظُرُوۡنَ (سورہ زمر:68)

''پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو دفعتہً سب زندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں گے۔''

وَنُفِخَ فِى الصُّوۡرِ فَاِذَا هُمۡ مِّنَ الۡاَجۡدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمۡ يَنۡسِلُوۡنَ (سورہ یسین: 51)

''اور دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو لوگ قبروں سے نکل کر خدا کی طرف دوڑیں گے۔''

قیامت کا آغاز کس طرح ہوگا

باشندگان عالم اپنے کاروبار میں مشغول ہوں گے اور روئے زمین پر کوئی اللہ کا نام لینے والا باقی نہ ہوگا اور جمعہ کا دن ہوگا اور محرم الحرام کی دسویں تاریخ عاشورہ کا دن ہوگا کہ یکایک علی الصبح لوگوں کے کانوں میں ایک باریک آواز آنا شروع ہوگی اور بڑھتی جائے گی یہاں تک کہ اس سے تمام لوگ مرجائیں گے اور روحیں بے ہوش ہو جائیں گی اور زمین و آسمان پھٹ جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا جس سے تمام مردے زندہ ہو جائیں گے۔

قیامت برحق ہے

جس خدا نے اپنی قدرت سے اس عالم کو عدم محض سے نکال کر وجود عطا فرمایا اور نابود سے بود کیا۔ وہ دوبارہ بھی اس عالم کو فنا کرنے اور زندہ کرنے پر قادر ہے۔

وَهُوَ الَّذِىۡ يَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ وَهُوَ اَهۡوَنُ عَلَيۡهِ (سورہ روم:27)

''وہی پہلی بار بناتا ہے اور پھر وہی دوبارہ بنائے گا اور اعادہ ابتداء سے بہت آسان ہے۔''

كَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِيۡدُهٗ وَعۡدًا عَلَيۡنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيۡنَ (سورہ انبیاء: 104)

''جس طرح ہم نے اس عالم کو پہلی بار پیدا کیا اسی طرح ہم اس کو دوبارہ پیدا کریں گے۔ یہ ہمارے ذمہ وعدہ ہے ہم ضرور اس کو کریں گے۔''

وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيۡبَ فِيۡهَا وَاَنَّ اللّٰهَ يَبۡعَثُ مَنۡ فِى الۡقُبُوۡرِ (سورہ حج :7)

’’اور تحقیق قیامت یقیناً آنے والی ہے اس میں ذرہ برابر شک نہیں اور اللہ تعالیٰ مردوں کو قبروں سے زندہ کر کے اٹھائیں گے۔‘‘

دلائل بعث بعد الموت

قرآن کریم میں بعث بعد الموت کے اثبات کے دلائل بہت ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

1۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْىَ بِخَلْقِهِنَّ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِىَ الْمَوْتٰى (سورہ احقاف :33)

ترجمہ: کیا نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں کو اور زمین کو بنایا اور ان کے بنانے سے تھکا نہیں وہ مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو خدا زمین و آسمان کے پیدا کرنے سے عاجز نہ ہوا تو کیا وہ مردوں کے دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہ ہوگا۔

2۔ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِىَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِىْ اَنْشَاَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ (سورہ یٰسٓ:79-78)

یعنی کافر کہتے ہیں کہ بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا۔ اے پیغمبر آپ ان سے کہہ دیجئے کہ جس ذات نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا وہی ان کو دوبارہ پیدا کرے گا اور وہ تو ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

3- اور ایک جگہ فرماتے:

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ (سورہ حج:5)

’’اے لوگو! اگر تم کو دوبارہ زندہ ہونے میں شک اور تردد ہے تو (اپنی پیدائش میں غور کر لو۔) تحقیق ہم نے تم کو اول مٹی سے پھر نطفہ سے پیدا کیا (اس سے تم کو خدا کی قدرت کا اندازہ ہو جائے گا)۔‘‘

4- اور ایک جگہ حضرت ابراہیم کا قصہ ذکر فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا رَبِّ اَرِنِىْ كَيْفَ تُحْىِ الْمَوْتٰى (سورہ بقرہ:260) اے میرے پروردگار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ آپ قیامت کے دن کس طرح مردوں کو زندہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ چار پرندوں کو لے کر ان کے ٹکرے کر دو اور ان ٹکڑوں کو خلط کر کے پہاڑوں پر تقسیم کر دو اور پھر ان کو بلاؤ وہ زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے تمہارے پاس چلے آئیں

گے اور ہر ایک کے اجزاء دوسرے سے جدا ہو کر پہلی صورت پر نمودار ہو جائیں گے اسی طرح قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بدن کے متفرق اجزاء کو جمع کر کے پہلی صورت پر اس کو زندہ کر دے گا۔

5- اور ایک جگہ حضرت عزیر کا یا کسی اور نبی کا قصہ بیان فرمایا ان کو یہی شوق ہوا کہ مرنے کے بعد زندہ ہونے کی کیفیت دیکھیں اللہ تعالیٰ نے ان کو برسوں تک مارے رکھا مگر ان کا جسم صحیح سالم رہا اور خدا کی قدرت سے اس میں کوئی تغیر نہ ہوا مگر ان کی سواری کا گدھا مر کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس گدھے کو ان کے روبرو زندہ کیا اور قیامت کے دن مخلوق کے زندہ ہونے کا نمونہ دکھلا دیا اور بتلا دیا کہ موت اور حیات ہر وقت ہماری قدرت میں ہے۔

6- وَكَذَالِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْا اَنَّ وَعْدَاللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا۔ (سورہ کہف:21)

(اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے) تین سو سال کی نیند کے بعد اصحاب کہف کو بیدار کیا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اللہ نے مردوں کو زندہ کرنے کا جو وعدہ کیا ہے وہ حق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔

اس زمانہ میں بعث بعد الموت کے متعلق بڑا جھگڑا تھا کوئی قائل تھا اور کوئی منکر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا کرشمہ دکھلا دیا کہ جو خدا تین سو سال کی نیند کے بعد جگانے پر قادر ہے وہ صدہا سال کی موت کے بعد زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔

ابطال عقیدۂ تناسخ

ہندوستان کے ہندو بھی بعث بعد الموت کے منکر ہیں مگر ہندوؤں کا مذہب عجیب ہے وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ قیامت کوئی چیز نہیں البتہ مرنے کے بعد روحیں مختلف جسموں میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ نیک لوگوں کی روحیں اچھے جسموں میں منتقل ہوتی ہیں اور بد لوگوں کی روحیں کتے بلی سور ریچھ گدھے وغیرہ کے قالب میں منتقل ہوتی رہتی ہیں اور روح کا اس طرح مختلف جسموں میں منتقل ہونے کا نام تناسخ ہے۔

اہل اسلام کہتے ہیں کہ عقیدۂ تناسخ بالکل مہمل اور خلاف عقل ہے اس لئے کہ جزا اور سزا کے لئے یہ ضروری ہے کہ جس کو سزا دی جا رہی ہے اس کو اس بات کا علم ہونا چاہیئے کہ یہاں اس کے فلاں جرم کی سزا ہے مگر دوسرے جون میں آنے والے کو اس کا مطلق علم نہیں ہوتا کہ میں اس جون میں کس گناہ کی وجہ سے آیا ہوں۔ سب کو معلوم ہے کہ اگر کوئی شخص سالہا سال کسی شہر میں رہ کر آیا ہو تو دوسرے شہر میں پہنچ کر اس کو پہلے شہر کے اکثر واقعات یاد رہتے ہیں اور لوگوں کو سناتا ہے۔ پس اگر ہندوؤں کے بقول آدمی اس سے پہلے دنیا میں

چند بار رہ چکے ہیں تو کیا سبب ہے کہ وہ یہاں آ کر اس جنم کے کسی حال کی خبر نہیں دیتے۔ معلوم ہوا کہ اس سے پہلے کبھی اس دنیا میں نہیں آئے۔ اور ان کی یہ آمد دنیا میں پہلی آمد ہے۔

عقیدہ وزن اعمال

قیامت کے دن اعمال کا حساب ہونا حق ہے اور اس کے بعد اجر معلوم کرنے کی خاطر اعمال کے تولنے کے لئے میزان اعمال (یعنی ترازو) کا رکھا جانا بھی حق ہے جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ اس کی نجات کی علامت ہوگی اور جس کا پلہ ہلکا ہوگا، یہ اس کے خسارہ اور نقصان کا نشان ہوگا۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (سورہ اعراف: 8,9)

’’اور اس دن وزن اعمال حق ہے۔ جن کی تولیں ہلکی ہوئیں تو وہی ہیں جنہوں نے اپنا نقصان کیا اس واسطے کہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے اور تول اس دن ٹھیک ہوگی۔‘‘

اور میزان اعمال حقیقتہً ترازو ہوگی۔ اس کے دو پلڑے اور زبان ہوگی اور ایک پلڑا نورانی ہوگا جس میں حسنات تلیں گی اور دوسرا ظلمانی جس میں سیئات تلیں گی اور حقیقتہً وزن ہوگا۔ باقی اس ترازو کی حقیقت اور اس کے وزن کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے اور ایمان لانے کے لئے اتنا علم اجمالی کافی ہے۔

شفاعت کبریٰ

نفخہ ثانیہ کے بعد اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو حساب اور پیشی کے مقام پر جمع کرے گا اس موقف کا نام ساہرہ ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔ **فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ** ’’ساہرہ لغت میں روئے زمین کو کہتے ہیں۔ حساب و کتاب کے لئے اللہ تعالیٰ جس زمین پر خلائق کو جمع کرے گا وہ یہ زمین نہ ہوگی بلکہ دوسری زمین ہوگی۔ **يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ** (سورہ ابراہیم: 48)

(ترجمہ: جس دن بدلی جائے گی یہ زمین دوسری زمین سے)

حساب و کتاب اسی نئی زمین پر ہوگا جب پیشی و حساب کے مقام میں مخلوق کو کھڑے ہوئے ایک عرصہ دراز گزر جائے گا اور لوگ تشنگی اور تپش سے عاجز آ جائیں گے تو حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر شفاعت کی درخواست کریں گے کہ خلائق کا فیصلہ اور حساب و کتاب ہو جائے اور یہ مصیبت ختم ہو۔ حضرت آدم، حضرت نوح کی طرف بھیجیں گے اور نوح علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اور ابرہیم حضرت

موسیٰ کی طرف اور حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ کی طرف حوالہ کریں گے اس وقت حضرت عیسیٰ یہ فرمائیں گے:

ان محمداً خاتم النبیین قد حضر الیوم

محمد مصطفیٰ خاتم الانبیاء ﷺ آج تشریف فرما ہیں۔ ان سے شفاعت کی درخواست کرو۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام خلائق کے نمائندوں کو لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور شفاعت کی درخواست کریں گے حضور ﷺ شفاعت کے لئے کھڑے ہوں گے اور مخلوق کو اس دن کی گرمی اور تپش سے نجات دلائیں گے۔ اس شفاعت کا نام شفاعت کبریٰ ہے اور شفاعت کبریٰ کے مرتبہ ومقام میں فائز ہونے کا نام مقام محمود ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (سورہ بنی اسرائیل:79)

''ترجمہ: قریب ہے کہ کھڑا کرے آپ کو آپ کا رب مقام محمود میں''۔

نامہائے اعمال کی تقسیم

رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے بعد خلائق کو نامہائے اعمال اس طرح تقسیم ہوں گے کہ ہر ایک کا نامہ اعمال اڑ کر اس کے دائیں یا بائیں ہاتھ میں پہنچ جائے گا اور پھر ہر ایک کو اپنے نامہ اعمال پڑھنے کا حکم ہوگا۔

اِقْرَاْ کِتَابَكَ کَفٰی بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا (سورہ بنی اسرائیل:14)

''آج اپنا نامہ اعمال خود پڑھ لے تیرا نفس ہی خود کافی محاسب ہے۔''

تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ میں نے جو کچھ دنیا میں کیا تھا وہ سب لکھا ہوا ہے آج میرے سامنے موجود ہے۔

نامہائے اعمال کو پڑھنے کے بعد محاسبہ شروع ہوگا

جب ہر شخص اپنا نامہ اعمال دیکھ لے گا اور پڑھ لے گا تب اس کا حساب اور محاسبہ شروع ہوگا جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتَابَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا۔ (سورہ انشقاق :7,8)

''جس شخص کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو اس کا حساب نہایت آسان طریقہ سے لیا جائے گا۔''

معلوم ہوا کہ حساب اور محاسبہ نامہ اعمال کی تقسیم کے بعد ہوگا۔

محاسبہ کے وقت کراماً کاتبین اور حضرات انبیاء کی حضوری

جس وقت حساب لیا جائے گا اس وقت انبیاء کرام اور کراماً کاتبین گواہانہ حیثیت سے حاضر ہوں گے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ (سورہ زمر:69)

”اور حساب کے وقت انبیاء اور شہداء کو بلایا جائے گا اور حق کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے گا۔ آیت میں شہداء سے کراماً کاتبین مراد ہیں۔“

انبیاء کرام یہ کہیں گے کہ ہم نے ان کو اللہ کے احکام پہنچائے مگر انہوں نے تکذیب کی۔ کفار انبیاء کرام کی تبلیغ اور دعوت کا انکار کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اس وقت انبیاء سے گواہ طلب کریں گے۔ ہمارے نبی اکرم ﷺ اور امت محمدیہ گواہی دے گی کہ انبیاء کرام نے اللہ کے احکام پہنچا دیئے تھے اور یہ آیت اسی بارے میں ہے۔

وَکَذَالِكَ جَعَلْنَاکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَهِیْدًا (سورہ بقرہ: 143)

”اور اس طرح بنایا ہم نے تم کو معتدل امت تا کہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا۔“

اور کراماً کاتبین نامہائے اعمال پیش کر دیں گے اور جب کفار نامہائے اعمال کا بھی انکار کریں گے تو من جانب اللہ خود انسان کے اعضاء اور جوارح انسان کے اعمال کی شہادت دیں گے اور خود بخود بولیں گے کہ انسان نے کیا کیا عمل کئے تھے چنانچہ ارشاد ہے۔

یَوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا قَالُوْا اَنْطَقَنَااللّٰهُ الَّذِیْ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ(سورہ سجدہ:20,21)

”قیامت کے دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور پیران کے اعمال کی شہادتیں دیں گے۔“

وہ لوگ اس وقت اپنی کھالوں سے یہ کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی۔ اعضاء جواب میں یہ کہیں گے کہ ہم کو آج اس خدا نے گویائی دی جس نے ہر چیز کو گویائی عطا کی۔ یعنی ہمارے اختیار کو کوئی دخل نہیں۔

حَتّٰٓی اِذَا مَاجَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَیْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔

''یہاں تک کہ جب وہ پہنچیں گے اس پر تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گی ان اعمال کی جو وہ کرتے تھے۔''

غرض یہ کہ انبیاء کرام اور کراماً کاتبین کی شہادت کے بعد خود ان کے اعضاء اور جوارح بھی ان کی بداعمالیوں کی شہادتیں دیں گے اور اس طرح ان پر حجت تمام ہوگی۔

محاسبہ کا معنی

حساب اور محاسبہ کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اعمال پر مطلع کیا جائے گا اور محاسبہ کے وقت سے پہلے ان کو بتلایا اور جتلایا جائے گا کہ تم نے فلاں فلاں وقت اور فلاں فلاں جگہ یہ اعمال کئے۔ غرض یہ کہ ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا۔

وَاِنْ کَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِهَا وَ کَفٰی بِنَا حَاسِبِیْنَ یعنی اگر ان کا کوئی عمل رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا تو اس کو بھی سامنے کر دیں گے اور اس کا حساب لیں گے اور ہم کافی حساب لینے والے ہیں۔ کفار اور مشرکین سے حساب و کتاب لینے کے بعد دوزخ میں ڈالنے کا حکم ہوگا۔ اہل ایمان سے حساب مختلف طرح ہوگا کسی سے آسان اور کسی سے سخت، حدیث میں ہے کہ مسلمان کو یہ دعا مانگنی چاہئے۔

اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَّسِیْرًا

''اے اللہ مجھ سے بہت ہی آسان حساب لینا''

اور قرآن اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک گروہ جنت میں بلا حساب و کتاب جائے گا وہ گروہ متوکلین کا ہے۔

اور حق جل شانہ بوقت حساب اپنے خاص بندوں سے کچھ کلام اور خطاب بھی فرمائیں گے اور ان کے اور خدا کے درمیان حجاب اور ترجمان نہ ہوگا اور کفار سے اول تو کوئی کلام ہی نہیں فرمائیں گے۔ اور اگر کچھ فرمائیں گے۔ تو غیظ و غضب اور توبیخ اور سرزنش کے ساتھ ہوگا۔

عقیدہ حوض کوثر

قرآن پاک میں ہے اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْکَوْثَرَ (ہم نے آپ کو کوثر یعنی خیر کثیر عطا فرمایا)۔ خیر کثیر میں ہر قسم کی دینی و دنیوی دولتیں اور حسی و معنوی نعمتیں داخل ہیں۔ ان نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت حوض کوثر ہے جس کے پانی سے آپ اپنی امت کو محشر میں سیراب فرمائیں گے۔ حوض کوثر کا ثبوت بعض محدثین کے نزدیک حد

تواتر تک پہنچ چکا ہے۔ بعض روایات سے اس کا محشر میں ہونا اور اکثر سے جنت میں ہونا ثابت ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اصل نہر جنت میں ہوگی اور اسی کا پانی میدان حشر میں لا کر ایک حوض میں جمع کر دیا جائے گا۔ اس نہر اور اس حوض دونوں کو ہی کوثر کہتے ہیں۔

قیامت کے دن ہر نبی کو اس کے مرتبہ کے موافق ایک حوض عطا ہوگا۔

جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے تو پیاسے ہوں گے تو ہر نبی اپنی امت کے نیکوں کو اپنے حوض سے پانی پلائے گا۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ حوض کوثر پر حاضری حساب و کتاب سے پہلے ہوگی یا پل صراط سے گزرنے کے بعد لیکن ظاہر یہ ہے کہ بعض کو قبر سے اٹھتے ہی پانی ملے گا اور بعض کو کچھ دیر میں اور بعض کو پل صراط سے گزرنے کے بعد اور بعض کو دوزخ سے خلاص ہونے کے بعد اور جنت میں داخل ہونے سے پہلے پانی ملے گا اور ممکن ہے کہ کسی کو سب جگہ پانی پلایا جائے۔

پل صراط

1- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ثُمَّ یُضْرَبُ الْجَسْرُ عَلٰی جَھَنَّمَ وَتَحِلُّ الشَّفَاعَةُ وَیَقُوْلُوْنَ اَللّٰھُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ فَیَمُرُّ الْمُوْمِنُوْنَ کَطَرْفِ الْعَیْنِ وَ کَالْبُرْقِ وَ کَالرِّیْحِ وَ کَالطَّیْرِ وَ کَاجَاوِیْدِ الْخَیْلِ وَالرِّکَابِ فَنَاجٍ مُسَلَّمٌ وَمَخْدُوْشٌ مُرْسل وَمَکْدُوْش فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ (بخاری و مسلم)

پھر جہنم پر پل لگایا جائے گا اور شفاعت کی اجازت دی جائے گی اور (تمام انبیاء و رسول) کہیں گے اے اللہ (پل صراط پر سے گزرتے ہوئے لوگوں کو) سلامت رکھ اے اللہ سلامت رکھ، پس مومن اس پر سے اس طرح گزریں گے بعض پلک جھپکنے کی طرح، بعض بجلی کی طرح، بعض ہوا کی طرح بعض پرندے کی طرح، بعض عمدہ گھوڑوں کی طرح اور بعض اونٹوں کی طرح۔ تو بعض صحیح سالم نجات پائیں گے بعض (پل صراط پر جہنم کے کنڈوں سے) زخمی ہو کر چھوٹ جائیں گے اور بعض جہنم میں دھکیل دیئے جائیں گے۔

2- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

یُضْرَبُ الصِّرَاطُ بَیْنَ ظَھْرَانَیْ جَھَنَّمَ فَاَکُوْنُ اَوَّلَ مَنْ یَّجُوْزُ مِنَ الرُّسُلِ بِاُمَّتِہٖ وَلَا یَتَکَلَّمُ یَوْمَئِذٍ اَنَّ ا الرُّسُلُ وَ کَلَامُ الرُّسُلِ یَوْمَئِذٍ اَللّٰھُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ وَفِیْ جَھَنَّمَ کَلَالِیْبُ مِثْلَ شوك السَّعْدَانِ لَا یَعْلَمُ قَدْرَ عِظَمِھَا اِلَّا اللّٰہُ تَخْطِفُ النَّاسَ بِاَعْمَالِھِمْ (بخاری و مسلم)

”جہنم کے دو کناروں کے درمیان (یعنی جہنم کے اوپر) پل لگایا جائے گا تو رسولوں میں سے سب سے پہلے میں ہوں گا اور اپنی امت کے ساتھ اس کو عبور کروں گا۔ اور اس دن صرف رسول ہی کچھ کہہ سکیں گے اور ان کا کلام بھی یہی ہوگا کہ اے اللہ سلامت رکھ اے اللہ سلامت رکھ۔ اور جہنم میں سعدان کے کانٹوں کی شکل کے کنڈے ہوں گے اللہ ہی جانتے ہیں کہ وہ کتنے بڑے ہیں۔ وہ نکل کر پل صراط پر ہی سے لوگوں کو ان کے اعمال کے مطابق اچک لیں گے۔“

فائدہ: 1- پل صراط پر گزرنا صراط مستقیم پر چلنے کی صورت مثالیہ ہے جو دنیا میں صراط مستقیم پر قائم رہا وہ آخرت میں بھی پل صراط سے بسہولت گزر جائے گا اور جس کا قدم یہاں پھسلا اس کا وہاں بھی پھسلے گا۔

2- پل صراط کا راستہ حقیقی راستہ ہے جو محسوس ہوگا اور تمام اہل محشر اس کو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھیں گے ، کوئی خیالی اور مجازی چیز نہیں تمام ادیان حقہ اسی کے مؤید ہیں اور تمام پیغمبروں نے اپنی اپنی امتوں کو پل صراط کے بارے میں اسی طرح خبر دی ہے اور پھر سب نبیوں کے بعد خاتم الانبیاء ﷺ نے پل صراط کے متعلق امت کو اسی طرح خبر دی ہے اور اس کو اس طرح صاف اور واضح بیان فرمایا ہے کہ اس میں کسی تاویل اور شبہ کی گنجائش نہیں۔

باب: 13

عقیدہ شفاعت

عن ابي هريرة قال لما نزلت وانذر عشيرتك الاقربين دعا النبي صلى الله عليه وسلم قرابته فعم وخص فقال يا بني كعب ابن لوي انقذوا انفسكم من النار فاني لا املك لكم من الله شيئا ويا بني مرة بن كعب انقذوا انفسكم من النار فاني لا اغني عنكم من الله شيئا ويا بني عبد شمس انقذوا انفسكم من النار فاني لا اغني عنكم من الله شيئا ويا بني عبد مناف انقذوا انفسكم من النار فاني لا اغني عنكم من الله شيئا ويا بني هاشم انقذوا انفسكم من النار فاني لا اغني عنكم من الله شيئا ويا بني عبدالمطلب انقذوا انفسكم من النار فاني لا اغني عنكم من الله شيئا ويا فاطمة انقذي نفسك من النار سليني ماشئت من مالي فاني اغني من الله شيئا(بخاري ومسلم)

حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا جب آیت وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ (اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ) اتری تو نبی ﷺ نے اپنے رشتے داروں کو بلا کر فرمایا کہ اے اولاد کعب بن لوی اپنی جانوں کو آگ سے بچاؤ میں اللہ کے عذاب سے تمہارے کام نہ آسکوں گا۔ اے اولاد مرہ بن کعب اپنی جانوں کو آگ سے بچاؤ میں اللہ کے عذاب سے تمہارے کام نہ آسکوں گا۔ اے اولاد عبد شمس اپنی جانوں کو آگ سے بچاؤ میں اللہ کے عذاب سے تمہارے کام نہ آسکوں گا۔ اے اولاد عبد مناف اپنی جانوں کو آگ سے بچاؤ میں اللہ کے عذاب سے تمہارے کام نہ آسکوں گا اے اولاد ہاشم اپنے نفسوں کو آگ سے بچاؤ میں اللہ کے عذاب سے تمہارے کام نہ آسکوں گا۔ اے اولاد عبدالمطلب اپنی جانوں کو آگ سے بچاؤ میں اللہ کے عذاب سے تمہارے کام نہ آسکوں گا۔ اے فاطمہ اپنی جان کو عذاب سے بچالے مجھ سے میرا مال مانگ لے جو کچھ تجھے چاہئے کیونکہ میں اللہ کے عذاب سے کام نہیں آؤں گا۔

یعنی جو لوگ کسی بزرگ کے رشتہ دار ہوتے ہیں انہیں بزرگوں کی حمایت کا بھروسہ ہوتا ہے اسی وجہ سے وہ

مغرور ہو کر نڈر ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اللہ پاک نے اپنے محبوب پیغمبر سے فرمایا کہ اپنے رشتے داروں کو ہوشیار کر دیں۔ آپ نے ایک ایک کو یہاں تک کہ اپنی لاڈلی صاحبزادی کو بھی صاف صاف بتا دیا کہ حق قرابت اسی چیز میں ممکن ہے جو انسان کے اختیار میں ہے میرے اختیار میں مال ہے اس کے دینے میں بخل سے کام نہیں لیتا لیکن خدا کے ہاں کا معاملہ میرے اختیار سے باہر ہے وہاں کسی کی بھی حمایت نہیں کر سکتا اور کسی کا بھی وکیل نہیں بن سکتا۔ ہر شخص قیامت کے لئے اپنی اپنی تیاری کر لے اور دوزخ سے بچنے کی آج ہی فکر کر لے معلوم ہوا کہ کسی بزرگ کی فقط رشتہ داری خدا کے ہاں کام آنے والی نہیں جب تک انسان خود نیک عمل نہ کرے بیڑا پار ہونا مشکل ہے۔

عن جبير بن مطعم قال اتى رسول الله صلى الله عليه وسلم اعرابى فقال جهدت الانفس وجاع العيال ونهكت الاموال وهلكت الانعام فاستسق الله لنا فانا نستشفع بك على الله ونستشفع بالله عليك فقال النبى صلى الله عليه وسلم سبحان الله سبحان الله فما زال يسبح حتى عرف ذلك فى وجوه اصحابه ثم قال ويحك انه لا يستشفع بالله على احد شان الله اعظم من ذلك ويحك اتدرى ما الله ان عرشه على سماواته هكذا وقال باصابعه مثل القبة عليه وانه ليئط به اطيط الرحل بالراكب (ابو داؤد)

حضرت جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک دیہاتی نے آ کر کہا لوگ مشقت میں پڑ گئے۔ بچے بھوک سے بلبلا رہے ہیں، اور فصلیں اجڑ گئیں اور جانور ہلاک ہو گئے۔ آپ ہمارے لئے اللہ سے بارش کی دعا مانگیں۔ ہم اللہ کے پاس آپ کو شفیع بنانا چاہتے ہیں اور آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کو شفیع اور سفارشی بنانا چاہتے ہیں فرمایا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ یعنی اللہ نرالا ہے۔ آپ اتنی دیر تک اللہ کی پاکی بیان کرتے رہے کہ صحابہ کے چہروں میں اس کا اثر محسوس ہونے لگا۔ پھر فرمایا نادان اللہ پاک کسی سے سفارش نہیں کرتا اس کی شان اس سے بلند و برتر ہے۔ نادان جانتا ہے اللہ کیا ہے اس کا عرش اس کے آسمانوں پر اس طرح ہے۔ اور انگلیوں سے گنبد کی طرح بنایا اس کی وجہ سے وہ چرچرا رہا ہے جس طرح اونٹ کی کاٹھی سوار کے بوجھ سے چرچراتی ہے۔

یعنی ایک دفعہ عرب میں قحط پڑ گیا۔ بارش بند ہو گئی۔ ایک دیہاتی نے آپ کے پاس آ کر لوگوں کی حالت زار بیان کی اور آپ سے دعا کو کہا اور یہ بھی کہا کہ ہم آپ کی سفارش اللہ کے پاس چاہتے ہیں اور اللہ کی سفارش آپ کے پاس چاہتے ہیں۔ یہ بات سن کر آپ خدا کے رعب اور خوف سے کانپنے لگے اور آپ کی زبان پر خدا کی بڑائی کے کلمات آ گئے حاضرین مجلس کے چہروں پر خدا کی عظمت سے تغیر (تبدیلی) کے آثار پیدا ہو گئے۔

پھر آپ نے اس گنوار کو سمجھایا کہ اختیار تو مالک ہی کا ہے اگر مالک سفارش کی وجہ سے کام کر دے تو اس کی مہربانی ہے۔ جب یہ کہا گیا کہ ہم اللہ کو پیغمبر کے پاس سفارش بنا کر لائے تو گویا مالک ومختار پیغمبر کو بنا دیا گیا حالانکہ یہ شان خدا کی ہے۔ آئندہ اس قسم کا کلمہ زبان سے نہ نکالنا۔ خدا کی شان بہت ہی بڑی ہے تمام انبیاء اور اولیاء اس کے سامنے بے بس ہیں۔ تمام آسمان اور زمین کو اس کا عرش ایک گنبد کی طرح گھیرے ہوئے ہے عرش باوجودیکہ اتنا بڑا ہے مگر پھر بھی اس شہنشاہ کی عظمت کو نہیں سنبھال سکتا اور چرچرا رہا ہے۔ مخلوق کے تصور میں اس کی عظمت نہیں آسکتی اور کوئی اسکی عظمت کو اپنے خیالات سے ادا بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے کام میں دخل دینا اور اس کی عظیم سلطنت میں ہاتھ ڈالنا تو درکنار وہ شہنشاہ بلا فوج اور لشکر کے اور بلا وزیر ومشیر کے ایک آن میں کروڑ ہا کام کر دیتا ہے بھلا وہ کس کے پاس آکر سفارش کر سکتا ہے اور کون اس کے سامنے مختار بن سکتا ہے۔

لوگوں میں ایک ختم مشہور ہے جس میں یہ کلمہ پڑھا جاتا ہے۔ یا شیخ عبدالقادر جیلانی شَیْئاً لِلّٰہِ۔ یعنی اے شیخ اللہ کے واسطے ہماری مراد پوری کرو۔ یہ شرک اور بے ادبی ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اگر چہ بظاہر بے ادبی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن اس سے مراد کچھ اور ہے تو اس کا یہ کہنا خود بے ادبی ہے کیونکہ خدا کی ذات پہیلیوں سے بالاتر ہے۔

شفاعت کی حقیقت

یہاں اس بات کو یاد رکھا جائے کہ عوام انبیاء اور اولیاء کی شفاعت پر نازاں ہیں اور شفاعت کے غلط معنی سمجھ کر اللہ کو بھول گئے ہیں۔ درحقیقت شفاعت کے معنی سفارش کے ہیں۔ دنیا میں سفارش کی کئی صورتیں ہیں مثلاً بادشاہ کی نگاہ میں چور کی چوری ثابت ہو جائے اور کوئی امیر یا وزیر اس کی سفارش کر کے سزا سے بچا لے بادشاہ تو چور کو سزا ہی دینا چاہتا تھا جیسا کہ آئین وقانون ہے مگر امیر سے دب کر اسے چھوڑ دیتا ہے کیونکہ امیر رکن سلطنت ہے اور اس کی وجہ سے سلطنت میں دن رات ترقی ہو رہی ہے بادشاہ یہ خیال کر کے کہ اس امیر کو ناراض نہیں کرنا چاہیے ورنہ حکومت کے نظم ونسق میں گڑ بڑ پیدا ہو جائے گی اور غصے کو پی جانا عین مناسب ہے چور کو معاف فرما دیتا ہے۔ اس قسم کی سفارش کو شفاعت وجاہت کہا جاتا ہے یعنی امیر کی جاہ وعزت کی وجہ سے اس کی بات مانی گئی۔ خدا کے ہاں شفاعت وجاہت قطعی طور پر ناممکن ہے۔ جو شخص کسی غیر اللہ کو اس قسم کا شفیع مان لے وہ قطعی مشرک ہے اور بڑا جاہل ہے۔ اس نے خدا کے معنی سمجھے ہی نہیں، شہنشاہ کی قدر ومنزلت پہچانی ہی نہیں۔ اس شہنشاہ (خداوند (قدوس)) کی قدرت کی تو یہ شان ہے کہ ایک دم میں عرش

سے فرش تک ساری کائنات کو زیروزبر کر دے اور دوسرا عالم پیدا کر دے۔ اس کے تو ارادے ہی سے ہر چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے مادے کی اور سامان کی حاجت ہی نہیں۔ اگر آدم سے لے کر قیامت تک کے تمام انسان اور جن جبرئیل و پیغمبر جیسے ہو جائیں تو ان کی وجہ سے سلطنت میں کچھ بھی رونق نہ بڑھے گی اور اگر سب شیطان و دجال بن جائیں تو اس کی حکومت کی کچھ رونق بھی نہ گھٹے گی وہ ہر حال میں تمام بڑوں کا بڑا اور تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے نہ کوئی اس کا کچھ بگاڑ سکے اور نہ بنا سکے۔

سفارش کی دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شاہزادہ، بیگم یا بادشاہ کا محبوب کھڑا ہو جائے اور چور کو سزا نہ دینے دے۔ بادشاہ اس کی محبت کی وجہ سے اسے ناراض نہ کرنا چاہے اور چور کو معاف فرما دے۔ اس کی سفارش کو شفاعت محبت کہا جاتا ہے۔ بادشاہ نے اس کی محبت سے مجبور ہو کر اس خیال سے کہ محبوب کی ناراضگی سے خود مجھے تکلیف پہنچے گی محبوب کی بات مان لی۔ خدا کے دربار میں یہ بات بھی ناممکن ہے اگر کوئی کسی نبی یا ولی کو اس قسم کا شفیع سمجھے وہ بھی پکا مشرک اور نرا جاہل ہے۔ وہ شہنشاہ اپنے بندوں کو کتنا ہی نوازے۔ کسی کو حبیب، کسی کو کلیم، کسی کو روح اللہ اور کسی کو وجیہ کا خطاب عطا فرمائے اور کسی کو رسول کریم، مکین، روح القدس اور روح الامین کے معزز القاب سے نوازے مگر مالک مالک ہی ہے اور غلام غلام ہی ہے۔ ہر ایک کا ایک مقام ہے جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا۔ غلام جس طرح اس کی رحمت سے متاثر ہو کر مسرت سے جھومتا ہے، اسی طرح اس کی ہیبت سے بھی اس کا پتہ پانی ہوتا ہے۔

سفارش کی تیسری صورت یہ ہے کہ چور کی چوری تو ثابت ہو گئی مگر وہ پیشہ ور چور نہیں ہے بد قسمتی سے اس سے چوری سرزد ہو گئی۔ شرم کے مارے پانی پانی ہے۔ ندامت سے سر جھکا ہوا ہے۔ دن رات سزا کا خوف اسے کھا رہا ہے۔ آئین کی حرمت کو سر اور آنکھوں میں جگہ دیتا ہے اور خود کو سیہ کار، گنہ گار اور سزا کا مستحق سمجھ رہا ہے۔ بادشاہ سے بھاگ کر کسی امیر یا وزیر کی طرف رخ نہیں کرتا۔ اور اس کے مقابلے میں کسی کی حمایت کا قائل نہیں، شب و روز بادشاہی کا منہ تک رہا ہے کہ سرکار عالی کے یہاں سے اس باغی گنہ گار کے لئے کیا سزا تجویز ہوتی ہے۔ بادشاہ کو اس کے حال زار پر ترس آ جاتا ہے، اور اس سے درگزر کرنا چاہتا ہے مگر حرمت آئین کا لحاظ رکھنا چاہتا ہے کہ کہیں قانون کا احترام لوگوں کی نگاہ سے گر نہ جائے۔ اب کوئی امیر یا وزیر بادشاہ کا اشارہ پا کر سفارش کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے بادشاہ اس امیر کی عزت افزائی کے لئے بظاہر اس کی سفارش کا نام کر کے چور کا قصور معاف فرما دیتا ہے۔ امیر نے چور کی اس لئے سفارش نہیں کی کہ وہ اس کا رشتہ دار ہے یا دوست آشنا ہے یا اس کی حمایت کا اس نے ذمہ لے لیا تھا۔ بلکہ محض بادشاہ کی مرضی دیکھ کر سفارش کے لئے کھڑا ہوا ہے۔

اس قسم کی سفارش کو شفاعت بالاذن (اجازت و مرضی سے سفارش) کہا جاتا ہے۔ دربار خداوندی میں اس قسم کی سفارش ہوگی۔ قرآن پاک میں جس نبی یا ولی کی شفاعت کا بیان ہے وہ یہی شفاعت ہے لہٰذا ہر انسان کا فرض ہے کہ اللہ ہی کو پکارے اسی سے ہر وقت ڈرتا رہے۔ اسی سے گناہوں کی معافی مانگتا رہے۔ اسی کے آگے گناہوں کا معترف رہے۔ اسی کو اپنا مالک اور حمایتی سمجھے۔ اللہ کے سوا اپنا کہیں ٹھکانا نہ جانے اور کبھی کسی حمایت پر اعتماد نہ کرے۔ کیونکہ ہمارا رب بڑا ہی معاف کرنے والا اور انتہائی مہربان ہے وہ اپنے فضل و کرم سے سب بگڑے کام بنادے گا، اور اپنی مہربانی سے سارے گناہ معاف فرمادے گا۔ اور جس کو چاہے گا اپنے حکم سے تمہارا شفیع بنادے گا۔

قرآن پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن شفاعت ہوسکتی ہے۔

1۔ یَوۡمَئِذٍ لَّا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوۡلًا (سورہ طٰهٰ :109)

ترجمہ: ’’اس روز سفارش نفع نہ دے گی مگر ایسے شخص کو جس کے واسطے اللہ نے اجازت دے دی ہو اور اس شخص کے واسطے بولنا پسند کرلیا ہو۔‘‘

2۔ وَلَا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا لِمَنۡ اَذِنَ لَهٗ(سورہ سبا :23)

ترجمہ: ’’اور خدا کے سامنے سفارش کسی کے لئے کام نہیں آتی مگر اس کے لئے جس کے لئے اجازت دے دی۔‘‘

3۔ مَنۡ ذَاالَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ (سورہ بقرہ :255)

ترجمہ: ’’ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس شفاعت (سفارش) کرسکے بدون اس کی اجازت کے۔‘‘

بلکہ ان ہی آیات میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن شفاعت ہوگی بھی۔ وہ اس طرح کہ اگر قیامت کے دن شفاعت ہونی ہی نہ ہو تو پھر شفاعت کے نہ ہونے سے یا نفع نہ دینے سے ان لوگوں کو مستثنیٰ نہ کیا جاتا جن کے لئے اللہ تعالیٰ کی اجازت ہوگی یا جن کو شفاعت کرنے کا اذن اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوگا اور یہ استثناء عبث ہوتا۔ لیکن چونکہ قرآن پاک میں کوئی بات عبث نہیں لہٰذا یہ استثناء صرف امکان واحتمال ہی نہیں ہے بلکہ واقع بھی ہوگا۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے

لَا یَمۡلِكُوۡنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنۡدَالرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا (سورہ مریم:87)

’’کوئی سفارش کا اختیار نہ رکھے گا مگر ہاں جس نے رحمان کے پاس اجازت لی ہے۔‘‘

شفاعت کس کے لئے نہ ہوگی

مَا لِلظَّالِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ (سورہ مومن:18)

(ترجمہ: ظالموں کا نہ کوئی ولی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی ہوگا جس کا کہا مانا جائے۔)

اس آیت میں ظالمین سے مراد کفار مشرکین ہیں جیسا کہ ایک آیت میں ہے۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (سورہ لقمان) "بے شک شرک بڑا ظلم ہے"

شفاعت کے لئے ضابطہ

قرآن پاک میں کافروں مشرکوں کے بارے میں فرمایا

وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَالَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ وَیَقُوْلُوْنَ ھٰؤُلَآءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَاللّٰہِ (سورہ یونس:18)

"یعنی یہ لوگ اللہ کی توحید کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو عبادت نہ کرنے کی صورت میں (ان کو ضرر نہ پہنچا سکیں اور عبادت کرنے کی صورت میں ان کو نفع نہ پہنچا سکیں اور) اپنی طرف سے ایک نفع کا اختراع کر کے (کہتے ہیں کہ یہ معبود اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں) اس لئے ہم ان کی عبادت کرتے ہیں۔"

سورہ زمر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ شُفَعَاءَ قُلْ اَوَلَوْ کَانُوْا لَا یَمْلِکُوْنَ شَیْئًا وَلَا یَعْقِلُوْنَ قُلْ لِلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیْعًا (سورہ زمر:43,44)

یعنی کیا توحید کے دلائل کے قائم ہونے کے باوجود ان مشرک لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو معبود قرار دے رکھا ہے جو ان کی سفارش کریں گے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اگرچہ یہ مزعوم سفارشی کچھ بھی قدرت نہ رکھتے ہوں اور کچھ بھی علم نہ رکھتے ہوں کیا پھر بھی ان کو شفیع وسفارشی ہی سمجھے جائیں گے۔ یعنی شفاعت وسفارش کرنے کے لئے کم از کم علم وقدرت تو درکار ہے جو ان میں بوجہ جماد و پتھر ہونے کے مفقود ہے۔

اور چونکہ یہ احتمال موجود ہے کہ کوئی مشرک کہے کہ یہ جمادات اور مورتیاں فی نفسہ سفارشی نہیں بلکہ جن ہستیوں کی یہ مورتیاں ہیں وہ درحقیقت سفارشی ہیں اور وہ ذی روح بھی تھے اور ان میں علم وقدرت دونوں ہیں۔ اس لئے آگے اس کا جواب دیا کہ آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ سفارش تو تمام تر خدا ہی کے اختیار میں ہے کہ

اس کے اذن کے بغیر کسی کی مجال نہیں کہ سفارش کر سکے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی سفارش وشفاعت نہیں کر سکتا۔ اوراذن کے لئے دو شرطیں ہیں ایک سفارش کرنے والے کا اللہ کے ہاں مقبول ہونا اور دوسرے جس کی سفارش کی جائے اس کا قابل مغفرت ہونا۔

اوراس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں شفاعت کی نفی ہے مثلاً:

يَـآ اَيُّهَـا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنَا كُمۡ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِیَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ (سورہ بقرہ :254)

”اے ایمان والوں خرچ کروان چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں قبل اس کے وہ دن آجائے جس میں نہ تو خرید وفروخت ہوگی اور نہ دوستی ہوگی اور نہ کوئی سفارش ہوگی۔“

تواس سے وہ شفاعت مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر ہو۔

فائدہ: جاننا چاہئے کہ حضور ﷺ کی متعدد مقامات پر مختلف شفاعتیں ہوں گی پہلی شفاعت جس کو شفاعت کبریٰ کہتے ہیں، یہ مقام محمود سے ہوگی جس پر اللہ تعالیٰ آپ کو فائز کریں گے۔ یہ شفاعت میدان حشر کی شدت اور دہشت کی تخفیف اور حساب وکتاب شروع ہونے کے لئے ہوگی۔ دوسری شفاعت حساب اور سوال میں سہولت ہو جانے کے لئے ہوگی کہ ان کو حساب کے بغیر ہی جنت میں داخل کیا جائے۔ تیسری شفاعت بعض گنہگاروں پر عذاب کا حکم جاری ہونے کے بعد فرمائیں گے کہ ان کا قصور معاف کر دیا جائے اور جہنم میں نہ ڈالا جائے۔ چوتھی شفاعت بعض گناہگار جو جہنم میں داخل ہوں گے ان کو دوزخ سے نکالنے کی شفاعت فرمائیں گے۔ پانچویں شفاعت بعض اہل ایمان کے درجے بلند ہونے کے لئے فرمائیں گے کہ اس مومن کو اس سے بڑھ کر درجہ دے دیا جائے۔

یہ شفاعت کی پانچ قسمیں ہوئیں جو احادیث سے ثابت ہیں اور سب حق ہیں۔

شفاعت کون کرے گا

انبیاء، علماء، شہدا، فرشتے اور نیک مسلمان بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت کریں گے۔

عن عثمان بن عفان قال قال رسول الله يشفع يوم القيامة ثلاثة الانبياء ثم العلماء ثم الشهداء (ابن ماجه)

”حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ا نے فرمایا قیامت کے دن تین طرح کے لوگ (خصوصیت سے) شفاعت کریں گے۔ انبیاء (اہل حق و باعمل) علماء اور شہداء۔“

2- وفى حديث فيقول الله شفعت الملائكة و شفع النبيون و شفع المومنون ولم يبق الا ارحم الراحمين ...... (بخارى و مسلم)

”ایک حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے فرشتے بھی شفاعت کر چکے اور انبیاء بھی شفاعت کر چکے اور مومنین بھی شفاعت کر چکے۔ اب صرف ارحم الراحمین کی باری باقی رہ گئی ہے...... الخ“

عن انس قال قال رسول الله ﷺ يصف اهل النار فيمر بهم الرجل من اهل الجنة فيقول الرجل منهم يا فلان اما تعرفنى انا الذى سقيتك شربة و قال بعضهم انا الذى و هبت لك وضوء فيشفع له فيد خله الجنة (ابن ماجه)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (آخرت میں مسلمان) اہل دوزخ صف باندھے کھڑے ہوں گے۔ جنت کا مستحق ایک شخص ان کے پاس سے گزرے گا تو ان میں سے ایک اس سے کہے گا کہ کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟ میں نے ایک دفعہ تمہیں پانی پلایا تھا اور کوئی کہے گا میں نے ایک دفعہ تمہیں وضو کے لئے پانی دیا تھا۔ تو وہ جنتی شخص اس کے لئے سفارش کرے گا اور اس کو جنت میں داخل کروائے گا۔

باب: 14

جنت و دوزخ

عقیدہ

جنت اور جہنم حق ہے اور جنت کا ثواب اور عیش و آرام اور دوزخ کا عذاب سب حق ہے۔ تمام جسمانی اور روحانی لذتیں اور راحتیں اہل جنت کو میسر ہوں گی اور تمام جسمانی اور روحانی مصیبتیں اہل جہنم کو حاصل ہوں گی۔

عقیدہ

جنت اور دوزخ دونوں پیدا ہو چکی ہیں اور فی الحال موجود ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

1۔ وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (آل عمران:133)

''اور دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور جنت کی طرف جس کی وسعت ایسی ہے جیسے سب آسمان اور زمین وہ تیار کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے۔''

2۔ وَاتَّقُوْا النَّارَالَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْکَافِرِیْنَ (سورہ آل عمران: 131)

''اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔''

ان آیات کی رو سے جب جنت اور دوزخ تیار شدہ ہیں تو ان کا فی الحال موجود ہونا بھی ثابت ہوا۔

3۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی (سورہ نجم 13-15)

''اور انہوں نے اس فرشتہ کو ایک اور دفعہ بھی دیکھا ہے سدرۃ المنتہٰی کے پاس اس کے قریب جنت الماوی ہے۔''

اس آیت سے بھی واضح ہوا کہ جنت فی الحال موجود ہے۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ہے:

1 حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قال تعالیٰ اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر

’’اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی بشر کے دل میں ان کا خیال بھی گزرا۔‘‘

2- رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمایا۔

اشتکت النار الی ربھا فقالت رب اکل بعضی بعضا فاذن لھا بنفسین نفس فی الشتاء ونفس فی الصیف فھو اشد ماتجدون من الحر واشد ما تجدون من الزمھریر۔

جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی کہ شدت کی وجہ سے میرا ایک حصہ دوسرے حصہ کو کھا رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو دو سانس لینے کی اجازت دی ایک سردی میں اور ایک گرمی میں۔ انتہائی تپش اور انتہائی ٹھنڈا جو تم پاتے ہو وہ اسی کا اثر ہے۔

بعض معتزلہ اس بات کے قائل ہوئے کہ جنت اور دوزخ قیامت کے دن پیدا کی جائیں گی۔ ان کی ایک دلیل یہ آیت ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا (سورہ قصص:83)

اس آیت میں **نجعلها** کا مطلب انہوں نے یہ لیا کہ ہم پیدا کریں گے۔ اس کے مطابق آیت کا ترجمہ یہ ہوا یہ دار آخرت (یعنی جنت) ہم اس کو پیدا کریں گے ان لوگوں کے لئے جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ **نجعلها** کا جو مطلب معتزلہ نے لیا ہے وہ حتمی نہیں ہے بلکہ یہ لفظ کسی کے لئے خاص کر دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا (سورہ انعام:136)

’’اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مویشی پیدا کئے ہیں ان لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ کے لئے خاص کیا۔‘‘

لہٰذا مذکورہ بالا آیتوں کی روشنی میں اس آیت کا صحیح ترجمہ یوں ہے۔

”یہ عالم آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص کریں گے جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔“

معتزلہ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ قرآن پاک میں ہے اُكُلُهَا دَائِمٌ (سورہ رعد: 35) اس کا پھل دائم رہے گا۔

اگر جنت فی الحال موجود ہوتی تو ضروری ہے کہ اس کے پھل ہمیشہ اور دائمی رہیں کبھی ہلاک نہ ہوں حالانکہ قرآن پاک میں یہ بھی ہے كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (سورہ قصص: 88) یعنی سوائے اللہ کی ذات کے ہر شے ہلاک ہونے والی ہے جس میں جنت کے پھل بھی شامل ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ پھلوں کے دائم رہنے سے مراد یہ ہے کہ ان کی نوع باقی رہے گی گو بعض فنا ہو جائیں یعنی اگر ایک بار میوہ کھالیا دوسرا اس کی جگہ درخت پر اور لگ جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوگا کہ جنتیوں کے استعمال سے پھل ختم اور فنا ہو جائیں گے بلکہ ان کی جگہ اور لگتے چلے جائیں گے۔ تو اس آیت میں اس وقت کا دوام مراد ہے جب ان پھلوں کا استعمال ہوگا اور ایسا نیک لوگوں کے جنت میں داخلے کے بعد ہوگا علاوہ ازیں كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ میں ہر ہر شے کے لئے مکمل فنا اور دائمی ہلاکت مراد نہیں ہے بلکہ بعض کے لئے وقتی ہلاکت مراد ہے جیسے انسان کے لئے۔ اس کو فنا نہیں کہتے اور وقتی ہلاکت دوام کے منافی نہیں ہے۔

عقیدہ

جنت اور جہنم دونوں دائمی ہیں ان کو کبھی فنا نہیں کیا جائے گا ان کی نعمتیں اور ان کا عذاب بھی دائمی ہے۔

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر فرمایا کہ مومن جنت میں اور کافر جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا۔

کافروں کے بارے میں فرمایا:

لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا (سورہ فاطر: 36)

”یعنی نہ تو ان کی قضا آئے گی کہ مر ہی جائیں اور نہ ہی دوزخ کا عذاب ان سے ہلکا کیا جائے گا۔“

مسلم کی ایک حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

(اذا دخل اهل الجنة الجنة) ینادی مناد ان لکم ان تحیوا فلا تموتوا ابدا

”جب تمام اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا کہ تم ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی بھی تمہیں موت نہیں آئے گی۔“

اس موقع پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں وہ اور ان کے جواب لکھے جاتے ہیں۔

پہلا سوال: کافر نے کفر تو ایک قلیل مدت میں کیا یعنی اپنی حیات دنیوی میں لیکن اس کو سزا ہمیشہ ہمیش کی ملے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: کافر اپنی دنیوی زندگی میں اپنے کفر پر پختہ ہوتا ہے اور جیسے مسلمان اپنے عقیدے میں پختہ ہوتا ہے اور یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اگر دنیا میں ہمیشہ ہمیش کا رہنا بھی ہو تب بھی اپنے عقیدے کو ترک نہیں کروں گا اسی طرح کافر کا بھی یہ عزم ہوتا ہے کہ اگر اسے ہمیشہ ہمیش دنیا میں رہنا پڑے تو وہ اپنے عقیدے پر ہی رہے گا۔ اس عزم اور اعتقاد پر جب مسلمان اور کافر کو موت آئی اور آخرت میں اعتبار موت اور خاتمہ کے وقت کا ہی ہوتا ہے تو آخرت میں کافر کو جو جہنم کی ابدی اور دائمی سزا ملے گی وہ کفر دائمی کے اعتقاد کے سبب ملے گی۔

دوسرا سوال: عقوبت اور سزا کی غرض انزجار (یعنی گناہ سے روک) ہوتی ہے تاکہ خطا کار سزا بھگت کر ڈر جائے اور آئندہ کے لئے تائب ہو کر اس گناہ سے رک جانے کا ہمیشہ سے عزم کر لے اور ظاہر ہے کہ جب اہل جہنم کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا تو ایسے سخت عذاب سے بڑھ کر مجرم کے لئے ڈراوا اور گناہ وکفر سے روک اور کس چیز سے ہو سکتی ہے اور توبہ کا باعث اس سے بڑھ کر اور کونسی سزا ہو سکتی ہے۔ اسی لئے مجرم فوراً توبہ پر آجائیں گے اور آئندہ کے لئے پختگی سے کفر سے باز رہنے کا وعدہ کریں گے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔

1۔ رَبَّنَا اَخرِجنَا مِنهَا فَاِنْ عُدنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ (سورہ مومنون:107)

’’اے ہمارے رب ہم کو اس (جہنم) سے (اب) نکال دیجئے پھر اگر ہم دوبارہ (ایسا کریں) تو بے شک ہم پورے قصوروار ہیں۔‘‘

2۔ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيهَا رَبَّنَا اَخرِجنَا مِنهَا نَعمَلْ صَالِحًا غَيرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعمَلُ (سورہ فاطر:37)

’’اور وہ لوگ اس (دوزخ) میں چلائیں گے کہ اے ہمارے رب ہم کو (یہاں سے) نکال لیجئے (اب خوب) اچھے (اچھے) کام کریں گے برخلاف ان کاموں کے جو کیا کرتے تھے۔‘‘

3۔ وَلَوْتَرٰٓی اِذِ الْمُجرِمُوْنَ نَاكِسُوا رُؤُوْسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا اَبصَرنَا وَسَمِعنَا فَارجِعنَا نَعمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ (سورہ سجدہ :12)

اور اگر آپ دیکھیں (تو عجب حال دیکھیں) جب کہ یہ مجرم لوگ اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوں گے کہ اے ہمارے رب بس ہماری آنکھیں اور کان کھل گئے سو ہم کو پھر بھیج دیجئے ہم نیک کام کریں گے ہم کو

پورا یقین آ گیا۔

پس چونکہ عقوبت اور سزا کی غرض پوری ہوگئی اور مجرموں نے توبہ بھی کر لی اور آئندہ کفر سے بچنے کا پختہ وعدہ بھی کر لیا تو اب کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ پھر بھی اس عذاب کو باقی رکھا جائے۔

جواب: سزا و عذاب یا خوف عذاب کی حالت میں مجرموں کے وعدے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک حقیقی وعدہ جو دل سے ہوتا ہے اور جس میں گناہ سے بچنے کا واقعی عزم ہوتا ہے دوسرا دفع الوقتی ہوتا ہے یعنی دل میں گناہ چھوڑنے کا حقیقی عزم نہ ہو صرف سزا و مصیبت سے رہائی پانے کے لئے جھوٹا وعدہ کیا جائے اس مصلحت سے اس وقت تو جان بچا لینی چاہیئے آئندہ دیکھا جائے گا۔

جہنم میں سزا پانے والے کافروں کے یہ وعدے دوسری قسم کے ہوں گے جو محض جھوٹ اور وقت گزاری کے لئے ہوں گے۔ اسی لئے خود قرآن پاک میں ان کی اس دفع الوقتی (وقت گزاری) اور کذب بیان کی تصریح صاف الفاظ میں موجود ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ☆ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ

(سورہ انعام:27-28)۔

اور اگر آپ اس وقت دیکھیں جب کہ یہ دوزخ کے پاس کھڑے کئے جائیں گے تو کہیں گے ہائے کیا اچھی بات ہو کہ ہم پھر واپس بھیج دیئے جائیں اور اگر ایسا ہو جائے تو ہم اپنے رب کی آیات کو جھوٹا نہ کہیں اور ہم ایمان والوں میں سے ہو جائیں بلکہ جس چیز کو اس سے قبل چھپایا کرتے تھے وہ سامنے آ گئی ہے۔ (یعنی وہ عذاب جس کی وعید ان کو کفر و تکذیب پر دنیا میں سنائی جاتی تھی اور جس کا وہ انکار کرتے تھے وہ سامنے آ گیا ہے) اور اگر یہ لوگ پھر واپس بھیج دیئے جائیں تب بھی وہ یہی کام کریں جس سے ان کو منع کیا گیا تھا اور یقیناً یہ بالکل جھوٹے ہیں۔

اگر سوال کیا جائے کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس وقت گناہ سے بچنے کا عزم نہ ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ آیت میں یہ الفاظ اِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ (یقیناً یہ بالکل جھوٹے ہیں) اس کی دلیل ہے۔ کیونکہ اپنے اختیار کے کاموں میں آئندہ کے وعدے کے سچے یا جھوٹے ہونے کا مدار پختہ ارادہ یعنی عزم ہونے نہ ہونے پر ہی تو ہے اگر عزم ہوگا تو وعدہ سچا ہے اور اگر عزم نہ ہوگا تو وعدہ جھوٹا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ یہ جھوٹے ہیں تو معلوم ہو گیا کہ جھوٹا وعدہ تھا یعنی ان کا عزم نہ تھا اور وعدہ دل سے نہیں کیا تھا بلکہ صرف زبان سے جھوٹ کہہ دیا۔

اگر سوال کیا جائے کہ آخرت میں عذاب دیکھنے کے بعد دنیا میں اس کا کفر کیسے ممکن ہوسکتا ہے کیونکہ دنیا میں تو کفر کہتے ہیں حق کے خلاف عقیدہ رکھنے کو اور دوزخ کے پاس کھڑے ہو کر جب کفر کا عذاب آنکھوں سے دیکھ لیا تو اس کے خلاف کا اعتقاد دل میں کیسے آ سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ کفر صرف یہی نہیں ہے کہ حق کے خلاف اعتقاد رکھے بلکہ حق کا یقین ہوتے ہوئے بھی پھر اس کو نہ ماننا یہ بھی کفر ہوتا ہے بلکہ یہ کفر کی زیادہ سخت قسم ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا (سورہ نمل:14)

”(اور غضب یہ تھا کہ فرعون اور اس کے لوگ) ظلم اور تکبر کی راہ سے ان (معجزات) کے بالکل منکر ہی ہو گئے حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا۔“

اور اس پر تعجب نہ کیا جائے کہ ایسے شدید وقت میں جھوٹ کیونکر ممکن ہے؟

کیونکہ بدطینت لوگوں کا فساد ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ہولناک دن میں اور بھی جھوٹ بولیں گے قرآن پاک میں ہے

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ (سورہ انعام:23)

”پھر ان کے شرک کا انجام اس کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوگا کہ وہ یوں کہیں گے کہ قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی ہم مشرک نہ تھے۔ ذرا دیکھو تو کس طرح جھوٹ بولا اپنی جانوں پر۔“

مگر طینت و طبع کا فساد ان کے لئے عذر نہ ہوگا کیونکہ اس سے یہ نہیں ہوتا کہ آدمی میں قدرت و اختیار ہی باقی نہ رہے۔

عقیدہ

مومن فاسق یعنی گنہگار مسلمان کو اگر اللہ تعالیٰ جہنم میں بھیجیں گے تو وہاں اس کا رہنا دائمی نہ ہوگا بلکہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر جہنم سے نکال لیا جائے گا اور جنت میں داخل کر دیا جائے گا کیونکہ ایمان بھی ایک عمل ہے خواہ وہ کتنا ہی کمزور ہو۔ اور یہ ضابطہ ہے کہ ایمان کی جزا دائمی جنت ہے اس لئے جہنم سے نکال کر تو جنت میں داخل کیا جا سکتا ہے لیکن جنت سے نکال کر جہنم میں داخل نہیں کیا جاتا۔ مَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ (جو شخص جہنم کی آگ سے دور کیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ کامیاب ہو گیا) لٰہذا گنہگار مسلمانوں کو اگر جہنم کی سزا ہوئی تو سزا بھگتنے کے بعد ان کو وہاں سے نکال لیا جائے گا اور جنت میں دائمی داخلہ

عطا کیا جائے گا۔ ان میں ایسے بھی ہوں گے جن کے پاس سوائے ایمان کے کوئی اور نیک عمل بالکل نہ ہوگا حدیث میں ان کے بارے میں یہ الفاظ ہیں لَمْ یَعْمَلْ خَیْرًا قَطُّ (ایمان کے علاوہ کبھی کوئی اور نیک عمل انہوں نے کیا ہی نہیں ہوگا)۔

عقیدہ

اعراف حق ہے۔ اعراف اس مقام کا نام ہے جو جنت اور دوزخ کے درمیان ہوگا اس میں نہ جنت جیسی راحت ہوگی اور نہ دوزخ جیسی مصیبت ہوگی مگر یہ مقام دائمی نہیں۔ اس پر جو لوگ ہوں گے وہ اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کو دیکھیں گے اور ان سے کلام کریں گے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: وَبَیْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَی الْاَعْرَافِ رِجَالٌ یَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِیْمَاهُمْ یعنی جنت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہوگی جس کا نام اعراف ہے اس پر کچھ لوگ ہوں گے جو سب کو ان کے چہروں کی علامت سے پہچان لیں گے کہ یہ دوزخی ہے یا جنتی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ قیامت کے دن آدمی تین قسم کے ہوں گے۔ ایک وہ ہوں گے کہ جن کی نیکی ان کی بدی پر غالب ہوگی انہیں جنت میں جانے کا حکم ہوجائے گا دوسرے وہ جن کی بدی ان کی نیکی پر غالب ہوگی انہیں دوزخ میں جانے کا حکم ہوگا اور تیسرے وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکی اور بدی برابر ہوگی ان کو مقام اعراف میں ٹھہرنے کا حکم ہوگا۔ یہ اہل جنت کو دیکھ کر جنت میں جانے کی طمع کریں گے اور دوزخیوں کو دیکھ کر ڈریں گے اور ان کے حال سے پناہ مانگیں گے۔ مگر اللہ کے فضل پر نظر لگائے ہوئے ہوں گے اور اسی طمع میں ہوں گے۔ یہاں تک کہ جب اللہ کو منظور ہوگا تو ان کی خطائیں معاف کر کے ان کو جنت میں داخل ہونے کا حکم دے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمْ وَلَا اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (سورہ اعراف:49) اہل اعراف کو حکم ہوگا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ اب تم پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ کچھ غم۔

عقیدہ: آخرت میں دیدار الٰہی

آخرت میں اہل ایمان کا اپنی ظاہری آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو بے چون و چگون (یعنی بغیر کیفیت کے) اور بے جہت اور بے مثال دیکھنا حق ہے قرآن پاک میں ہے۔

وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (سورہ قیامہ:23)

آخرت میں بہت سے چہرے تر و تازہ ہوں گے اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھنے والے ہوں گے۔

2 احادیث متواترہ سے بھی آخرت میں دیدار الٰہی کا ثبوت قطعی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **هل تضامون فی رؤیة القمر لیلة البدر لیس بینکم وبینه سحاب کذلك ترون ربکم۔**

’’کیا تم چودہویں رات کو چاند دیکھنے میں مشقت محسوس کرتے ہو جب کہ تمہارے اور چاند کے درمیان کوئی بادل حائل نہ ہو؟ ایسے ہی تم اپنے رب کو دیکھو گے۔‘‘

اس کو اکیس اکابر صحابہ نے روایت کیا وہ یہ ہیں عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، صہیب، انس، ابوموسیٰ اشعری، ابوہریرہ، ابوسعید خدری، عمار بن یاسر، جابر بن عبداللہ، معاذ بن جبل، ثوبان، عمار بن رویبہ ثقفی، حذیفہ ابوبکر صدیق، زید بن ثابت، جریر بن عبداللہ بجلی، ابوامامہ باہلی، بریدہ اسلمی، ابوبرزہ، عبداللہ بن حارث بن جزء زبیدی رضی اللہ عنہم۔ ان کے علاوہ اور صحابہ سے بھی یہ مضمون وارد ہے مثلاً ابورزین عقیلی، عبادہ بن صامت، کعب بن عجرہ، فضالہ بن عبید، ابی بن کعب اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وعنہم۔

اکثر معتزلہ اور خوارج اور روافض کی بعض جماعتیں اہلسنت کے خلاف آخرت میں دیدار الٰہی کی منکر ہیں ذیل میں ہم ان کے دلائل اور ان کے جواب تحریر کرتے ہیں۔

1- حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی

رَبِّ اَرِنِیۡ اَنۡظُرۡ اِلَیۡكَ (سورہ اعراف:143)

’’اے میرے پروردگار اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں۔‘‘

تو جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَنۡ تَرَانِیۡ تم مجھ کو ہر گز نہیں دیکھ سکتے

جواب: اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کسی کو موت سے پہلے دیدار خداوندی کا شرف حاصل ہونا شرعاً محال ہے البتہ عقلاً ممکن ہے کیونکہ اگر امکان عقلی بھی نہ مانا جائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی نسبت یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک محال عقلی کی درخواست کرتے۔ اہل السنۃ والجماعت کا یہی مذہب ہے کہ دیدار الٰہی دنیا میں عقلا ممکن ہے شرعاً اس کا وقوع محال ہے اور آخرت میں اس کا وقوع قطعی نصوص سے ثابت ہے۔

پھر اسی آیت میں آگے دنیا میں دیدار الٰہی کے وقوع کے محال ہونے کی دلیل بیان فرمائی:

وَلٰکِنِ انۡظُرۡ اِلَی الۡجَبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَکَانَهٗ فَسَوۡفَ تَرَانِیۡ

(سورہ اعراف :143)

’’لیکن تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو سو اگر یہ اپنی جگہ پر برقرار رہا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔‘‘

یعنی تم پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو ہم اپنے جمال کی ایک جھلک اس پر ڈالتے ہیں۔ اگر پہاڑ جیسی سخت اور مضبوط چیز اس کو برداشت کرسکی تو ممکن ہے تم کو بھی اس کا تحمل کرا دیا جائے ورنہ سمجھ لیجئے کہ جس چیز کا تحمل پہاڑ سے نہ ہو سکے کسی انسان کی مادی ترکیب اور جسمانی آنکھیں اسے کیسے برداشت کر سکتی ہیں۔ آگے فرمایا:

فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوۡسٰی صَعِقًا

(سورہ اعراف :143)

پس ان کے رب نے جو اس پر تجلی فرمائی تجلی نے اس کے پرخچے اڑا دیئے اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے

حق تعالیٰ کی تجلیات بہت طرح کی ہیں اور یہ خدا کا ارادی فعل ہے کہ جس چیز پر جس طرح چاہے تجلی فرمائے۔ پہاڑ پر جو تجلی فرمائی اس نے آناً فاناً پہاڑ کے خاص حصہ کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام چونکہ محل تجلی سے قریب تھے ان پر اس قرب محل اور پہاڑ کے ہیبت ناک منظر دیکھنے کا یہ اثر ہوا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس دنیا کی مادی اعتبار سے بڑی مضبوط سے مضبوط چیز اللہ تعالیٰ کی ایک جھلک کا تحمل نہیں کر سکتی تو انسان کی دنیوی آنکھ اس کا تحمل کیونکر کر سکتی ہے جو کہ مادی اعتبار سے بہت کمزور بھی ہے۔ اسی وجہ سے دنیا میں دیدار الٰہی کا وقوع محال ہے۔

تنبیہ: قلبی اور روحانی طاقت کے اعتبار سے زمین، آسمان، پہاڑ، سب چیزوں سے انسان فائق ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وحی الٰہی کے حامل تھے بلکہ دوسرے انسان بھی جس امانت عظیمہ کے حامل ہیں پہاڑ وغیرہ اس کے اٹھانے پر قادر نہیں۔

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ (سورہ احزاب:72)

’’ہم نے یہ امانت (یعنی اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنا) آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی سو انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔‘‘

لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ (سورہ حشر : 21)

’’اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تو اس کو دیکھتا کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا۔‘‘

تاہم جس چیز کا تعلق ظاہری آنکھوں یا بدن کی مادی قوت سے ہو اس میں انسان دوسری عظیم الخلقت چیزوں سے بہت کمزور واقع ہوا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَکْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (سوره مومن:57)

’’البتہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا بڑا ہے لوگوں کو پیدا کرنے سے لیکن بہت لوگ نہیں سمجھتے۔‘‘

خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (سوره نساء)

’’انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔‘‘

منکرین دیدار الٰہی کی دوسری دلیل

قرآن پاک میں ہے

لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (سوره انعام:103)

’’یعنی انسانی نگاہیں اللہ کا ادراک نہیں کرسکتیں اور اللہ ہی سب نگاہوں کا ادراک کرتا ہے۔ اس آیت سے مفہوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا جا سکتا۔‘‘

جواب: ادراک کا معنی لغت میں دیکھنے کے نہیں ہے بلکہ احاطہ کرنے اور گھیر لینے اور انتہا تک پہنچنے کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں آتا ہے۔

قَالَ اَصْحَابُ مُوْسٰی اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ (سوره شعراء61)

’’کہا موسیٰ کے لوگوں نے ہم تو گھیرے گئے (کہ آگے سمندر ہے اور پیچھے دشمن ہے)۔‘‘

یعنی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا ہم تو پکڑے گئے (کیونکہ دشمن ہم تک پہنچ گیا ہے اور اس نے ہمیں گھیر لیا ہے)۔

تو مطلب یہ ہوا کہ نگاہیں کبھی اس کا احاطہ نہیں کرسکتیں اور نہ اس کی انتہا کو پا سکتی ہیں۔ اور آخرت میں دیدار ہوگا لیکن احاطہ نہیں ہوگا۔ ہاں اس کی شان یہ ہے کہ وہ تمام نگاہوں اور دیکھی جانے والی چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

باب: 15

عقائد متعلقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

عقیدہ

امام طحاویؒ عقیدہ طحاویہ میں فرماتے ہیں:

ونحب اصحاب رسول الله ﷺ ولا نفرط فی حب احد منهم ولا نتبرا من احد منهم نبغض من يبغضهم وبغير الخير يذكرهم ولا نذكرهم الا بالخير وحبهم دين وايمان واحسان وبغضهم كفر ونفاق وطغيان

ہم رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے محبت رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کی محبت میں بھی کمی نہیں کرتے اور کسی صحابی سے اظہار بیزاری نہیں کرتے اور جو ان سے بغض رکھے اور انکا ذکر ناحق طریقے سے کرے ہم اس سے بغض رکھتے ہیں اور صحابہ کا ذکر فقط خیر اور بھلائی کے ساتھ کرتے ہیں ان کی محبت دین اور ایمان اور احسان ہے اور صحابہ سے بغض اور نفرت کفر ہے (یعنی جب ان کے ساتھ بغض کے باعث آدمی قرآن میں تحریف کا قول کرنے لگے یا قرآن کی تصریحات کی مخالفت کرنے لگے مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان باندھے) اور (اگر صرف بغض ہی پر رہے قران میں تحریف نہ کرے اور اس کی تصریحات کی مخالفت نہ کرے تو) نفاق عملی اور فسق وسرکشی ہے۔

جس طرح حضور ﷺ تمام انبیاء سے بہتر اور افضل ہیں اسی طرح حضور ﷺ کی امت تمام امتوں سے افضل اور بہتر ہے۔ کُنتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ (سورہ آل عمران:110) قرآن کریم کی نص صریح ہے اور تمام امت میں سب سے افضل اور بہتر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے۔ اس لئے تمام اہل سنت و جماعت کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ تمام انسانوں میں انبیاء کرام کے بعد صحابہ کرام کا درجہ اور مرتبہ ہے۔ وہ بلاشبہ مومن کامل اور صحیح اسلام والے تھے۔ معاذ اللہ وہ منافق نہ تھے۔ ان کا خاتمہ ایمان واسلام پر ہوا۔ قیامت تک کوئی

شخص ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ جس طرح کوئی ولی نبی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا اسی طرح کوئی ولی صحابہ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اپنی سبقت اسلام اور جانی و مالی قربانیوں اور رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور غزوات میں شرکت اور علم وفہم کے اعتبار سے مختلف درجوں والے ہیں۔ ان کے دو بنیادی درجے یہ ہیں:

1- وہ حضرات جن کو نبی ﷺ کی خاصی حد تک صحبت میسر آئی اور وہ آپ کے ساتھ غزوات میں بھی شریک ہوئے۔

قرآن وحدیث میں ان کی بڑی تعریفیں اور ان کے لئے بڑی بشارتیں وارد ہوئی ہیں مثلاً:

i- وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَداً (سورہ توبہ: 100)

”اور جو پہلے سبقت کرنے والے ہیں مہاجرین اور انصار میں سے اور جنہوں نے ان کا اتباع کیا خوبی کے ساتھ اللہ راضی ہوا ان سب سے اور وہ راضی ہوئے اللہ سے۔ اور (اللہ نے) تیار کئے ہیں ان کے لئے باغات بہتی ہیں جن کے نیچے نہریں رہیں گے وہ ان میں ہمیشہ“

ii- لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (سورہ توبہ: 88)

”لیکن رسول اور وہ لوگ جو ایمان لائے ان کے ساتھ (انہوں نے) جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اور ان کے لئے خوبیاں ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔“

iii- لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ (سورہ فتح: 18)

بلاشبہ راضی ہو گیا اللہ مومنین سے جب انہوں نے بیعت (رضوان) کی آپ کے ہاتھ پر درخت کے نیچے (صلح حدیبیہ کے موقع پر) اور جان لیا اللہ نے جو (خالص ایمان ویقین اور اخلاص) ان کے دلوں میں ہے (اس کا حاصل یہ ہے کہ ان میں نفاق اور تقیہ کا ذرہ برابر بھی شائبہ نہ تھا)

2- وہ حضرات جن کو بہت کم صحبت میسر آئی یا ان کو ایمان کی حالت میں نبی ﷺ کی صرف زیارت نصیب ہوئی اور پھر موت تک وہ ایمان پر رہے۔ ان لوگوں کا درجہ بھی کسی بھی غیر صحابی ولی سے بڑا ہے۔

عن عمران بن حصين قال قال رسول الله ﷺ خير امتى قرنى ثم الذين يلونهم ثم الذين

یلونھم (بخاری و مسلم)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سب سے بہتر میرے زمانے والے ہیں (کہ جنہوں نے مجھے پایا اور مجھ پر ایمان لائے) پھر وہ جوان کے پیچھے ہیں (یعنی تابعین) اور پھر وہ جوان کے پیچھے ہیں (یعنی تبع تابعین)۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خصوصیات

1- اللہ تعالیٰ نے ان کے رسول اللہ ﷺ کے متبع اور پیروکار ہونے کا آپ ﷺ سے کہلوایا اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔

قُلۡ هٰذِهٖ سَبِيۡلِىۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىۡ

(سورہ یوسف :108)

”کہہ دو یہ میری راہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جنہوں نے میری پیروی کی۔“

اور جو رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرتا ہے وہ اللہ کا محبوب ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ (سورہ آل عمران:31)

”کہہ دو اگر تم اللہ کے ساتھ محبت کے مدعی ہو (اور اللہ کی محبت چاہتے ہو) تو میری اتباع کرو (نتیجہ میں) اللہ تم سے محبت کرے گا۔“

2- i- وہ کفار پر بڑے سخت اور آپس میں بڑے مہربان ہیں۔

ii- وہ بڑے عبادت گزار ہیں اور محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے طلبگار ہیں۔

iii- ان کی مدح وستائش تورات اور انجیل میں بھی وارد ہوئی ہے۔

iv- یہ کفار کے جلاپے کا سبب ہیں۔

v- اللہ تعالیٰ نے ان کو مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ دیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ وہ مرتے دم تک ایمان اور عمل صالح پر تھے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الۡكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ تَرٰٮهُمۡ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانًا سِيۡمَاهُمۡ فِىۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِى التَّوۡرٰٮةِ وَمَثَلُهُمۡ فِى الۡاِنۡجِيۡلِ كَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسۡتَغۡلَظَ فَاسۡتَوٰى عَلٰى سُوۡقِهٖ يُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَـغِيۡظَ بِهِمُ الۡكُفَّارَ

وَعَدَاللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡهُمۡ مَّغۡفِرَةً وَّ اَجۡرًا عَظِيۡمًا (سوره فتح :29)

”محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ آپ کے صحبت یافتہ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں بہت سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔ اے مخاطب تم ان کو دیکھو گے کہ کبھی رکوع کر رہے ہیں کبھی سجدہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہیں۔ ان کے آثار ان کے چہروں پر ان کے سجدہ کی وجہ سے نمایاں ہیں۔ یہ ان کے اوصاف توریت میں ہیں اور انجیل میں ہیں۔ ان کا یہ وصف ہے کہ جیسے کھیتی اس نے اپنی سوئی نکالی پھر اس نے اس کو قوی کیا پھر وہ اور موٹی ہوئی پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی (اسی طرح اللہ نے ان کو قوت دی) تاکہ (اللہ) ان سے کافروں کو جلائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان صاحبوں سے جو کہ ایمان لائے ہیں اور نیک کام کر رہے ہیں مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔“

3 i- اللہ تعالیٰ نے ایمان ان کو محبوب کر دیا ہے اور اسے ان کے دلوں کی زینت بنا دیا ہے۔

ii- اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں کفر و فسق اور نافرمانی کی نفرت بٹھا دی ہے۔

iii- وہ لوگ نیک راہ والے ہیں۔

وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيۡكُمُ الۡاِيۡمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ وَكَرَّهَ اِلَيۡكُمُ الۡكُفۡرَ وَالۡفُسُوۡقَ وَالۡعِصۡيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعۡمَةً (سوره حجرات:7)

”لیکن اللہ نے محبت ڈال دی تمہارے دلوں میں ایمان کی اور مزین (ومرغوب) کر دیا اس کو تمہارے دلوں میں اور نفرت ڈال دی تمہارے دلوں میں کفر اور گناہ و نافرمانی کی۔ وہی لوگ ہیں نیک راہ پر اللہ کے فضل سے اور احسان سے۔“

iv- اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کو صحابہ کے ساتھ لازم کر دیا اور وہی اس کے سب سے زیادہ لائق تھے:

وَاَلۡزَمَهُـمۡ كَلِـمَةَ التَّقۡوٰى وَكَانُوۡۤا اَحَقَّ بِهَا وَاَهۡلَهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمًا (سوره فتح :26)

”اور اللہ نے تقویٰ کی خصلت کو ان کے ساتھ لازم کر دیا (تاکہ تقوی و پرہیزگاری ان سے کبھی جدا نہ ہو سکے) اور وہی تقویٰ کے سب سے زیادہ حقدار اور اہل ہیں اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے (اس لئے اس کو معلوم ہے کہ کون تقویٰ کا زیادہ حقدار اور لائق ہے)“

4- قرآن نے ان کے کامیاب اور جنتی ہونے کا بیان کیا

لٰـكِنِ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ جَاهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الۡخَيۡرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ اَعَدَّاللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِیْنَ فِیْهَا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (سورہ توبہ:88)

”ہاں رسول اوران کے ساتھ ایمان لانے والوں نے اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا ان لوگوں کے لئے تمام بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ ان لوگوں کیلئے اللہ نے ایسے باغات تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔“

5- اللہ تعالیٰ نے صحابہ سے اپنی رضامندی کا اعلان فرمایا۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَافِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْباً(سورہ فتح :18)

”یقیناً اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جب وہ بیعت کرنے لگے آپ سے اس درخت کے نیچے پھر معلوم کیا جو ان کے دلوں میں تھا اور ان پر سکینت اتاری اور انعام میں دی ان کو ایک قریبی فتح۔“

6- صحابہ معیارِ حق اور واجب الاتباع ہیں

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (سورہ بقرہ:137)

”اگر دوسرے لوگ ایمان لائیں جس طرح پر تم ایمان لائے ہو تو وہ بھی ہدایت پالیں گے۔“

اس آیت میں ایمانیات میں صحابہ کے ایمان کو معیار بنایا گیا ہے اور تمام انسانوں کیلئے ہدایت کو ان کے جیسا ایمان لانے کے ساتھ مشروط کیا ہے۔

وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (سورہ توبہ :100)

”اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور جنہوں نے ان کی پیروی کی نیکی کے ساتھ اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اللہ سے۔“

7- اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو حکومت وخلافت کا وعدہ دیا

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی كَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْئًا (سورہ نور:55)

وعدہ کرلیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے اور کئے ہیں انہوں نے نیک کام کہ اللہ ضرور ان کو حاکم بنائے گا زمین میں جیسے حاکم بنایا تھا ان سے پہلے لوگوں کو اور جما دے گا ان کے لئے ان کے اس دین کو جو اللہ نے پسند کیا ان کے واسطے اور ان کے خوف کے بعد ان کو امن کی تبدیلی دے گا میری عبادت کریں گے اور کسی کو میرا شریک نہ بنائیں گے۔

یہ آیت، آیت استخلاف کہلاتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت علیؓ تک چاروں خلفاء کی خلافت کے وعدہ الٰہی کے مطابق ہونے پر واضح دلیل ہے۔ اسی آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان چاروں خلفاء کے زمانے میں جو احکام نافذ ہوئے وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین تھا۔

8- حکومت وخلافت ملنے کے بعد کے انکے حالات کیا ہونگے

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (سورہ حج: 41)

”(اوپر سے مہاجرین کا ذکر چل رہا ہے۔ ان کے بارے میں مزید فرمایا) وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں زمین میں تو قائم کریں نماز اور دیں زکوٰۃ اور حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں برائی سے۔ (اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تک چاروں خلفاء مہاجرین میں سے تھے)“۔

9- حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت تک خلافت راشدہ ہے

عن سفينة قال قال رسول الله ﷺ الخلافة فى امتى ثلاثون سنة ثم ملك بعد ذلك ثم قال لى سفينة امسك خلافة ابى بكر ثم قال و خلافة عمر و خلافة عثمان ثم قال امسك خلافة على فوجدناها ثلاثين سنة (ترمذى)

”حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں (منہاج نبوت پر اور پورے پورے دین کے مطابق) خلافت تیس سال رہے گی پھر اس کے بعد بادشاہت ہوگی۔ (حضرت سفینہ کے شاگرد کہتے ہیں) پھر مجھ سے حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ نے کہا اپنی انگلیوں پر گنو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت (کا دور) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت (کا دور) اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلاف (کا دور) پھر کہا انگلیوں پر گنو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت (کا دور)۔ کہتے ہیں کہ ہم نے (شمار کیا تو اس پوری مدت کو ہم نے) تیس سال پایا۔“

عقیدہ

تمام اہل حق کا اس پر اجماع ہے کہ پیغمبروں کے بعد تمام انسانوں میں افضل اور خاتم الانبیاء علیہ الصلوۃ والسلام کے بعد امام برحق اور خلیفہ مطلق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور ان کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں اور ان کی فضیلت ان کی خلافت کی ترتیب کے موافق ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد تمام صحابہ نے صدق دل اور طیب خاطر اور شرح صدر کے ساتھ بالاتفاق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا۔ چند سرکردہ مہاجرین وانصار کا اجتماع ہوا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنایا کہ الائمۃ من قریش یعنی امام قریش میں سے ہوں اور فرمایا کہ خلفاء قریش (یعنی مہاجرین میں سے ہوں) اور انصار وزراء ہوں۔ انصار کی یہ رائے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے ہونا قابل عمل تھی کیونکہ اسلام کی سلطنت قبائلی نظام سے بہت آگے جا چکی تھی اور ابھی اس نے اور آگے جانا تھا۔ یعنی قومی خلافت سے بڑھ کر بین الاقوامی خلافت کا رنگ اختیار کرنا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے انصار تم نے دین اسلام کو سب سے پہلے قوت پہنچائی اب تم ہی اس کے ضعف کا سامان نہ کرو۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا قریش عربوں میں عمدہ نسب اور افضل شہر (یعنی مکہ مکرمہ) والے ہیں اور (تمام عرب میں) امارت صرف قریش ہی کے لئے تسلیم کی جائے گی۔ لہٰذا عمر اور ابوعبیدہ میں سے کسی کو اپنا امیر بنالو۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں کیونکہ آپ ہمارے سردار ہیں اور ہم میں سب سے بہتر (وافضل) ہیں اور ہم میں سے سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کو محبوب ہیں۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر بیعت کی۔ پھر وہاں موجود سب مہاجرین وانصار نے بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر برضا ورغبت بیعت کی۔ دوسرے دن عام بیعت ہوئی اور سب صحابہ نے بلا اختلاف بیعت کرلی اور اس طرح سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت قطعی حق قرار پائی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

لن تجتمع امتی علی الضلالۃ یعنی میری امت گمراہی پر ہرگز متفق نہیں ہوگی۔

بعض علماء اہل سنت اس طرف گئے ہیں کہ ابوبکرؓ کی خلافت نبی کریم ﷺ کی تصریح سے ثابت ہے۔ حضور نے اپنے مرض وفات میں حضرت ابوبکر کی خلافت کی صراحت فرما دی تھی۔ اس کے برعکس شیعہ یہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی مرتضی کرم اللہ وجہہ، کو خلافت کے لئے نامزد کر دیا تھا۔

حق یہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم سے کسی خاص شخص کی خلافت کے بارہ میں کوئی صریح اور جلی حکم نہیں ملتا نہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے لئے اور نہ حضرت علی مرتضیؓ کے لئے البتہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے لئے حدیثوں میں اشارے اس درجہ کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ جو قریب صراحت کے ہیں۔ خلافت صدیقی کے انعقاد کے لئے اہل سنت والجماعت کی اصل دلیل اجماع امت ہے اور حدیثوں میں جو اشارے ہیں ان کو اس اجماع کا منشا اور موید قرار دیتے ہیں۔ اہل سنت ان احادیث کو محض تقویت اور تاکید حجت کے لئے پیش کرتے ہیں ورنہ صحابہ کرام کا اجماع خود ایک مستقل حجت ہے اجماع صحابہ کے بعد کسی دوسری دلیل کی مطلق حاجت نہیں۔

اور اگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت پر کوئی نص ہوتی تو صحابہ کرام ضرور اس کو ذکر کرتے اور اگر بفرض محال صحابہ نے چھپایا تھا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس وقت اپنی نص خلافت کو ظاہر فرما دیتے تو انصار بجائے ابوبکر کے یقیناً حضرت علی کا ساتھ دیتے اس لئے کہ حضور ﷺ کی قرابت کی وجہ سے انصار پر بنو ہاشم کا خاص اثر اور لحاظ تھا۔ اور اگر کوئی شیعہ یہ کہے کہ حضرت علی نے تقیہ کی بنا پر اپنی نص خلافت کو چھپا لیا تو اہل سنت یہ کہیں گے کہ تقیہ کرنا شان اسد اللہی کے خلاف ہے۔ اہل سنت کے نزدیک حضرت علیؓ نے کبھی تقیہ نہیں کیا وہ اللہ کے شیر تھے۔ سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور اگر بالفرض حضرت علیؓ نے اس وقت تقیہ کر کے اس نص کو چھپا لیا تھا تو جس وقت حضرت علی خلیفہ ہو گئے تھے اس وقت تو اس نص کو ظاہر فرما دیتے مگر پھر بھی کوفہ کے منبر پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی افضلیت کا اعلان فرماتے رہے۔

حضرت عمرؓ کی تقرری

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے انتقال کا وقت قریب ہوا تو انہوں نے ذمہ دار لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ میری زندگی ہی میں آئندہ کے لئے کسی کو امیر منتخب کر لو تاکہ بعد میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ آپ خود ہی کسی کا نام تجویز فرما دیں ہم بلا اختلاف ان کو اپنا امیر بنا لیں گے۔ اس پر حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت زید اور حضرت اسید بن حضیر کے مشورہ سے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کا نام تجویز کیا۔ حضرت

عمرؓ کی سختی کی وجہ سے بعض لوگوں نے کہا اے ابوبکر تم خدا کو کیا جواب دو گے کہ تم ایک سخت مزاج آدمی کو ہم پر خلیفہ مقرر کر کے جا رہے ہو۔ ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں خدا تعالیٰ سے یہ عرض کروں گا کہ اے پروردگار میں نے تیرے بہترین بندے کو خلیفہ مقرر کیا۔ پھر حضرت عثمانؓ کو بلایا اور ان سے اس بارے میں تحریر لکھوائی۔ پھر سب نے بلا اختلاف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

حدیث سے بھی اس تقرری کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر** یعنی میرے بعد ابوبکر اور عمر کی پیروی کرنا۔ کامل پیروی اور اقتداء تو اسی طرح ہے کہ وہ مسلمانوں کے امام اور خلیفہ ہوں تاکہ وہ جو حکم دیں مسلمان ان کی کامل پیروی کریں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی دو خصوصیتیں

شیخین کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بے شمار احادیث میں شیخین یعنی ابوبکر و عمر کو اپنے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا ہے مثلاً یوں فرمایا کہ میں اور ابوبکر اور عمر اس پر ایمان لائے وغیرہ جس سے ان دونوں کا اختصاص صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ سوائے ان دو بزرگوں کے اور کسی صحابی کو حضور ﷺ نے اپنے ساتھ ملا کر ذکر نہیں فرمایا۔ اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ دونوں بزرگ وفات کے بعد بھی آنحضرت ﷺ کے مصاحب اور ساتھی ہوئے۔ اور ایک ہی حجرہ میں تینوں مدفون ہوئے۔ یہ وہ شرف ہے کہ جو سوائے ابوبکرؓ اور عمرؓ کے اور کسی صحابی کو نصیب نہیں ہوا۔ امام ربانی مجدد الف ثانی فرماتے ہیں حضرات شیخین کی تمام صحابہ کے درمیان ایک عجیب شان ہے ابوبکر صدیقؓ اور فاروق اعظمؓ یہ دونوں حضرات گویا کہ نبی اکرم ﷺ کے ہم خانہ ہیں اور باقی صحابہ ہمراہ اور ہم شہر ہونے کی نسبت رکھتے ہیں اور اولیاء امت کا وہاں کیا دخل ہے (ماخوذ از مکتوب 251 دفتر اول)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تقرری

لوگوں کے کہنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت کے وقت خلافت کے لئے چھ نام دیئے اور کہا کہ میں ان سے زیادہ کسی کو خلافت کا حقدار نہیں پاتا۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ ان سے راضی تھے۔ وہ چھ آدمی یہ تھے۔ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تدفین کے بعد یہ حضرات اکٹھے ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا کہ

اس معاملہ کو تین افراد تک کر دو (یعنی ہم میں سے تین دوسرے تین کے حق میں دستبردار ہو جائیں)۔ اس پر حضرت طلحہ حضرت علی کے حق میں اور حضرت زبیر حضرت عثمان کے حق میں اور حضرت سعد بن ابی وقاص حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جو خود بھی دستبردار ہو گئے انہوں نے حضرت عثمان اور حضرت علی سے کہا کہ کیا آپ مجھے یہ اختیار دیتے ہیں کہ آپ میں سے جو افضل ہے میں اس کو نامزد کر دوں۔ وہ دونوں اس پر تیار ہو گئے اور عہد کیا کہ وہ جس کو مقرر کریں گے دوسرا اس کو خلیفہ تسلیم کرے گا اور اس کی اطاعت کرے گا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں موجود سب خاص و عام سے ملے اور ہر ایک کی آزادانہ رائے حاصل کی۔ تقریباً سب لوگوں کا رجحان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف تھا۔ تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان کیا اور سب حضرات نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتخاب

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مدینہ منورہ کا محاصرہ کرنے والے باغیوں نے خلافت کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلے تو انکار کیا لیکن جب دیکھا کہ مدینہ منورہ میں موجود اکابر صحابہ کی بھی یہی رائے ہے تو انہوں نے اس ذمہ داری کو قبول فرمالیا۔

فائدہ :

قال الشیخ الامام ابو الحسن الاشعری ان تفضیل ابی بکر ثم عمر علی بقیة الامة قطعی

امام ابوالحسن اشعری فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عمر کی تمام امت پر فضیلت قطعی ہے۔

لیکن حضرت عثمان کی فضیلت حضرت علی پر اس درجہ کی قطعی نہیں۔ ائمہ اربعہ مجتہدین کا مذہب تو یہی ہے کہ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ سے افضل ہیں اور بعض علماء نے حضرت علیؓ کی کثرت مناقب کی وجہ سے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی تفصیل میں توقف کیا ہے۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ امام مالک سے اس بارہ میں توقف منقول ہے لیکن بعد میں وہ بھی توقف چھوڑ کر حضرت عثمان کی حضرت علیؓ پر فضیلت کے قائل ہو گئے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں۔

ھو الاصح انشاء اللہ تعالیٰ یعنی حضرت عثمانؓ کا حضرت علیؓ سے افضل ہونے کا قول ہی صحیح ہے۔

بعض علماء کو امام اعظم ابوحنیفہؒ کی ایک عبارت سے توقف کا گمان ہوا ہے وہ عبارت یہ ہے۔

امام محمد کی سیر کبیر میں ہے نوح بن ابی مریم کہتے ہیں میں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اہل سنت و الجماعت کے مذہب کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا ان تفضل ابابکر و عمر و تحب علیا و عثمان ...... الخ یہ کہ تم حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو فضیلت دو اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے محبت کرو...... امام اعظمؒ کا اس عبارت سے یہ مقصد نہیں کہ آپ کو حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی تفضیل میں کوئی توقف تھا بلکہ وجہ یہ تھی کہ ان دونوں حضرات کے زمانہ خلافت میں چونکہ فتنے اور فساد ظاہر ہوئے تو بہت سے لوگوں کے دلوں میں ان کی طرف سے کدورت آ گئی۔ اس کدورت کے ازالہ کے لئے امام اعظم ابوحنیفہؒ نے ان کے حق میں لفظ محبت کا استعمال کیا اور ان کی محبت اور دوستی کو اہل سنت کی علامت قرار دیا۔ امام اعظم نے یہ لفظ توقف کی بنا پر استعمال نہیں کیا اس لئے کہ امام اعظم اور ان کے تمام اصحاب کی تصریحات موجود ہیں کہ خلفاء راشدین کی افضلیت ان کی خلافت کی ترتیب پر ہے۔ مثلاً فقہ اکبر میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصریح ہے و افضل الناس بعد النبیین علیہم الصلاۃ والسلام ابوبکر ثم عمر بن الخطاب الفاروق ثم عثمان بن عفان ذوالنورین ثم علی بن ابی طالب المرتضی رضی اللہ عنھم (انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے بعد لوگوں میں افضل ابوبکر ہیں پھر عمر ہیں پھر عثمان ہیں پھر علی رضی اللہ عنہم ہیں) اور علامہ سرخسی شرح سید کبیر میں لکھتے ہیں فاما المذہب عندنا ان عثمان افضل من علی رضوان اللہ علیھما قبل الخلافۃ و بعدھا (ہم حنفیہ کے نزدیک حضرت عثمان رضی اللہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فضیلت حاصل ہے خلافت سے پہلے بھی اور خلافت کے بعد بھی)۔

عقیدہ

خلفاء راشدین کے بعد ان چھ صحابہ کا مرتبہ ہے جن کو چار خلفائے راشدین سمیت آنحضرت ﷺ نے جنت کی بشارت دی ہے ان کو عشرہ مبشرہ (یعنی جنت کی خوشخبری پانے والے دس حضرات) کہتے ہیں۔ ان کو نبی ﷺ نے ایک مجلس میں نام بنام جنت کی بشارت دی وہ دس یہ ہیں۔ چار خلفاء راشدین اور بقیہ چھ کے نام یہ ہیں۔ سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن بن عوف اور ابوعبیدہ بن الجراح اور سعید بن زید اور طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم۔

یہ دس حضرات تمام امت میں سب سے بہتر اور افضل ہیں۔ قریش کے سردار ہیں دین اسلام کے سابقین اولین میں سے ہیں ان کی خاندانی نجابت و وجاہت اور ان کے ذاتی فضائل اور خصائل اور محاسن اور کمالات اسلام کی تقویت کا باعث بنے اسلام میں داخل ہونے کے بعد دل و جان سے اسلام کے معین اور

مددگار رہے اور ہر غزوہ اور ہر معرکہ میں حضور رسالت مآب ﷺ کے ہم رکاب رہے۔ ان دس حضرات کے وجود سے اسلام کو جو قوت پہنچی وہ کسی اور سے نہیں پہنچی۔

چونکہ نبی ﷺ نے ایک ہی وقت میں ان تمام حضرات کا نام لے لے کر جنت کی بشارت دی اسی لئے ان کو عشرہ مبشرہ کہتے ہیں۔ ورنہ انفرادی طور پر نبی اکرم ﷺ نے ان دس کے سوا اور حضرات کو بھی جنت کی بشارت دی ہے جیسے حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت حسن اور حضرت حسین اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حمزہ اور حضرت عباس اور حضرت سلمان اور حضرت صہیب اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم۔

عقیدہ

عشرہ مبشرہ کے بعد اہل بدر کا درجہ ہے جن کے متعلق حدیث میں آیا ہے۔

(ان) الله قد اطلع على اهل بدر فقال اعملوا ماشئتم فقد غفرت لكم (بخارى و مسلم)

”(تحقیق) اللہ تعالیٰ مطلع ہوا اہل بدر پر پس فرمایا اے اہل بدر تم جو چاہے عمل کرو میں نے تمہاری مغفرت کر دی ہے۔“

یہ اجازت ہر کس وناکس کو نہیں ہو سکتی اس کا خطاب انہیں پاک اور مخلص بندوں کو ہو سکتا ہے جن کے قدم کی جادہ محبت میں پوری پوری استقامت ثابت ہو چکی ہو۔

عشرہ مبشرہ بھی بدر کی لڑائی میں شریک تھے سوائے حضرت عثمان غنیؓ کے کہ وہ شریک ہونے کے لئے تیار تھے مگر نبی ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہ (جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں ان) کی علالت اور بیماری کی وجہ سے حضور ﷺ کے حکم سے مدینہ میں رہے لیکن نبی کریم ﷺ نے ان کو اہل بدر میں شمار کیا۔ اور بدر کی غنیمت میں سے ان کو حصہ عطا فرمایا۔

چونکہ اہل بدر کا مرتبہ عشرہ مبشرہ کے بعد ہے اس لئے عشرہ مبشرہ کے لئے صراحت اور وضاحت کے ساتھ نام بنام جنت کی بشارت آئی اور اہل بدر کے لئے مغفرت کے عنوان سے بشارت آئی اور کسی کا نام لے کر بشارت نہیں دی۔

اہل بدر کے بعد اہل احد کا مرتبہ ہے۔ اس غزوہ میں نبی اکرم ﷺ کا دندان مبارک شہید ہوا اور سید الشہداء حضرت حمزہ اور ستر صحابی اس غزوہ میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہم اور عشرہ مبشرہ بھی احد میں شریک تھے۔

اہل احد کے بعد اہل بیعت رضوان کا درجہ ہے۔ بیعت رضوان اس بیعت کا نام ہے کہ جو مسلمانوں نے صلح حدیبیہ سے پہلے نبی ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی جس کے بارہ یہ آیت نازل ہوئی۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ (سورہ فتح :18)

”تحقیق اللہ تعالیٰ راضی ہوا ان اہل ایمان سے جنہوں نے درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کے اخلاص کو خوب جانتا ہے۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کے دلی اخلاص کی خبر دی ہے اور اسی دلی اخلاص پر خوشنودی کا پروانہ عطا فرمایا لہٰذا شیعوں کا یہ کہنا کہ معاذ اللہ۔ صحابہ کا ایمان محض ظاہری طور پر تھا اور دل سے وہ مومن نہیں ہوئے تھے عجب نہیں کہ فَعَلِمَ مَافِیْ قُلُوْبِھِمْ کا لفظ شیعوں کے اسی وسوسہ کے ازالہ کے لئے نازل کیا ہو۔

فائدہ: افضلیت کی یہ ترتیب جواب تک بیان ہوئی وہ اجماعی ہے اس کے بعد تمام صحابہ کا مقام ان کے علم اور تقویٰ کے اعتبار سے ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ متقی ہے)

عقیدہ

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے شرح فقہ اکبر میں علامہ سبکی رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا کہ حضرت فاطمہ (جنت کی تمام عورتوں کی سردار اور) سب سے افضل ہیں، ان کے بعد ان کی والدہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور ان کے بعد حضرت عائشہ صدیقہؓ کا درجہ ہے۔

عقیدہ

مشاجرات صحابہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کے قصاص کے مطالبہ کی وجہ سے صحابہ کے درمیان جو اختلافات و نزاعات پیش آئے یہاں تک کہ جنگ جمل اور جنگ صفین وغیرہ کی نوبت آئی ان کو مشاجرات صحابہ کہا جاتا ہے۔ حضرت علیؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو کسی کو بھی ان کی خلافت سے انکار نہیں اور سب ان کی فضیلت واہلیت خلافت کے قائل تھے۔ البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا مطالبہ نزاع کا سبب بن گیا۔ ایک طرف حضرت زبیر اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے انہوں

نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قصاص کا مطالبہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو جواب دیا کہ ابھی فوری طور پر حالات سازگار نہیں ہیں۔ جب خلافت مستحکم ہو جائے گی اور حالات سازگار ہوں گے تب قاتلین سے قصاص لیا جائے گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حج کے لئے گئی ہوئی تھیں۔ واپسی میں ان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر پہنچی تو انہوں نے بھی قصاص کی آواز اٹھائی۔ حضرت زبیر اور حضرت طلحہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جواب سے مطمئن نہ ہوئے وہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آملے اور ان کے عزم میں مزید پختگی پیدا کی۔ ان سب کو یہ خیال تھا کہ شاید حضرت علی رضی اللہ عنہ قصاص لینے پر تیار نہیں ہیں۔ اس لئے یہ چاہتے تھے کہ اپنی قوت فراہم کر کے اس شرعی حکم کو پورا کریں یا کروائیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جنہوں نے ابھی تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی انہوں نے بھی قصاص کا مطالبہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو جواب دیا کہ پہلے میری بیعت کرو پھر میری عدالت میں قصاص کا مقدمہ لے کر آؤ۔ ان کو بھی یہ خیال ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قصاص لینے سے گریز کر رہے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اہل شام نے چونکہ ابھی تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت نہیں کی اور ان کی خلافت ابھی مکمل نہیں ہوئی لہٰذا ان سے اختلاف کرنا جائز ہے۔

وما وقع من المخالفات والمحاربات لم یکن عن نزاع فی خلافة بل عن خطا فی الاجتهاد۔

حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان جو لڑائی جھگڑے پیش آئے وہ خلافت کے بارے میں نہ تھے بلکہ اجتہادی خطا کے سبب سے تھے۔

اور حاشیہ خیالی میں ہے:

فان معاویة واحزابه بغوا عن طاعته مع اعترافهم بانه افضل اهل زمانه الاحق بالا مامة منه بشبهة هی ترك القصاص عن قتلة عثمان رضی الله عنه

حضرت معاویہ اور ان کے گروہ نے حضرت علی کی اطاعت سے انحراف کیا باوجودیکہ وہ سب اس کے مقر اور معترف تھے کہ حضرت علی اپنے تمام اہل زمانہ سے افضل ہیں اور سب سے زیادہ خلافت اور امامت کے مستحق ہیں۔ باوجود اس اعتراف کے ان کا اطاعت سے انحراف ایک شبہ کی بنا پر تھا وہ یہ کہ حضرت علی حضرت عثمان غنی کے قاتلوں سے قصاص کیوں نہیں لیتے۔

اہلسنت کا اس پر اتفاق و اجماع ہے کہ ان اختلافات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے اور دوسرے حضرات خطا پر تھے اور اگر چہ اجتہاد کبھی صحیح ہوتا ہے اور کبھی اس میں خطا بھی ہو جاتی ہے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق ہونے کے دلائل حدیث میں ملتے ہیں جن کی بنیاد پر امت کا اجماع طے پایا۔ وہ حدیثیں یہ ہیں:

1- حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا **تقتلہ الفئة الباغية** (انہیں باغی جماعت قتل کرے گی)۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ شریعت میں باغی اس کو کہتے ہیں جو خلیفہ برحق کے خلاف ناحق خروج و اقدام کرے اگر چہ وہ خطائے اجتہادی سے ہو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خطا پر تھے اور ان کا اقدام بغاوت تھا۔ اگر چہ ایسا دینی مسئلہ میں اجتہاد سے ہوا۔

2- حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

والله ليقاتلنك يوما و هولك ظالم (ابو بكر بن ابى شيبة)

"اے علی اللہ کی قسم ایک دن زبیر تم سے ضرور جنگ کریں گے۔ حالانکہ وہ خطا پر ہوں گے۔"

تنبیہ: چونکہ یہ اختلاف ایک دینی مسئلہ میں اجتہادی اختلاف کی وجہ سے ہوئے اس لئے کسی کو بھی اس کی اجازت نہیں کہ وہ ان حضرات میں سے کسی کے بارے میں بھی طعن و تشنیع کرے اور ان پر تنقید کرے۔ ان سب کے بارے میں بہت سی فضیلتیں وارد ہوئی ہیں لہٰذا ان سب کے بارے میں اچھا گمان رکھے۔ ان میں سے کسی پر بھی تنقید کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اللّٰه اللّٰه فى اصحابى لا تتخذوهم غرضا من بعدى من احبهم فبحبى احبهم و من ابغضهم فببغضى ابغضهم و من آذاهم فقد اذانى و من أذانى فقد آذى الله و من آذى الله فيوشك ان ياخذه (ترمذى)

"یعنی میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو۔ تم پر جو ان کی تعظیم و احترام کا حق بنتا ہے اس کو پورا کرنے میں کوتاہی نہ کرنا ورنہ تم پر اللہ تعالیٰ کی سزا ہوگی جس سے تم کو ڈرتے رہنا چاہئے) میرے بعد ان کو (اپنی تنقید و بدکلامی کا) ہدف اور نشانہ نہ بنا لینا۔ جس نے ان سے محبت کی اس نے درحقیقت میرے ساتھ اپنی محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے درحقیقت میرے ساتھ اپنے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا۔ میری اس نصیحت اور حکم کے بعد اب جو

کوئی ان کے بارے میں تنقید اور بدکلامی کرے اور ان کی حق تلفی کے ذریعے ان کو اذیت پہنچائے تو چونکہ وہ مجھے پسند نہیں لہٰذا اس نے مجھے اذیت دی۔ اور کسی کا مجھے اذیت دینا اللہ کو پسند نہیں لہٰذا جس نے مجھے اذیت دی اس نے اللہ کو اذیت دی اور جو اللہ کو اذیت دے تو چونکہ اللہ ایسے کو ہر طرح سے سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے لہٰذا قریب ہے کہ اللہ دنیا میں یا آخرت میں اس کی گرفت فرمائے۔

باب: 16

عقیدہ تقدیر کا بیان

ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ازل سے ذرے ذرے کا علم ہے اور اسی طرح ہر مسلمان جانتا ہے کوئی بھی کام اللہ کے ارادۂ ازلی کے بغیر نہیں ہوتا۔ یہ دونوں باتیں عقیدہ تقدیر کی اصل ہیں۔ لیکن عام طور سے کسی کے بارے میں پہلے سے نہیں بتایا گیا کہ وہ جنتی ہوگا یا جہنمی ہوگا، اس کا رزق کتنا ہوگا۔ وہ امتحان میں کامیاب ہوگا یا ناکام ہوگا اور اس کی موت قدرتی ہوگی یا حادثاتی ہوگی۔ غرض انسانی زندگی کا کوئی بھی پہلو اور کوئی بھی معاملہ ہو وہ اللہ کے علم وارادہ سے ماوراء نہیں ہے لیکن اللہ نے اپنے علم وارادہ سے ہر کسی کو مطلع نہیں کیا ہے لہٰذا انسان کو دنیاوی معاملہ ہو یا اخروی اس کو دیکھنا ہوگا کہ کونسی بات اس کے حق میں عقل وشرع کی رو سے مفید ہے اور کونسی نقصان دہ ہے پھر وہ مفید پر عمل کرے اور نقصان دہ سے اجتناب کرے۔

تقدیر کے معنی لغت میں اندازہ کرنے کے ہیں مثلاً اگر مکان بنانے کا ارادہ ہوتا ہے تو پہلے اس کا نقشہ تیار کرتے ہیں تاکہ مکان کی عمارت اس نقشہ کے مطابق بنائی جائے اسی طرح حق جل شانہ نے جب ازل میں اس کارخانہ دنیا کے بنانے کا ارادہ فرمایا تو بنانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ازلی میں اس عالم کا نقشہ بنایا اور ابتداء سے انتہا تک ہر چیز کا اندازہ لگا لیا۔ اس اندازہ خداوندی اور نقشہ پنہائی کا نام تقدیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ازل ہی میں اپنے علم ازلی میں اندازہ بنا دیا کہ فلاں وقت فلاں مکان میں فلاں شے اس طرح ہوگی اور فلاں شخص پیدا ہونے کے بعد فلاں وقت میں ایمان لائے گا اور فلاں شخص پیدا ہونے کے بعد فلاں وقت کفر اختیار کرے گا وغیرہ وغیرہ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (سورہ طلاق:3) یعنی اللہ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کیا ہے۔

پھر حق تعالیٰ کا اس کارخانہ عالم کو اپنے نقشہ اور اندازہ کے مطابق بنانے اور پیدا کرنے کا نام قضاء ہے اور لغت میں قضاء کے معنی پیدا کرنے کے ہیں جیسا کہ قرآن پاک میں ہے فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (سورہ فصلت:12) یعنی پھر بنا دئے ان کو سات آسمان۔

پس اہل سنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ یہ ہے کہ قضاء وقدر حق ہے اور کوئی ذرہ اسکی تقدیر سے باہر نہیں اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کی قضاء وقدر کو کوئی ٹال سکے یا اس کو آگے یا پیچھے کر سکے۔

عن عبدالله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ كتب الله مقادير الخلق قبل ان يخلق السماوات والارض بخمسين الف سنة قال و كان عرشه على الماء (مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل تمام مخلوقات کے لیے جو بھی مقدر فرما دیا تھا وہ سب (قلم کو لکھنے کا حکم دے کر) کتابت کی صورت میں محفوظ کر دیا تھا اور آپ ﷺ نے فرمایا۔ (اس وقت) اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔

عن مسلم بن يسار الجهنى ان عمر بن الخطاب سئل عن هذه الآية و اذا اخذ ربك من بنى ادم من ظهر رهم ذريتهم فقال عمر سمعت رسول الله ﷺ سئل عنها فقال ان الله خلق آدم ثم مسح ظهره بيمينه فاستخرج منه ذرية فقال خلقت هولاء للجنة وبعمل اهل الجنة يعملون ثم مسح ظهره فاستخرج منه ذرية فقال خلقت هولاء للنار و بعمل اهل النار يعملون فقال رجل يا رسول الله ففيم العمل ؟فقال ان الله اذا خلق العبد للجنة استعمله بعمل اهل الجنة حتى يموت على عمل من اعمال اهل الجنة فيدخل به الجنة و اذا خلق العبد للنار استعمله بعمل اهل النار حتى يموت بعمل من اعمال اهل النار فيدخل به النار (مالك)۔

مسلم بن یسار جہنی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے حضرت عمرؓ سے ایک مرتبہ اس آیت **و اذ اخذ ربك من بنى آدم من ظهورهم ذريتهم** کی تفسیر پوچھی گئی۔ انہوں نے کہا کہ اس آیت کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کئے جانے پر میں نے خود سنا تھا آپ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ پھر ان کی پشت پر اپنا داہنا ہاتھ پھیر کر کچھ اولاد نکالی اور فرمایا کہ یہ میں نے جنت کے لیے بنائے ہیں اور جنتیوں ہی کے سے یہ عمل کریں گے۔ اس ے بعد پھر ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور باقی اولاد نکالی اور اس کے متعلق فرمایا کہ یہ میں نے دوزخ کے لیے بنائے ہیں اور یہ دوزخیوں کے سے عمل کریں گے۔ اس پر ایک شخص نے پوچھا اے اللہ کے رسول جب ہمارا جنتی یا جہنمی ہونا طے ہو چکا ہے تو پھر اب عمل کس لیے کریں؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ جب اللہ کسی بندے کو جنت کے لیے پیدا کرتا ہے تو وہ بندہ اپنے کسب واختیار سے جنت کی راہ کو اختیار کرتا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ اس سے جنتی شخص کے سے عمل بھی کرا لیتا ہے۔ یہاں تک اس کا خاتمہ بھی جنتیوں کے اعمال پر ہوتا ہے اور آخر میں اللہ تعالیٰ اس کے اختیاری اعمال پر

جزا کے طور پر جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ اور جب کسی کو دوزخ کے لیے پیدا فرماتا ہے تو وہ بندہ اپنے کسب و اختیار سے دوزخ کی راہ کو اختیار کرتا ہے جس میں اپنے اوپر کوئی جبر اور زبردستی نہیں پاتا اور اس طرح سے اس سے عمل بھی دوزخی شخص کے کرا لیتا ہے یہاں تک کہ اس کو آخر دوزخ میں داخل کر دیتا ہے حاصل یہ ہے کہ تقدیر نے تمہارا اختیار سلب نہیں کیا جو تم خود بھی محسوس کرتے ہو اور اپنے اختیار سے جس راہ کو بھی اختیار کرتے ہو بس سمجھو کہ یہ راہ تمہاری تقدیر میں لکھی ہوئی تھی اور تمہارے اختیار پر ہی آخرت کا نتیجہ ظاہر ہوگا۔

پہلا اشکال

جب جو کچھ انسان سے ہوتا ہے مقدر ہو چکا ہے اور یہ لاکھ چاہے کہ میں نیک بنوں مگر جب تک اللہ کو منظور نہ ہو کچھ نہیں ہوتا اور اس کا مشاہدہ بھی ہے تو پھر انسان کا اختیار کہاں رہا جس پر جزا ہو۔ اس کے دو جواب ہیں:

پہلا جواب: بعض علوم ایسے ہوتے ہیں کہ حقیقت میں بدیہی ہوتے ہیں (یعنی ہر شخص ان کو سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے) لیکن غور و خوض کرنے سے نظری ہو جاتے ہیں کہ بہت ہی غور و فکر کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً دن رات ہر وقت کوئی نہ کوئی خیال اور بات دماغ میں آتی رہتی ہے اور اس کا تجربہ ہوتا ہے لیکن اگر اس پر غور کرنے لگیں کہ بات کے ذہن میں آنے کی کیا صورت ہے؟ اور وہ بات جو ذہن میں آتی ہے وہ ذہن میں آنے سے پہلے کہاں تھی اور پھر ذہن میں کیسے چلی گئی۔ پھر ذہن میں جانے کے کیا معنی؟ وہاں پیدا ہوگئی یا باہر سے چلی گئی اور پھر ہزاروں خیال اور باتیں ذہن میں جاتی ہیں کیا یہ دماغ میں برابر برابر رکھی جاتی ہیں یا اوپر تلے رکھی جاتی ہیں۔ پھر پہلی صورت میں اتنی ہزاروں چیزوں کے ذہن میں سمانے کی جگہ کہاں ہے اور دوسری صورت میں وہ مشتبہ کیوں نہیں ہو جاتیں جس طرح کاغذ پر ایک عبارت لکھ کر اسی پر دوسری پھر اس پر تیسری عبارت لکھ دی جائے تو ایک بھی نہیں پڑھی جاتی۔ بہرحال غور و خوض کرنے سے یہ سب سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا حل بڑا دشوار ہے۔ لیکن اگر غور و خوض نہ کیا جائے تو حقیقت بالکل بدیہی اور واضح ہے کہ ایک چیز پہلے ذہن میں آ گئی دوسری بعد میں آئی۔ کسی کو کوئی شبہ نہیں ہے اور نہ کسی کو اس کے وقوع سے انکار ہے۔ اور اگر کوئی شبہ یا انکار کرے تو احمق سمجھا جاتا ہے کہ اتنی بدیہی اور واضح چیز کا انکار کرتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ بعض باتیں اور علوم اس شان کے ہوتے ہیں۔ مسئلہ تقدیر بھی اسی قسم کا ہے کہ حقیقت اس کی عقل اور نقل دونوں کے اعتبار سے نہایت واضح ہے یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے علم اور ارادہ ازلی کا عالم کے واقعات اور حوادث کے ساتھ متعلق ہونا ہے اور یہ نقل (یعنی قرآن وحدیث) کی طرح عقل سے بھی ثابت ہے جس میں نہ انکار کی گنجائش ہے نہ شبہ کی

گنجائش ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہی علم وارادہ دوطرح کی چیزوں کے ساتھ متعلق ہوتا ہے ایک تو ان چیزوں کے ساتھ جوانسان کی اختیاری کہلاتی ہیں دوسرے ان چیزوں سے جو غیر اختیاری کہلاتی ہیں۔

یہ اختیار بھی ایسی ہی چیز ہے جس کی حقیقت اس قدر بدیہی ہے کہ جانور تک اس کو جانتے ہیں چنانچہ اگر کوئی کتے کو لکڑی سے مارے تو وہ مارنے والے پر حملہ کرتا ہے لکڑی پر حملہ نہیں کرتا۔ تو مختار اور مجبور میں وہ بھی فرق سمجھتا ہے۔ نیز وہی شخص جو بندے سے اختیار کی نفی کرتا ہے اور اسے اپنے افعال میں مجبور محض سمجھتا ہے اگر اس کا کوئی نوکر اپنی لاپرواہی سے شیشہ کا قیمتی برتن گرادے اور وہ ٹوٹ جائے تو وہ اس پر ناراض اور سخت غصہ ہوتا ہے اس وجہ سے کہ نوکر نے اپنے اختیار سے لاپرواہی کی حالانکہ اس کے عقیدے کے مطابق اس کا نوکر صاحب اختیار نہیں تھا بلکہ مجبور محض تھا اور برتن کے گرانے میں یا اور کوئی نقصان کرنے میں اس کے اختیار کو کچھ دخل نہیں تھا۔

علاوہ ازیں انسان جب کوئی بھی کام کرتا ہے تو وہ اپنے اندر اس کام کو کرنے اور نہ کرنے کی آزادی محسوس کرتا ہے کسی قسم کا جبر محسوس نہیں کرتا۔ تو حقیقت اس کی ایسی بدیہی ہے لیکن اگر اس میں زیادہ غور وخوض سے کام لیا جائے اور تحقیق کے درپے ہوں تو وہی حقیقت نظری ہوجاتی ہے۔ اس لئے شریعت نے نہایت شفقت سے اجمالی اعتقاد رکھنے کو فرض قرار دیا اور غور وخوض کرنے سے منع فرمادیا۔

دوسرا جواب

گو بندے کے افعال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور ارادہ کا تعلق ہے اور اس تعلق کا اثر یہ ہے کہ اس مقدر کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا لیکن ایسے تعلق سے بھی بندے کے اختیار اور قدرت کی نفی نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ تعلق اس طرح ہے کہ فلاں شخص فلاں کام فلاں وقت اپنے اختیار وقدرت سے کرے گا۔ تو تقدیر جس طرح بندے کے فعل کے ساتھ متعلق ہوتی ہے اسی طرح بندے کی قدرت واختیار کے ساتھ بھی متعلق ہوتی ہے۔ سو اگر تقدیر کے تعلق سے اس فعل کا ہونا لازمی ہوا ہے تو اسی تعلق سے بندے کے اختیار اور قدرت کا وجود بھی لازم ہوا۔ تو مسئلہ تقدیر سے اختیار وقدرت کی نفی کے بجائے اس کا وجود اور زیادہ موکد ہوگیا۔ لہٰذا یہ شبہ نہ رہا کہ جب بندے کو قدرت واختیار نہیں پھر اس پر کیا الزام۔

دوسرا اشکال

ہمارا ایمان ہے کہ خدا تعالیٰ علیم کل اور عالم الغیب ہے۔ اس کا عالم الغیب ہونا اس بات پر بھی دلالت کرتا

ہے کہ اسے مستقبل کے ہر چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کا علم حاصل ہے لہٰذا ہر کام کے لئے ایک طریق کار قبل از وقت مقرر ہو گیا۔ پھر اگر زید نے بکر کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ کو اس کی بھی خبر تھی اور اس نے بکر کو قتل کیا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا یعنی اسے ازل ہی سے معلوم تھا کہ زید بکر کو قتل کرے گا اور اسی طرح اس کام کو ہونا چاہئے تھا ورنہ علم الٰہی باطل ٹھہرتا ہے۔ جب ہم خدا تعالیٰ کے اس علم غیب کو ہر انسان کے مستقبل پر منضبط کرتے ہیں تو ہمیں انسان کو مجبور محض ماننا پڑتا ہے اور خدا تعالیٰ کے عالم الغیب ہونے کی صفت پر ایمان رکھنا فیٹلزم (Fatalism) یعنی جبریت کو ماننے کے مترادف ٹھہرتا ہے۔ اب اس Fatalism (جبریت) کا نام سنتے ہی ہم اپنے آپ کو اس عقیدہ سے بری الذمہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہیں اپنے افعال میں ہم خود مختار اور ذمہ دار ہیں جیسا چاہیں کرلیں۔ اس حالت میں خدا کو ہمارے افعال کے علم سے نعوذ باللہ خالی ماننا پڑتا ہے۔

جواب

یہ یقین ہے کہ اختیار کا وجود بدیہی بلکہ حسی و مشاہد ہے اور جو چیز یقینی، بدیہی اور حسی ہو اس کی مخالفت میں اگر غیر یقینی دلیل کو لائیں تو بداہت و حس کی نفی نہیں کریں گے بلکہ دلیل کو غلط کہیں گے اگرچہ دلیل میں غلطی کی تعیین نہ کرسکیں۔

مثلاً اگر ریاضی کی دلیل سے معلوم ہو کہ فلاں تاریخ فلاں وقت فلاں مقام میں پورے سورج کا گہن ہوگا۔ لیکن مشاہدہ سے گہن کا عدم وقوع ثابت ہو تو مشاہدہ کو غلط نہ کہا جائے گا بلکہ یہی کہیں گے کہ حساب میں غلطی ہوگئی گو یہ تعیین نہ ہوسکے کہ کہاں غلطی ہوئی اور کیا غلطی ہوئی ہے۔ اسی طرح یہاں جب اختیار کی نفی کی دلیل لائے حالانکہ اختیار کا وجود یقینی اور حسی ہے ہر شخص اپنے آپ کو خود مختار پاتا ہے کسی کا پابند نہیں پاتا تو دلیل ہی کو غلط سمجھیں گے خواہ وہ غلطی کچھ ہی ہو۔ مثلاً اشکال میں مذکور دلیل میں یہ غلطی ہے کہ علم باری تعالیٰ جو واقعہ قتل کے ساتھ متعلق ہوا ہے کہ یہ قتل قاتل کے اختیار کے ساتھ ہوگا تو اس سے تو اختیار کا وجود اور زیادہ موکد ہو گیا نہ کہ معدوم ورنہ اللہ تعالیٰ کے علم کے خلاف لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ قاتل اپنے اختیار سے قتل کرے گا جبکہ مذکور دلیل کی بنا پر لازم آئے گا کہ قاتل محض مجبور ہو کر قتل کرتا ہے۔

تیسرا اشکال

جب بندہ کا ارادہ و اختیار خدا کے ارادہ و اختیار کے تابع ہے تو انسان مجبور ٹھہرتا ہے نیک و بد افعال میں قادر نہیں ٹھہرتا۔

جواب

انسان کا ارادہ ومشیت اس کی ایک صفت ہے اور یقیناً تمام صفات فرع ہوتی ہیں اپنے موصوف کے وجود کی۔ انسان اول موجود ہے پھر با ارادہ و با اختیار ہے اگر موجود نہ ہو تو ارادہ واختیار بھی حاصل نہ ہو۔

اب سمجھئے کہ اسلام کی یہ تعلیم کہ انسان کا ارادہ ومشیت خدا تعالیٰ کے ارادہ ومشیت کے تابع ہے ویسی ہی ہے جیسے یہ تعلیم ہے کے انسان کا وجود خدا کے وجود کے تابع ہے۔ جس طرح انسان کا وجود بغیر وجود الٰہی کے نہیں ہوسکتا اسی طرح اس کا ارادہ بغیر ارادہ خداوندی کے نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس کے ارادے کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا۔

اب اگر انسان کے ارادہ کو ارادہ خداوندی کا تابع ماننے سے انسان کا مجبور ہونا اور اس کے ارادہ کا معدوم ہونا لازم آئے تو چاہئے کہ انسان کے وجود کو خدا کے وجود کا تابع ماننے سے انسان کے وجود کا معدوم ہونا بھی لازم آئے کیونکہ جبر واضطرار اسی طرح ارادہ واختیار کی ضد ہے جس طرح عدم وجود کی ضد ہے حالانکہ انسان کے وجود کا وجود الٰہی کے تابع ہونا ہر عاقل تسلیم کرتا ہے اور باوجود تابع ماننے کے سب اس کو موجود سمجھتے ہیں۔ تو اس کی کیا وجہ کہ انسان کے ارادہ واختیار کو خدا کے ارادہ واختیار کے تابع ماننے سے اس کا مجبور ومضطر ہونا لازم آئے۔

چوتھا اشکال

علاوہ ازیں خدا کو عالم الغیب مان کر ہم دعا مانگنے کو بھی بے کار کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ ہر کام کو اسی طرح ہونا چاہئے جیسا کہ اس کے متعلق خدا تعالیٰ کو علم ہو چکا ہے معاذ اللہ وہ خود بھی اپنے علم کے خلاف جو کہ ابھی سے مکمل ہے آئندہ کچھ نہیں کرسکتا کیونکہ علم غلط ٹھہرتا ہے۔

جواب:

خدا کو عالم الغیب مان کر اس سے دعا مانگنا بے کار نہیں ہو جاتا کیونکہ

(1) ہمیں تو معلوم نہیں کہ خدا نے ہمارے لئے کیا مقدر کیا ہے۔

(2) علاوہ ازیں ہم جبلی طور پر خدا سے اپنی حاجتیں مانگنے کے محتاج ہیں اور شرعی طور پر مامور بھی ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے حصہ کا کام کریں گے کہ اس میں ہمارے جبلی اور شرعی تقاضے پورے ہوتے ہیں اور اس سے ہمیں نفسیاتی سکون اور ثواب ملتا ہے البتہ ہمیں ملے گا وہی جو ہمارے مقدر میں لکھا ہوا ہے۔

(3) دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بعض نعمتوں کو ہماری دعا کے ساتھ معلق کیا ہوتا ہے کہ اگر دعا کریں گے تو وہ ملے گی ورنہ نہیں۔ تو دعا کرنے کا یہ فائدہ بھی ہے۔

(4) تیسرے یہ کہ مقدر نہ ہونے کی وجہ سے وہ دعا دنیا میں پوری نہ ہوئی تو آخرت میں اس کی جگہ اللہ تعالیٰ وہ نعمتیں عطا فرمائیں گے کہ ان کو دیکھ کر بندہ تمنا کرے گا کہ کاش اس کی کوئی بھی دعا دنیا میں قبول نہ ہوتی۔

بعض اعمال مثلاً دعا سے تقدیر و قضا کا بدل جانا

ایک حدیث میں آتا ہے **لا یرد القضاء الا الدعاء** (دعا قضا کو پھیر دیتی ہے) تو جاننا چاہئے کہ تقدیر کے دو درجے میں ایک تقدیر مبرم ہے جو اٹل ہے اور اسمیں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اور دوسری تقدیر معلق ہوتی ہے (یعنی وہ تقدیر جو کسی عمل کے ساتھ معلق ہو)۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض چیزوں کو جب فرشتوں کو نافذ و جاری کرنے کے لئے بتاتے ہیں تو ان کے بارے میں یوں ذکر ہوتا ہے کہ فلاں شخص کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا لیکن اگر وہ مثلا دعا کرے یا صدقہ کرے تو اس کے ساتھ ویسا معاملہ کرنا یہ تقدیر معلق کہلاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے علم و ارادہ میں ہوتا ہے کہ بالآخر وہ بندہ کیا کرے گا اور اس کے ساتھ بالآخر (Finally) یہ معاملہ کیا جائے گا۔ یہ تقدیر مبرم کہلاتی ہے۔ تقدیر معلق کے درجے میں تو تغیر و تبدل ہوسکتا ہے لیکن تقدیر مبرم کے درجے میں کچھ تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ حدیث میں جو یہ ہے (اللہ کی قضا کو کوئی چیز پھیرنے والی نہیں) تو وہ تقدیر مبرم ہوتی ہے۔ اور جس کو ہم کہتے ہیں کہ بعض اعمال سے بدل جاتی ہے اور جیسا کہ حدیث میں ہے **لا یرد القضاء الا الدعا** (دعا تقدیر کو پھیر دیتی ہے) تو اس سے مراد تقدیر معلق ہے۔

باب: 17

امامت وخلافت

خلافت اور امامت کی بحث اہل سنت والجماعت کے نزدیک اگرچہ عقائد میں سے نہیں لیکن چونکہ روافض اور اہل بدعت نے اس میں بہت افراط وتفریط کر کے عقیدہ کا مسئلہ بنا دیا اس لئے علمائے حق نے اس بحث کو علم کلام (عقائد) میں داخل کیا تاکہ حقیقت حال واضح ہو جائے۔

مسلمانوں پر واجب ہے کہ جس شخص کو دینی اور دنیوی، سیاسی اور انتظامی امور میں ممتاز دیکھیں اس کو باہمی اتفاق سے اپنا امام اور خلیفہ مقرر کرلیں تاکہ وہ مسلمانوں کے دینی اور دنیوی امور کا انتظام کرے اس لئے کہ مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کا شریعت کے مطابق فیصلہ اور حدود وقصاص کا جاری کرنا اور اسلامی سلطنت کی حفاظت کرنا اور کافروں سے جہاد کے لئے لشکر تیار کرنا اور چوروں اور بدمعاشوں کا انتظام کرنا اور ضعیف اور کمزور اور مجبور ومعذور مسلمانوں کے معاش اور پرورش کا انتظام کرنا، مظلوم کا ظالم سے انصاف کرنا، کمزور کا زور آور سے حق دلانا وغیرہ یہ تمام امور عقلا وشرعا واجب ہیں اور یہ کام کسی امیر اور حاکم کے بغیر انجام نہیں پاسکتے لہٰذا معلوم ہوا کہ امیر کا مقرر کرنا فرض اور واجب ہے۔

صحابہ کرام نے نبی ﷺ کے وصال کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنا امیر مقرر کیا۔ اگر خلیفہ اور امیر کا مقرر کرنا شرعاً فرض نہ ہوتا تو صحابہ کرام انتخاب امیر کے مسئلہ کو نبی ﷺ کے دفن پر مقدم نہ کرتے اور صحابہ کرام کا اجماع خود ایک مستقل حجت ودلیل ہے۔

اسلامی حکومت کی تعریف

اسلامی حکومت وہ حکومت ہے جس کا نظام مملکت اسلامی شریعت کے ماتحت اور اس کے مطابق ہو اور اس کا دستور اور آئین وقانون بھی شریعت کے مطابق ہو اور وہ اپنے آپ کو دین وشریعت کا پابند سمجھتی ہو۔

اگر حکومت کا ملکی وملی تمام نظام منہاج نبوت پر ہو تو ایسی حکومت کو حکومت راشدہ یا خلافت راشدہ کہتے ہیں اس لئے کہ جو حکومت سراسر منہاج (طریق) نبوت پر ہو وہ یقیناً راشدہ (سراپا رشد وہدایت) ہوگی۔

اور خلیفہ راشد وہ ہے جس کو مسلمانوں کے اہل حل وعقد نے دین کی شرائط کے مطابق منتخب کیا ہو جو علم اور عمل صالح اور پرہیزگاری وتقویٰ میں نبی کا نمونہ ہو۔ ظاہر میں حکمران اور باطن میں اعلیٰ درجہ کا ولی ہو اور اس کی ولایت نبی کی نبوت کا عکس ہو۔ پس جس تن اور بدن میں حکمرانی اور ولایت دونوں جمع ہو جائیں تو وہ تن اور بدن خلیفہ راشد ہے۔

اور اگر حکومت کا نظم ونسق منہاج نبوت پر نہ ہو یعنی حکمران کو اہل حل وعقد نے منتخب نہ کیا ہو بلکہ وہ اپنی قوت سے حاکم بن گیا ہو یا بادشاہت کا نظام ہو تو اگر اس میں عدل وانصاف اور امانت ودیانت غالب ہو تو وہ حکومت حکومت عادلہ کہلائے گی ورنہ حکومت ظالمہ اور جائرہ کہلائے گی۔

اسلامی حکمران

اسلامی حکمران وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو ملک کا مالک حقیقی اور حاکم اصلی جانے اور مانے اور خدا کا بندہ اور رسول خدا ﷺ کا نائب ہونے کی حیثیت سے قانون شریعت کے مطابق ملک کا انتظام کرے۔ لہٰذا اسلامی حکومت کے فرماں روا کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو اور نبی آخرالزماں پر ایمان رکھتا ہو۔

اسلامی حکمران کی تعریف میں نائب نبی ہونے کی حیثیت سے انتظام کرنے کی قید اس لئے لگائی تا کہ انبیاء کرام اور خلفائے اسلام میں فرق ظاہر ہو جائے اس لئے کہ انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور نائب ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (سورہ بقرہ: 30) اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا بے شک میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں) اور یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ سورہ ص: 26 (اے داود بے شک ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے) اور خلیفہ اسلام یا اسلامی حکمران نبی ﷺ کے نائب ہوتے ہیں اور اسی حیثیت سے آپ کی شریعت کے مطابق حکم چلاتے ہیں۔

تنبیہ: اگر حکومت زبان سے تو اسلام کا اقرار کرتی ہو مگر درپردہ دیدہ ودانستہ بے دین لوگوں کے مشورہ سے ملک میں ایسے قوانین اور احکام جاری کرتی ہے جو کتاب وسنت اور اجماع امت کے صریح خلاف ہیں تو ایسی حکومت حکومت نفاق ہے اور یہ دین اسلام کے لئے سم قاتل ہے ایسی حکومت ضالہ کی مخالفت اور منازعت بقدر استطاعت شرعاً وعقلاً فرض ہے بشرطیکہ اس حکومت اور اقتدار کے ختم ہو جانے کے بعد حکومت عادلہ اور ریاست صالحہ کے قائم ہو جانے کا یقین یا ظن غالب ہو۔ اگر ایسا یقین یا ظن غالب نہ ہو تو پھر فی الحال صبر کرنا چاہئے اور اصلاح احوال کی جو بھی کوشش ہو سکتی ہو اس سے دریغ نہ کرنا چاہئے۔

خلیفہ اور امیر کی شرائط

1- وہ مسلمان ہو۔

کسی کافر کو اسلامی سلطنت کا سربراہ اور امیر بنانا تو درکنار کافر کو تو وزارتی یا فوجی یا سول کسی قسم کا کلیدی عہدہ دینا بھی جائز نہیں ہے اور نہ ہی کافروں سے سلطنت کے سیاسی اور اہم امور میں مشورہ لینا جائز ہے۔

2- وہ عاقل اور بالغ ہو۔ پاگل، بے وقوف اور نابالغ تو اپنا ہی انتظام نہیں کر سکتے وہ سلطنت کا انتظام کیسے کر سکتے ہیں۔

4- وہ شجاع، مدبر اور صاحب رائے ہو۔ آرام طلب، ناتجربہ کار اور غیر ذی رائے نہ ہو۔

ایک اعرابی کا کسی عیسائی سلطنت پر گزر ہوا تو وہاں کے امیر نے اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق دریافت کیا تو اس نے جواب دیا۔

امیرنا لا یخدع و لا یخدع ہمارا امیر (یعنی حضرت عمرؓ) نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے اور نہ کسی کے دھوکہ میں آتا ہے۔

5- وہ مرد ہو عورت نہ ہو۔ اس پر امت کے مجتہدین کا اجماع ہے اور حدیث میں ہے۔

لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ (بخاری) وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے اپنا ملکی انتظام عورت کے ہاتھ میں دے دیا۔

قرآن پاک میں ہے۔

الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (سورہ نساء: 34)

”مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو دوسرے پر۔“

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عام طور سے مردوں کو عورتوں پر علم و عمل میں فضیلت اور بڑائی عطا فرمائی جس کا ذکر حدیث میں ہے ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو عقل و عمل میں کوتاہ بتایا۔ اس پر عورتوں نے پوچھا و ما نقصان دیننا و عقلنا یا رسول اللہ (اے اللہ کے رسول ہمارے دینی عمل اور ہماری عقل میں کوتاہی کیا ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا الیس شهادة المرأة على النصف من شهادة الرجل قلن بلى قال فذلك من نقصان عقلها۔ اليس اذا حاضت لم تصل و لم تصم ؟ قلن بلى قال فذلك من نقصان دينها (بخاری)

کیا عورت کی گواہی مرد کی گواہی کی نصف نہیں ہے (جو مرد و عورت اور ان کی علمی و عملی صلاحیتوں کے خالق کی مقرر کردہ ہے) عورتوں نے کہا جی ہاں ایسا ہی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ایسا اس کی عقل کی کوتاہی سے ہے۔ اور فرمایا کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ جب وہ حیض میں ہو تو وہ نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے۔ عورتوں نے جواب دیا جی ہاں ایسا ہی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ اس کی دینی عمل میں کمی ہے۔

عقل کا اصل فائدہ سمجھ بوجھ، صحیح یادداشت، جذبات سے مغلوب نہ ہونا اور وقت پر قوت کے ساتھ فیصلہ کرنا ہے۔ عورتیں بہت کچھ علم حاصل کرنے کے باوجود مذکورہ امور میں عام طور سے اس درجہ کے علم والے مردوں سے بہت پیچھے ہوتی ہیں اس لئے حدیث کی بات پر کسی قسم کا اعتراض نہیں ہے۔ آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا ہے جو عورت گھر کی سربراہ نہیں اس کو پورے ملک کی سربراہی دینا الٹی بات ہے۔

علاوہ ازیں عورتوں کو حکم ہے وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ کہ تم اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو اور پردے کا بھی حکم ہے جب کہ کسی ملک کی سربراہی کے لئے پردے میں ہونا اور گھر میں جمے رہنا بڑی رکاوٹ ہے۔

نوٹ: قرآن پاک میں ملکہ سبا کی حکومت کا جو ذکر ہے تو وہ اس وقت کی بات ہے جب وہ کافر تھی۔

6- وہ عادل یعنی انصاف کرنے والا ہو اور امین یعنی سراپا امانت ہو۔ امانت کا ایک اہم جزو یہ ہے کہ حکومت کا کوئی عہدہ اور کوئی منصب کسی نااہل اور غیر مستحق کو نہ دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (سورہ نساء :58)

(اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کو ادا کرو اور لوگوں میں جب کوئی فیصلہ کرو تو انصاف سے کرو)۔

7- وہ قریشی ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے **الائمة من قریش۔**

8- وہ عالم دین ہو اور متقی و پرہیزگار ہو بامروت اور صاحب اخلاق ہو اس لئے کہ اسلامی حکومت کا سب سے اہم اور مقدم فریضہ شعائر اسلام کا اعزاز اور احترام اور ملت اسلامیہ اور شریعت محمدیہ کی ترویج اور علوم اسلامیہ کو زندہ رکھنا ہے اور یہ باتیں علم دین کے بغیر سرانجام نہیں پاسکتیں۔ اور جو شخص خود متقی اور پرہیزگار نہ ہوگا وہ ملک سے حکام کے ظلم و ستم اور رشوت ستانی وغیرہ کو دور نہیں کر سکے گا۔

امامت کے بارے میں مذہب شیعہ

شیعہ کہتے کہ امامت کے لئے عصمت بھی ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ امام ہاشمی ہو جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد فاطمی بھی ہو جیسے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما اور ان کی اولاد پھر ان کے نزدیک امام صاحب وحی بھی ہوتا ہے۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ عصمت نبوت کا خاصہ لازمہ ہے۔ سوائے نبی کے کوئی شخص معصوم نہیں۔ خاتم الانبیاء کے بعد کسی کو معصوم اور صاحب وحی ماننا در پردہ ختم نبوت کے انکار اور اجراء نبوت کے ہم معنی ہے۔ عصمت فقط نبوت کے لئے لازم ہے۔ امام و امیر کا کام خاتم الانبیاء کی شریعت کو جاری اور نافذ کرنا ہے لہٰذا امام و امیر کے لئے نبی کی شریعت کا عالم باعمل اور متقی و پرہیزگار ہونا ضروری ہے معصوم ہونا ضروری نہیں۔

نیز ائمہ اہل بیت نے کبھی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے متعدد مسائل میں حضرت ابن عباسؓ کے کہنے سے رجوع کیا۔ نیز شیعوں کی کتابوں میں ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے اس بات پر ناراض تھے کہ حضرت معاویہؓ سے کیوں صلح کی۔ حضرات شیعہ کے نزدیک جب حضرت حسن امام معصوم اور صاحب وحی و الہام تھے تو حضرت حسین کو ان کی صلح پر دل و جان سے ایمان لانا چاہئے تھا۔ ان کے ایسا نہ کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو معصوم نہ مانتے تھے۔

امیر مملکت اور خلیفہ کے فرائض

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ازالۃ الخفاء فی خلافۃ الخلفاء میں فرماتے ہیں کہ خلیفہ کے فرائض یہ ہیں:

1- خلیفہ اور اسلامی حکمران پر دین محمدی کو اس طرح محفوظ رکھنا واجب اور ضروری ہے جس طرح نبی ﷺ کی سنت مشہورہ سے ثابت ہوا ہے اور جس پر سلف صالحین کا اجماع اور اتفاق منعقد ہو چکا ہے۔

2- خلاف شرع امور کا مٹانا لازم اور فرض ہے بایں طور کہ مرتدوں اور زندیقوں اور ملحدوں کو قتل کرے اور اہل بدعت کو سزا دے (تاکہ دین میں کسی قسم کا خلل نہ آئے)۔

3- وہ ارکان اسلام اور شعائر دین کو قائم کرے مثلاً جمعہ اور جماعت اور روزہ اور زکوٰۃ اور حج کو اپنی جگہ میں ان ارکان کو بذات خود قائم کرے اور مقامات بعیدہ میں ائمہ مساجد اور زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو مقرر کرے اور مسلمانوں کو حج کرانے کے لئے ایک امیر حج مقرر کرے۔

4- جس قدر ممکن ہو وہ بذات خود علوم دینیہ کو زندہ کرے اور زندہ رکھے اور ہر شہر میں علوم دینیہ کے درس کے لئے مدرسین کا تقرر کرے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن مسعودؓ کو صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ کوفہ میں علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے مقرر فرمایا اور معقل بن یسار اور عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہما کو بصرہ میں علوم دینیہ کی تعلیم دینے کے لئے مدرس بنا کر بھیجا۔

5- جن لوگوں میں جھگڑے پیدا ہوں ان کے درمیان شریعت کے مطابق فیصلہ کرے اور اس کے لئے (جابجا) قاضی مقرر کرے۔

6- وہ تمام اسلامی علاقوں کو کافروں اور رہزنوں اور غاصبوں کے شر و فساد سے محفوظ رکھے۔

7- وہ دارالاسلام کی تمام سرحدوں کی دشمنوں سے حفاظت کرے بایں طور کہ فوجوں اور آلات جنگ سے سرحدوں کو معمور رکھے (تاکہ دشمن اچانک حملہ نہ کر سکے)۔

8- وہ (بشرط قدرت) دشمنان خدا سے جس طرح ممکن ہو جہاد کرے خواہ اس جہاد کی ابتداء مسلمانوں کی طرف سے ہو یا ابتداء کافروں کی طرف سے ہو اور مسلمانوں کی طرف سے مدافعت ہو۔

9- وہ جہاد کے لئے لشکروں کو تیار کرے اور ترتیب دے اور مجاہدین کے لئے وظیفہ اور تنخواہ مقرر کرے۔

10- وہ کافروں سے جزیہ اور خراج وصول کرے۔

11- وہ قاضیوں اور مفتیوں اور مدرسوں اور ائمہ مساجد کے مشاہرے اور وظیفے اور تنخواہیں اپنی رائے سے ایسے مقرر کرے کہ اسراف اور بخل دونوں سے خالی ہوں۔

12- وہ امور سلطنت کے لئے جن عمال اور حکام کا تقرر کرے وہ امانت دار اور عادل ہوں اور سلطنت اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہوں۔

13- وہ خود رعایا اور فوج اور حکام اور امراء لشکر اور قاضیوں وغیرہ کے حالات کی ہمیشہ پوری نگرانی اور خبر داری رکھے تاکہ سلطنت میں کسی قسم کی کوئی خیانت اور ظلم نہ ہونے پائے۔

14- اس کے ذمے یہ بھی واجب ہے کہ مسلمانوں کا کوئی کام اور عہدہ کسی کافر کے ہرگز سپرد نہ کرے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے نہایت سخت ممانعت فرمائی ہے۔ غرض یہ کہ مسلمان بادشاہ کے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ کافر کو کوئی وزارتی یا افسری یا کسی قسم کا کلیدی عہدہ سپرد کرے بلکہ کافروں سے مملکت کے سیاسی امور میں مشورہ لینا بھی جائز نہیں۔

طریقہ انتخاب امیر

انتخاب امیر کے چند طریقے ہیں۔

پہلا طریقہ:

اہل حل وعقد یعنی علماء وصلحاء اور ملک کے امراء واہل رائے ودانش لوگ جو اسلام اور مسلمانوں کے سچے خیر خواہ ہوں اپنے اتفاق اور رضامندی سے کسی ایسے شخص کو اپنا امیر منتخب کریں جس میں مذکورہ بالا تمام شرائط پائی جاتی ہیں تو وہ امیر اور خلیفہ بن جاتا ہے اور مسلمانوں پر اس کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انعقاد اسی طریقہ سے ہوا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اسی طریقے سے خلیفہ بنے۔

دوسرا طریقہ:

ایسا امیر وخلیفہ جس کی امانت ودیانت اور خیر خواہی لوگوں میں مسلم ہو وہ اپنی صوابدید سے کسی اہل کو نامزد کر دے جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لئے نامزد فرما دیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو نامزد کرنے سے پہلے دیگر اکابر صحابہ سے مشورہ بھی کیا تھا۔

تیسرا طریقہ:

امیر وخلیفہ (جو خود اہلیت کی شرائط پر پورا اترتا ہو) امارت وخلافت کو کسی معین جماعت میں دائر کر دے کہ جو امارت اور حکومت کی اہل ہو اور یہ کہہ دے کہ اس جماعت میں سے کسی ایک کو امیر منتخب کر لیا جائے۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت چھ آدمیوں کو نامزد کیا یعنی حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور یہ وصیت کر دی کہ ان چھ آدمیوں میں سے کسی ایک کو اپنا خلیفہ مقرر کر لینا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اسی طرح سے خلیفہ منتخب ہوئے۔

زبردستی امیر وخلیفہ بننا

امارت وخلافت کے انعقاد کا چوتھا طریقہ استیلاء یعنی غلبہ وتسلط ہے یعنی مذکورہ بالا تینوں طریقوں سے ہٹ کر کوئی شخص اپنے غلبہ وتسلط سے خلافت حاصل کر لے اور کسی طریقے سے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لے تو یہ

بھی امیر اور خلیفہ بن جائے گا۔

ویسے تو یہ طریقہ اصول کے خلاف ہے اور ہونا تو یہ چاہئے کہ ایسے امیر کو امارت سے ہٹا دیا جائے لیکن جس شخص میں اقتدار کی ہوس ہو اور اس نے بہت بڑی قوت بہم پہنچا کر پوری سلطنت پر قبضہ کر لیا ہو اور سلطنت کے وسائل بھی حاصل کر لئے ہوں ظاہر ہے اس حکومت کو ہٹانے کے لئے بہت بڑی قوت چاہئے اور وہ بھی مخلص اور جاں نثاروں کی۔ اول تو اتنی قوت فراہم ہونا دشوار ہے۔ اور اگر کوئی صاحب عزیمت جاں نثاروں کی کچھ جماعت لے کر مقابلہ پر آ ہی جائے جیسا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر حضرات نے کیا تو تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس میں خونریزی اور فساد کا اندیشہ زیادہ ہے اور اصلاح احوال کی امید کم ہے۔ اور ناکامی کی صورت میں اس بات کا بھی قوی اندیشہ ہے کہ حکمران مسلمانوں اور اسلام کو زیادہ نقصان پہنچائیں۔ اور اگر دوسری عام قوتوں کے ساتھ شریک ہو کر اس حکمران کو معزول کرنے اور ہٹانے میں کامیاب بھی ہو گئے تو اس کا بھی احتمال ہے کہ اس کی جگہ ایسا شخص آ جائے جو اسی کی طرح کا ہو یا اس سے بھی بدتر ہو۔ لہٰذا جب ایسے حکمران کو ہٹانے کی قوت نہ ہو یا اس کو ہٹانے میں فتنہ وفساد یقینی ہو تو اس وقت مناسب یہی ہے کہ صبر کیا جائے اور حکمران اور حالات کی جہاں تک ممکن ہو اصلاح کی کوشش کی جائے۔

تنبیہ: جب اہل حل وعقد نے امیر منتخب کرنا ہو تو ضروری ہے کہ اس شخص کو منتخب کریں جس میں امیر کی تمام شرائط پائی جاتی ہوں۔ اگر کوئی ایسا نہ ملے تو پھر جس میں زیادہ سے زیادہ شرائط پائی جاتی ہوں۔ البتہ جب کوئی اپنی قوت وغلبہ سے زبردستی امیر وخلیفہ بن جائے تو تمام شرائط کا اس میں پایا جانا ضروری نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ کسی شرط کے نہ پائے جانے کی جہ سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ امارت وخلافت نہیں ہے۔ سلاطین عثمانیہ اگرچہ قریشی نہیں تھے لیکن اسی ضابطہ کے تحت ان کی امارت بھی خلافت ہی تھی۔ یہ کہنا کہ چونکہ وہ قریشی نہیں تھے لہٰذا ان کی امارت کو خلافت نہیں کہہ سکتے صحیح نہیں ہے۔

باب: 18

ایمان کا بیان

لغت عرب میں ایمان کے معنی تصدیق کے ہیں یعنی کسی کو سچا سمجھ کر اس کی بات پر یقین کرنا اور اس کو قبول کرنا اور ماننا۔

اصطلاح شریعت میں وہ تمام دینی امور جن کا دین محمدی سے ہونا یقینی اور بدیہی طور پر ثابت ہے ان کو نبی کے بھروسہ پر دل سے سچا جاننے اور ماننے کو ایمان کہتے ہیں۔

یہ چیزیں بہت سی ہیں لیکن ان میں سے پانچ چیزوں کی اور بھی زیادہ تاکید ہے۔

1- اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات جیسی وہ ہیں۔

2- فرشتے

3- تمام انبیاء علیہم السلام

4- کتابیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر خلق کی ہدایت کے لئے نازل کی تھیں۔

5- مرنے کے بعد زندہ ہونا اور قیامت کا آنا۔

قرآن مجید میں ان چیزوں پر ایمان لانے کی بہت تاکید ہے اور جا بجا ان کا ذکر ہے مثلاً:

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (سورہ نساء:126)

”اے ایمان والو تم اعتقاد رکھو اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ اور اس کتاب کے ساتھ جو اس نے رسول پر نازل فرمائی اور ان کتابوں کے ساتھ جو کہ پہلے نازل ہو چکی ہیں۔ اور جو شخص اللہ کا انکار کرے اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور روز آخرت کا تو وہ گمراہی میں بڑی دور جا

پڑا۔"

اور حدیث میں بھی ان کا بہت ذکر ہے وہ حدیثیں جن میں ان باتوں کا مشترکہ مضمون وارد ہے ان کا عدد حد تواتر کو پہنچ گیا ہے۔ چنانچہ بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر آنحضرت ﷺ سے ایمان کی تفسیر پوچھی تو آپ نے فرمایا ان تـومـن بالله وملئكته و كتبه و سله واليوم الآخر ایمان یہ ہے کہ اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو اور قیامت کے دن کو حق جانے اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ خیر اور شر اللہ کی تقدیر سے ہے اس پر بھی ایمان لائے۔

زبان سے اقرار

امام شمس الائمہ اور امام فخر الاسلام کے نزدیک ایمان کے رکن دو ہیں۔ ایک تصدیق قلب اور دوسرے زبان سے اقرار۔ لیکن ان کے نزدیک بھی کسی عذر اور مجبوری سے مثلاً گونگا ہو یا زبانی اقرار پر جان جانے کا خوف ہو تو زبانی اقرار ساقط ہو سکتا ہے۔

جمہور محققین اور امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کے نزدیک ایمان فقط تصدیق قلبی کا نام ہے۔ رہا زبان سے اقرار تو وہ دنیا میں اس پر مسلمان ہونے کا حکم لگانے کے لئے شرط ہے۔ چونکہ تصدیق قلبی ایک پوشیدہ چیز ہے جس کو دوسرا شخص نہیں جان سکتا لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے لئے کوئی علامت ہو کہ اس سے وہ تصدیق معلوم ہو جایا کرے۔ سو وہ علامت زبان کا اقرار ہے۔

جمہور کے قول کی تائید ان آیات سے ہوتی ہے۔

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ (سوره مجادله: 22)

"ان لوگوں کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے"۔

وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ (سوره نحل: 106)

"اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو"۔

"وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ (سوره حجرات: 14)"

"اے اعراب ابھی تمہارے دل میں ایمان داخل نہیں ہوا ہے"۔

ان آیات سے ثابت ہوا کہ ایمان دل سے ہوتا ہے نہ کہ زبان سے۔

ایمان اور اعمال صالحہ

اعمال صالحہ سے ایمان کو تقویت اور رونق حاصل ہوتی ہے لیکن اعمال ایمان کا جزو نہیں۔ اسی وجہ سے برے اعمال کرنے سے ایمان ختم نہیں ہوتا البتہ رونق جاتی رہتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے۔

1- قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ کی صحت کے لئے ایمان کو شرط ٹھہرایا ہے اور قاعدہ ہے کہ مشروط شرط میں داخل نہیں ہوتا وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ (سورہ نساء :124) یعنی جو کرے نیک کام خواہ مرد ہو خواہ عورت ہو بشرطیکہ مومن ہو۔

2- قاعدہ ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ ایک دوسرے کے غیر ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں اعمال کو ایمان پر عطف کیا اور اعمال کو معطوف اور ایمان کو معطوف علیہ قرار دیا ہے لہٰذا اس قاعدے کے مطابق اعمال ایمان سے غیر ہونے چاہئیں۔ فرمایا

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔

''یعنی جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے۔''

3- جس شخص سے بعض برے اعمال صادر ہوں اس کو بھی مومن کہا۔

وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا (سورہ حجرات :9)

''اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑائی کریں۔ حالانکہ لڑائی کرنا گناہ ہے۔''

جمہور محدثین اور امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ اعمال صالحہ کو کامل ایمان کا جزو کہتے ہیں یعنی اعمال صالحہ کے بغیر ایمان کامل نہ ہوگا ہاں ناقص ایمان رہے گا اسی لئے یہ حضرات بھی اس کے قائل ہیں کہ بے عمل اور بدعمل کو اگر سزا ہوئی تو بالآخر مغفرت ہو جائے گی۔

اوپر والا قول جو کہ حنفیہ کا ہے اور اس قول میں حقیقی فرق نہیں ہے صرف نزاع لفظی (یعنی لفظی فرق واختلاف) ہے۔

البتہ معتزلہ اعمال صالحہ کو نفس ایمان کا جزو کہتے ہیں اور جس سے گناہ کبیرہ ہو جائے کہتے ہیں کہ وہ مومن نہیں رہا اگرچہ کافر بھی نہیں ہوا۔

ایمان کا کم وبیش ہونا

اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ایمان کم وبیش نہیں ہوتا الایمان لا یزید ولا ینقص اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ایمان زیادہ اور کم ہوتا ہے الایمان یزید وینقص۔ (نبراس ص

امام ابوحنیفہؒ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایمان جو تمام اہل ایمان میں قدر مشترک ہے اور جس پر ایمانی اخوت کا دارومدار ہے اور جس ایمان سے تمام مسلمان رشتہ اخوت میں منسلک ہوتے ہیں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (سورہ حجرات:10)

’’مسلمان تو بھائی بھائی ہیں۔‘‘

یہ ایمان زیادہ اور کم نہیں ہوتا البتہ یقین، معرفت اور طاعات وحسنات کے اعتبار سے ایمان کے کمال اور اس کی قوت میں کمی بیشی بھی ہوتی ہے۔ جس قدر یہ باتیں زیادہ ہوں گی اسی قدر ایمان زیادہ کامل وقوی ہوگا۔ پس عام مومنوں کا ایمان حضرات انبیاء کرام کے ایمان جیسا نہ ہوگا اور نہ ہوسکتا ہے اس لئے کہ حضرات انبیاء کا ایمان بوجہ کمال یقین اور کمال معرفت الٰہی اور کمال طاعات اس درجہ بلند ہے کہ عام مومنوں کا ایمان وہاں تک نہیں پہنچ سکتا اگرچہ نفس ایمان میں دونوں مشترک ہیں۔

ایمان اور اسلام

لغوی معنی کے اعتبار سے دونوں میں فرق کیا جاتا ہے۔ ایمان تصدیق قلبی کو کہتے ہیں اور اسلام اطاعت وفرمانبرداری کا نام ہے۔ اسی فرق کے اعتبار سے حدیث جبرئیل میں اسلام کے بارے میں علیحدہ سوال ہے اور ایمان کے بارے میں علیحدہ ہے اور دونوں کے جواب بھی مختلف دیئے۔ اسلام کے بارے میں سوال کے جواب میں نماز پنجگانہ، رمضان کے روزوں، زکوٰۃ اور حج کا ذکر کیا گیا۔ اسی طرح قرآن پاک میں آیا ہے **قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (سورہ حجرات:14)**

یہ (بعضے) گنوار (بنی اسد وغیرہ کے آپ کے پاس آ کر جو ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں یہ اس میں کئی امور قبیحہ کے مرتکب ہوتے ہیں ایک تو جھوٹ کے کہ تصدیق قلبی کے بغیر محض زبان سے) کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ آپ فرمادیجئے تم ایمان تو نہیں لائے (کیونکہ وہ موقوف ہے تصدیق قلبی پر اور وہ موجود نہیں **وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُم**) لیکن (ہاں) یوں کہو کہ (ہم مخالفت چھوڑ کر) مطیع ہوگئے اور (باقی رہا) ایمان (تو وہ) ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

مگر شریعت کی اصطلاح میں دونوں کا ایک ہی مصداق ہے کیونکہ ایمان اگرچہ تصدیق قلبی کا نام ہے مگر اس کے ساتھ عملی اطاعت اور فرمانبرداری بھی فرض اور ضروری ہے اور اسلام اگرچہ اطاعت وفرمانبرداری کا نام

ہے لیکن شریعت میں وہی اطاعت وفرمانبرداری معتبر ہے جس کے ساتھ تصدیق قلبی ہو ورنہ محض ظاہری اطاعت تصدیق قلبی کے بغیر ذرہ برابر معتبر نہیں۔

ایمان میں شک نہ ہونا چاہیئے

جس نے نبی ﷺ کی دل سے تصدیق کی اور زبان سے اقرار کیا تو وہ شخص قطعی مومن بن گیا لہٰذا وہ شک کے طور پر یوں نہ کہے کہ ”میں مومن ہوں انشاءاللہ“ بلکہ انشاءاللہ کے لفظ کو ترک کرے۔ البتہ اگر اس نیت سے کہے کہ خاتمہ کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے یا متبرک سمجھ کر کہے تو درست ہے لیکن بہر حال نہ کہنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس کلمہ کے کہنے سے سننے والے کو اس کا شک ثابت ہوگا اور یہ بھی برا ہے۔

قبض روح اور معائنہ عذاب کے وقت ایمان لانا مقبول نہیں

اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان وہی مقبول اور کارآمد ہے جو بالغیب ہو یعنی جن چیزوں کی خدا کے پیغمبر نے خبر دی ہے ان کو بغیر دیکھے نبی کے بھروسہ اور اعتماد پر بے چون وچرا قبول کرے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کے شروع ہی میں متقین کی صفت اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (جو یقین لائے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر) بیان فرمائی اور اس ایمان بالغیب پر ہدایت اور فلاح کا وعدہ فرمایا۔ اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (سورہ بقرہ:5) بس یہی لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے رب کی طرف سے ملی ہے اور یہی لوگ پورے کامیاب ہیں۔

لہٰذا جو شخص مرنے کے وقت فرشتوں کو اور احوال آخرت کو آنکھوں سے دیکھ کر ایمان لائے تو وہ ایمان معتبر نہ ہوگا۔ قرآن پاک میں ہے۔

1۔ لَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ (سورہ نساء:18)

”ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں جو گناہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب موت آگئی تو اس وقت کہتے ہیں کہ میں توبہ کرتا ہوں۔“

2۔ فَلَمْ یَكُ یَنْفَعُهُمْ اِیْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا (سورہ مومن:85)

”سو ان کو ان کا یہ ایمان لانا نافع نہ ہوا جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔“

کبیرہ گناہ سے ایمان نہیں جاتا

مومن گناہ کرنے سے ایمان سے خارج نہیں ہوتا اگرچہ گناہ کبیرہ ہو اس لئے کہ ایمان کی اصل حقیقت تصدیق قلبی ہے اور اعمال صالحہ ایمان کی اصل حقیقت میں داخل نہیں۔ اس لئے گناہ کرنے سے اصل ایمان سے تو خارج نہیں ہوتا مگر اس کا ایمان ناقص ضرور ہو جاتا ہے اور اس کی رونق جاتی رہتی ہے۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کرنے سے ایمان جاتا رہتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک اعمال صالحہ ایمان میں داخل ہیں اور کافر بھی نہیں ہوتا ہے۔ یہ معتزلہ کی پہلی بدعت تھی جو انہوں نے حضرت حسن بصریؒ کے روبرو ایجاد کی تھی اور کفر و ایمان کے بیچ انہوں نے ایک واسطہ اور درجہ نکالا۔

خوارج کے نزدیک سارے ہی گناہ کبیرہ ہوتے ہیں اور ان سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ انہوں نے **من ترك الصلوٰة متعمدا فقد كفر** (جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کی اس نے کفر کیا) جیسی حدیثوں سے استدلال کیا ہے۔ لیکن جب پیچھے ذکر کردہ نصوص (قرآنی آیات واحادیث) میں کبیرہ گناہ کرنے والے کو مومن کہا گیا ہے تو ضروری ہے کہ **من ترك الصلوة متعمدا فقد كفر** جیسی حدیثوں سے ان کا ظاہری معنی مراد نہ لیا جائے بلکہ تاویل کی جائے یعنی دوسرے مناسب معنی مراد لئے جائیں۔ لہٰذا یہ مراد ہوگا کہ اس نے کافروں کا سا کام کیا۔

نیز قرآن پاک کی یہ آیت بھی ہے **اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ** (سورہ نساء:48) بے شک اللہ نہ بخشے گا یہ کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور بخش دے گا اس کے سوا جس کے لئے چاہے۔

اس آیت میں سوائے شرک کے سب گناہوں کی بخشش کی بشارت ہے جس کے لئے اللہ چاہیں جب کہ کافر اور مشرک کے لئے تو بالاتفاق بخشش نہیں ہے اور توبہ کرنے سے بالاتفاق بخشش ہے تو اگر بے توبہ گناہ بھی کفر ہو تو پھر اللہ تعالیٰ بخشش کس کے لئے ہوگی؟

دارومدار خاتمہ پر ہے

ایمان اور کفر کا مدار خاتمہ پر ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ تمام عمر ایمان یا کفر پر رہا اور اخیر میں جا کر حالت بدل گئی تو اعتبار خاتمہ کا ہوگا۔

کسی ویرانے میں بالغ ہونے والے اور وہ شخص جس کو دعوت اسلام نہ پہنچی ہو ان کے اسلام

وایمان کا مسئلہ

امت کا اس پر اجماع ہے کہ حکم دینے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور اللہ تعالیٰ جس کام کے کرنے کا حکم دیتے ہیں اس میں حسن یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے مدح وثواب کا استحقاق پایا جاتا ہے اور جس کام سے روکتے ہیں اس میں قبح یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے مذمت اور عقاب کا استحقاق پایا جاتا ہے۔

لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ معنی میں حسن وقبح کو ہم اپنی عقل سے جان سکتے ہیں یا ان کا علم صرف شرع ہی سے ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ حسن وقبح شرعی ہیں یا عقلی ہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔

اشاعرہ کا کہنا ہے کہ یہ شرعی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس کام کا حکم دیا اس میں حسن ہے یعنی مدح وثواب کا استحقاق ہے اور جس کام سے منع کر دیا اس میں قبح یعنی مذمت وعقاب کا استحقاق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ممنوع کو کرنے کا حکم دے دیں تو اس میں حسن پیدا ہو جائے گا اور مامور سے منع کر دیں تو اس میں قبح موجود ہو جائے گا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے شراب پینے سے منع کیا ہے لہٰذا شراب پینے میں قبح ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ شراب پینے کا حکم دے دیں تو اس میں حسن پیدا ہو جائے گا۔

2- ماتریدیہ اور معتزلہ کا کہنا ہے کہ حسن وقبح بمعنی مذکور عقلی ہیں۔ یعنی کسی فعل میں مدح وثواب کے استحقاق کو اور کسی دوسرے فعل میں مذمت وعقاب کے استحقاق کو ہم اپنی عقل سے سمجھ سکتے ہیں اور یہ کوئی شرع پر موقوف نہیں ہیں۔ غریب پروری اور محسن کا شکر ادا کرنے میں حسن ہے اور ناحق قتل کرنے میں قبح ہے ان کو ہم عقل سے سمجھ سکتے ہیں۔

ماتریدیہ اور معتزلہ کا معنی مذکور میں حسن وقبح کو عقلی مان لینے کے بعد پھر ان میں اختلاف ہوا۔

1- معتزلہ کہتے ہیں کہ حسن وقبح کا ادراک کر کے عقل فیصلہ دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس حسن والے کام کے وجوب کا حکم دیا ہوا ہے اور اس قبح کی حرمت کا حکم دیا ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جاتا ہے کہ حسن وقبح اللہ تعالیٰ پر حکم کرنے کو واجب کر دیتا ہے۔ اور اگر بالفرض رسول نہ بھیجے جاتے اور شرع نہ آتی تب بھی یہ احکام واجب ہوتے۔

2- ماتریدیہ کہتے ہیں کہ حسن وقبح سے فعل میں یہ استحقاق پیدا ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا حکم نازل فرما دیں۔ لیکن جب تک اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم نہ آئے وہ حکم موجود نہ سمجھا جائے گا۔

3- ابن ہمامؒ کہتے ہیں کہ گو حسن وقبح عقلی ہیں لیکن اس سے نہ تو حکم واجب ہوتے ہیں اور نہ ہی بندے کے

ذمہ کے ساتھ حکم کے تعلق کا پتہ چلتا ہے۔

پھر ماتریدیہ کا آپس میں کچھ اختلاف ہے۔

1- بعض بڑے بڑے حضرات مثلاً امام ابومنصور ماتریدی، امام فخر الاسلام، صاحب میزان اور صدر الشریعہ وغیرہ اس بات کے قائل ہیں اللہ تعالیٰ کے بعض احکام کا ادراک عقل بذات خود کرسکتی ہے مثلاً ایمان کا اور محسن کے شکر ادا کرنے کا۔ اس وجہ سے یہ حضرات ہر اس شخص کیلئے ایمان کو واجب قرار دیتے ہیں کہ جس کو اتنی زندگی ملی ہو کہ اس میں غور وفکر کرسکتا ہو۔ اور کفر کو حرام قرار دیتے ہیں خواہ اس کو رسول کی دعوت پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ اس بارے میں امام ابوحنیفہؒ سے بھی روایت یہ ہے کہ کسی بھی شخص کے لئے اپنے خالق کی عدم معرفت اور جہالت کا کوئی عذر قابل سماع نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کے بے شمار دلائل آفاق وانفس میں پھیلے ہوئے ہیں۔

2- باقی حضرات یہ کہتے ہیں کہ آدمی احکام کا مکلّف ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کو دعوت پہنچے۔ لہٰذا وہ کافر جس کو دعوت اسلام نہ پہنچی ہو وہ ایمان کا مکلّف ہی نہیں ہے اور آخرت میں اس سے کفر پر مواخذہ نہیں ہوگا۔

ان تمام اقوال کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص مثلاً کسی ویرانے یا پہاڑ پر بالغ ہوا ہو اس کے بارے میں۔

1- معتزلہ کہتے ہیں کہ اگر اس نے کفر کیا تو فعل قبیح پر اور اگر ایمان وکفر دونوں سے خالی رہا تو ترک حسنات پر اس سے مواخذہ ہوگا اور اگر ایمان کو اختیار کیا تو حسنات کے کرنے پر ثواب ہوگا۔

2- بعض بڑے ماتریدیہ جن کا ذکر اوپر ہوا وہ کہتے ہیں کہ اگر اس نے کفر کو اختیار کیا تو اس پر مواخذہ ہوگا اور اگر اس نے نہ کفر کو اختیار کیا نہ ایمان کو تو ترک ایمان پر صرف اس صورت میں مواخذہ ہوگا جب اسکو غور وفکر اور تامل کرنے کے بقدر زندگی ملی ہو۔

3- اشاعرہ اور ابن ہمام کہتے ہیں کہ کسی صورت میں مواخذہ نہ ہوگا اگرچہ وہ شرک بھی کرتا رہا ہو۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ایسے شخص کے بارے میں خاصا اختلاف ہے کہ آخرت میں اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا اور کوئی قطعی دلیل اس بارے میں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اصل اس میں یہی ہے کہ اس کو ہم خدا کے سپرد کردیں کہ وہی بہتر جانتے ہیں کہ آخرت میں وہ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ فرمائیں گے۔

باب: 19

شرک کا بیان

شرک یہ تو ہے ہی کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھے اور اس کے مقابل جانے لیکن شرک بس اسی پر موقوف نہیں ہے بلکہ شرک یہ بھی ہے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات والا صفات کے لئے مخصوص فرمالی ہیں اور بندوں کے لئے بندگی کی علامتیں قرار دی ہیں انہیں غیروں کے آگے بجالایا جائے۔

پھر جس کو شریک ٹھہرائے اس میں نبی، ولی، جن، شیطان، وغیرہ سب برابر ہیں جس کو بھی شریک ٹھہرایا جائے گا، شرک ہوگا اور کرنے والا مشرک ہو جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بت پرستوں کی طرح یہودیوں اور عیسائیوں پر بھی عتاب کیا ہے حالانکہ وہ بت پرست نہ تھے البتہ انبیاء اور اولیاء کو شریک ٹھہراتے تھے۔ فرمایا:

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوْا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (سورہ توبہ :31)

(ترجمہ: ’’انہوں نے اپنے علماء کو اور درویشوں کو اللہ کو چھوڑ کر رب بنالیا اور مسیح بن مریم کو بھی حالانکہ انہیں ایک ہی اللہ کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں جو مشرکوں کے شرک سے پاک اور بلند اور برتر ہے۔‘‘

یعنی اللہ کو تو سب سے بڑا رب جانتے ہیں اور اس سے چھوٹے اور رب کے بھی قائل ہیں جو ان کے عالم اور درویش ہیں۔ انہیں اس بات کا حکم نہیں ملا۔ وہ شرک کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو تن تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا سب اس کے بے بس بندے ہیں اور بے بسی میں برابر ہیں جیسا کہ فرمایا:

اِنْ كُلُّ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِى الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ☆ لَقَدْ اَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ☆ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ☆ (سورہ مریم:93,94,95)

(ترجمہ: ’’آسمان وزمین کا ایک ایک شخص رحمٰن کے سامنے غلامانہ حیثیت میں آنے والا ہے۔ رب نے انہیں شمار کر رکھا ہے اور ایک ایک کو گن رکھا ہے اور سب انسان خدا کے سامنے فرداً فرداً آنے والے

ہیں۔“)

یعنی انسان ہو یا فرشتہ خدا کا غلام ہے۔ خدا کے سامنے اس کا اس سے زیادہ رتبہ نہیں۔ یہ خدا کے قبضے میں ہے اور عاجز و بے بس ہے اس کے اختیار میں کچھ نہیں، سب کچھ مالک الملک کے اختیار میں ہے۔ خدا سب پر قابض و متصرف ہے کسی کو دوسرے کے قبضے میں نہیں دیتا۔ اس کے سامنے حساب و کتاب کے لئے ہر شخص حاضر ہونے والا ہے۔ وہاں نہ کوئی کسی کا وکیل بنے گا اور نہ حمایتی۔

اب یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کون کون سی چیزیں اپنی ذات کے لئے مخصوص فرمائی ہیں تاکہ ان میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ ایسی چیزیں بے شمار ہیں۔ یہاں چند چیزوں کو بیان کر کے ان کے شرک ہونے کو قرآن و حدیث سے ثابت کیا جائے گا تاکہ ان کے ذریعہ سے دوسری باتیں سمجھی جا سکیں۔

1- پہلی چیز یہ ہے کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور اس کا علم ہر چیز کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چیز سے ہر وقت خبردار ہے خواہ وہ چیز دور ہو یا قریب، سامنے ہو یا پیچھے، چھپی ہوئی ہو یا کھلی، آسمانوں میں ہو یا زمینوں میں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہو یا سمندر کی تہہ میں ہو اگر کوئی اٹھتے بیٹھتے کسی غیر اللہ کا نام لے یا دور و نزدیک سے اسے پکارے کہ وہ اس کی مصیبت رفع کر دے یا دشمن پر اس کا نام پڑھ کر حملہ کرے یا اس کے نام کا ختم پڑھا جائے یا اس کے نام کا ورد رکھے یا اس کی خیالی صورت ذہن میں جمائے اور یہ عقیدہ رکھے کہ جس وقت میں زبان سے اس کا نام لیتا ہوں یا دل میں اس کا تصور آتا ہے یا اس کی صورت کا خیال کرتا ہوں یا اس کی قبر کا دھیان کرتا ہوں تو اس کو خبر ہو جاتی ہے۔ میری کوئی بات اس سے چھپی ہوئی نہیں۔ اور مجھ پر جو حالات گزرتے ہیں جیسے بیماری و صحت، فراخی و تنگی، موت و زیست اور غم و مسرت اس کو ان سب کی ہر وقت خبر رہتی ہے، جو بات میری زبان سے نکلتی ہے وہ اسے سن لیتا ہے اور میرے دل کے خیالات اور تصورات سے واقف رہتا ہے۔ ان تمام باتوں سے شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ یہ شرک فی العلم ہے یعنی حق تعالیٰ جیسا علم غیر اللہ کے لئے ثابت کرنا۔ یہ شرکیہ عقیدہ ہے گو یہ عقیدہ کسی بڑے سے بڑے انسان سے رکھے یا مقرب سے مقرب فرشتے سے اگرچہ یہ سمجھا جائے کہ یہ علم ان کو اپنی ذات سے حاصل ہے یعنی ان کا یہ علم ذاتی سمجھا جائے یا خدا کا عطا کیا ہوا ہر صورت میں شرکیہ عقیدہ ہے۔

2- کائنات میں ارادے سے تصرف و اختیار کرنا، حکم چلانا، خواہش سے مارنا جلانا، فراخی و تنگی، تندرستی

وبیماری، فتح وشکست، اقبال واد بار دینا، مرادیں برلانا، بلائیں ٹالنا، نازک دور میں دستگیری کرنا اور وقت پڑنے پر مدد کرنا خدا ہی کی شان ہے کسی غیر اللہ کی یہ شان نہیں خواہ وہ کتنا ہی بڑا انسان یا فرشتہ کیوں نہ ہو۔

پھر جو شخص کسی غیر اللہ میں ایسا تصرف ثابت کرے اس سے مرادیں مانگے اور اسی غرض سے اس کے نام کی منت مانے یا قربانی کرے اور آڑے وقت اس کو پکارے کہ وہ اس کی بلائیں ٹال دے ایسا شخص بھی شرک کا مرتکب ہے اور اس کو شرک فی التصرف کہا جاتا ہے۔ یعنی اللہ کا سا تصرف غیر اللہ میں مان لینا شرک ہے خواہ وہ ذاتی مانا جائے یا خدا کا دیا ہوا ہر صورت میں یہ عقیدہ شرکیہ ہے۔

3- اللہ تعالیٰ نے بعض کام اپنی تعظیم کے لئے مخصوص فرما دیئے ہیں جن کو عبادات کہا جاتا ہے جیسے سجدہ، رکوع، ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، خدا کے نام پر خیرات کرنا اس کے نام کا روزہ رکھنا اور اس کے مقدس گھر کی زیارت کے لئے دور دور سے سفر کر کے آنا اور ایسی ہیئت میں آنا کہ لوگ پہچان جائیں کہ یہ زائرین حرم ہیں۔ راستے میں خدا کا ہی نام پکارنا، نامعقول باتوں سے اور شکار سے بچنا، پوری احتیاط سے جا کر اس کے گھر کا طواف کرنا، اس کی طرف سجدہ کرنا، اس کی طرف قربانی کے جانور لے جانا، وہاں منتیں ماننا، کعبہ پر غلاف چڑھانا، کعبہ کی چوکھٹ کے آگے کھڑے ہو کر دعائیں مانگنا دین ودنیا کی بھلائیاں طلب کرنا، حجر اسود کو چومنا، کعبہ کی دیوار سے منہ ملنا اور چھاتی لگانا، اس کا غلاف پکڑ کر دعائیں مانگنا، اس کے چاروں طرف روشنی کرنا، اس میں خادم بن کر رہنا جھاڑو دینا، فرش بچھانا، حاجیوں کو پانی پلانا وضو کے لئے اور غسل کے لئے پانی مہیا کرنا۔ آب زمزم کو تبرک سمجھ کر پینا، بدن پر ڈالنا، خوب جی بھر کر پینا۔ آپس میں تقسیم کرنا۔ عزیز واقارب کے لئے لے جانا۔ اس کے آس پاس جنگل کا ادب واحترام کرنا وہاں شکار نہ کرنا درخت نہ کاٹنا۔ گھاس نہ اکھاڑنا یہ سب کام اللہ نے اپنی عبادت کے مسلمانوں کو بتائے ہیں۔

اگر کوئی شخص نبی کو یا ولی کو یا کسی سچی یا جھوٹی قبر کو، یا کسی کے مزار یا چلے کو یا کسی کے مکان ونشان کو یا کسی کے تبرک وتابوت کو سجدہ کرے یا رکوع کرے یا اس کے لئے روزہ رکھے یا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جائے یا چڑھاوا چڑھائے یا ان کے نام کی چھڑی کھڑی کرے یا جاتے وقت الٹے پاؤں چلے یا قبر کو چومے یا مزاروں پر چراغ جلائے اور روشنی کا انتظام کرے یا ان کی دیواروں پر غلاف چڑھائے یا قبر پر چادر چڑھائے یا مورچھل جھلے یا

شامیانہ تانے یا ان کی چوکھٹ کا بوسہ لے یا ہاتھ باندھ کر دعائیں مانگے یا مجاور بن کر خدمت کرے یا اس کے آس پاس کے جنگل کا ادب کرے غرض کہ اور اسی قسم کی باتیں کرے تو اس نے کھلا شرک کا کام کیا۔ اس کو شرک فی العبادت کہتے ہیں، یعنی غیر اللہ کے لئے اللہ کی سی تعظیم کرنا، خواہ یہ عقیدہ ہو کہ وہ ذاتی اعتبار سے ان تعظیموں کے لائق ہے یا خدا ان کی اس طرح تعظیم کرنے سے خوش ہوتا ہے اور اس کی تعظیم کی برکت سے بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ ہر صورت میں یہ شرکیہ عقیدہ ہے۔

4- حق تعالیٰ نے بندوں کو یہ ادب سکھایا ہے کہ وہ اپنے دنیوی کاموں میں اللہ کو یاد رکھیں اور اس کی تعظیم بجا لائیں تاکہ ایمان بھی سنور جائے اور کاموں میں برکت بھی ہو جیسے وقت پڑنے پر اللہ کی نذر مان لینا اور مشکل کے وقت اسی کو پکارنا اور کام شروع کرتے وقت برکت کے لئے اسی کا نام لینا۔ اگر اولاد ہو تو اس نعمت کے شکریے کے لئے اس کے نام پر جانور ذبح کرنا۔ اولاد کا نام عبداللہ، عبدالرحمٰن، خدا بخش، اللہ دتہ، امت اللہ اور اللہ دی وغیرہ رکھنا۔ کھیتی کی پیداوار میں سے تھوڑا سا غلہ اس کے نام کا نکالنا۔ پھلوں میں سے کچھ پھل اس کے نام کے نکالنا۔ جانوروں میں سے کچھ جانور اللہ کے نام کے مقرر کرنا اور اس کے نام کے جو جانور بیت اللہ کو لے جائے جائیں ان کا ادب واحترام بجالانا یعنی نہ ان پر سوار ہونا نہ انہیں لادنا۔ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں خدا کے حکم پر چلنا۔ جن چیزوں کے استعمال کا حکم ہے انہیں استعمال کرنا اور جن کی ممانعت ہے ان سے باز رہنا دنیا میں گرانی وارزانی، صحت وبیماری، فتح وشکست، اقبال وادبار اور رنج ومسرت جو کچھ بھی پیش آتی ہے سب کو خدا کے اختیار میں سمجھنا۔ ہر کام کا ارادہ کرتے وقت انشاء اللہ کہنا مثلاً یوں کہنا کہ انشاء اللہ ہم فلاں کام کریں گے۔ خدا کے اسم گرامی کو اس عظمت کے ساتھ لینا جس سے اس کی تعظیم نمایاں ہو اور اپنی غلامی کا اظہار ہوتا ہو جیسے یوں کہنا ہمارا رب ہمارا مالک، ہمارا خالق، ہمارا معبود وغیرہ۔ اگر کسی موقع پر قسم کھانے کی ضرورت پڑ جائے تو اسی کے نام کی قسم کھانا یہ تمام باتیں اور اسی قسم کی دیگر باتیں اللہ پاک نے اپنی تعظیم ہی کے واسطے مقرر فرمائی ہیں۔

جو کوئی اسی قسم کی تعظیم غیر اللہ کے لئے کرے مثلاً کام رکا ہوا ہو یا بگڑ رہا ہو اس کو چالو کرنے یا سنوارنے کے لئے غیر اللہ کی نذر مان لی جائے۔ اولاد کا نام عبدالنبی، امام بخش رکھا جائے۔ کھیت وباغ کی پیداوار میں ان کا حصہ رکھا جائے۔ جب پھل تیار ہو کر آئیں تو پہلے ان کا حصہ الگ کر دیا جائے تب اسے استعمال میں لایا جائے۔ جانوروں میں اس کے نام کے جانور مقرر کر دیئے جائیں پھر ان کا ادب واحترام بجالایا جائے۔

پانی سے یا چارے سے انہیں نہ ہٹایا جائے یا پتھر سے انہیں نہ مارا جائے اور کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں رسموں کا خیال رکھا جائے کہ صرف فلاں فلاں کھانا ہی کھائیں فلاں فلاں کپڑا پہنیں۔ دنیا کی بھلائی برائی کو انہیں کی طرف منسوب کیا جائے کہ فلاں فلاں ان کی لعنت میں گرفتار ہے پاگل ہوگیا ہے۔ فلاں محتاج ہے انہیں کا دھتکارا ہوا تو ہے اور دیکھو فلاں کو انہوں نے نوازا تھا آج سعادت و اقبال اس کے پاؤں چوم رہے ہیں۔ فلاں تارے کی وجہ سے قحط آیا۔ فلاں کام فلاں ساعت میں فلاں دن شروع کیا گیا تھا آخر کار پورا نہ ہوا یا یہ کہا جائے کہ اگر اللہ اور رسول چاہے گا تو میں آؤں گا یا پیر صاحب کی مرضی ہوگی تو کام ہوگا یا گفتگو میں غیر اللہ کیلئے داتا، خداوند خدائے گان، مالک الملک، شہنشاہ جیسے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ قسم کی ضرورت پڑ جائے تو نبی کی یا علی کی یا امام و پیر کی یا ان کی قبروں کی قسم کھائی جائے ان تمام باتوں سے شرک پیدا ہوتا ہے اس کو شرک فی العادت کہتے ہیں یعنی عادت کے کاموں میں اللہ کی سی تعظیم غیر اللہ کے لئے کی جائے۔ شرک کی ان چاروں قسموں کا قرآن و حدیث میں صراحت کے ساتھ بیان آیا ہے۔

شرک کی برائی

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَمَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا (سورہ نساء :115)

''یاد رکھو اللہ پاک اپنے ساتھ شرک کئے جانے کو معاف نہیں فرماتا اور اس کے سوا جسے چاہے معاف فرمادے اور جس نے شرک کیا وہ راہ سے بہت دور بھٹک گیا۔''

یعنی اللہ کی راہ سے بھٹکنا یہ بھی ہے کہ انسان حلال و حرام میں تمیز نہ کرے، چوری کرے، بیکاری میں مبتلا رہے۔ نماز روزہ چھوڑ بیٹھے۔ بیوی بچوں کی حق تلفی کرنے لگے۔ ماں باپ کی نافرمانی پر تلا رہے۔ لیکن جو شرک کی دلدل میں پھنس گیا وہ راہ سے زیادہ بھٹک گیا کیونکہ وہ ایک ایسے گناہ میں مبتلا ہوگیا جس کو حق تعالیٰ بلا توبہ کبھی معاف نہ فرمائے گا۔ شاید اور تمام گناہوں کو اللہ تعالیٰ بلا توبہ معاف بھی فرمادے۔ معلوم ہوا کہ شرک ناقابل عفو جرم ہے اس کی سزا قطعی مل کر رہے گی اگر انتہائی درجہ کا شرک ہے جس سے انسان کافر ہو جاتا ہے تو اس کی سزا ابدی جہنم ہے نہ اس سے نکالا جائے گا اور نہ اس میں اسے چین و آرام میسر آئے گا۔ اور جو کم درجے کا شرک ہے (یعنی اگرچہ آدمی کافر تو نہیں ہوا لیکن شرک کا کام کیا) ان کی سزا حق تعالیٰ کے یہاں جو مقرر ہے وہ ضرور ملے گی اور دیگر گناہوں کی حق تعالیٰ کے یہاں جو سزائیں مقرر ہیں وہ اللہ کی مرضی پر ہیں خواہ دے یا نہ

دے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ شرک سے بڑا کوئی گناہ نہیں۔ اس کو اس مثال سے سمجھو۔ مثلاً بادشاہ کے یہاں رعیت کے لئے ہر قسم کے جرم کی سزائیں مقرر ہیں۔ مثلاً چوری، ڈکیتی، پہرا دیتے دیتے سو جانا، دربار میں دیر سے پہنچنا، میدان جنگ سے بھاگ آنا، اور سرکار کے پیسے پہنچانے میں غلطی کر بیٹھنا وغیرہ وغیرہ۔ ان سب جرموں کی سزائیں مقرر ہیں اب بادشاہ کی مرضی ہے چاہے تو سزا دے اور چاہے معاف کردے۔ لیکن بعض جرائم ایسے ہوتے ہیں جن سے بغاوت نکلتی ہے مثلاً کسی امیر کو، وزیر کو یا چودھری کو یا رئیس کو یا بھنگی یا چمار کو بادشاہ کی موجودگی میں بادشاہ بنا دیا جائے تو اس قسم کی حرکت بغاوت ہے یا ان میں سے کسی کے واسطے تاج یا تخت شاہی بنایا جائے، یا اسے ظل سبحانی کہا جائے یا اس کے سامنے شاہانہ آداب بجا لائے جائیں یا اس کے لئے ایک جشن کا دن ٹھہرایا جائے اور بادشاہ کی سی نذر دی جائے یہ جرم تمام جرموں سے بڑا ہے اس جرم کی سزا یقیناً ملنی چاہئے۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (سورہ لقمان:13)

”جب لقمان نے نصیحت کرتے وقت اپنے بیٹے سے کہا اللہ کے ساتھ شریک نہ کرنا شرک یقیناً بڑا بھاری ظلم ہے۔“

یعنی اللہ پاک نے حضرت لقمان کو بصیرت عطا فرمائی تھی انہوں نے عقل سے معلوم کیا کہ کسی کا حق کسی دوسرے کو دے دینا بڑی بے انصافی ہے پھر جس نے اللہ کا حق اللہ کی مخلوق میں سے کسی کو دے دیا اس نے بڑے سے بڑے کا حق بہت چھوٹے کو دے دیا۔ معلوم ہوا کہ جس طرح شریعت نے شرک کو بڑا بھاری گناہ بتایا اسی طرح عقل بھی اس کو بڑا گناہ مانتی ہے۔ شرک تمام عیبوں سے بڑا عیب ہے سچی بات یہی ہے کیونکہ انسان میں سب سے بڑا عیب یہی ہے کہ وہ اپنے بڑوں کی بے ادبی کرے۔ پھر اللہ سے بڑھ کر کون ہوسکتا ہے اور شرک اس کی شان میں بے ادبی ہے۔

انبیاء کی بعثت کا اصل مقصد توحید ہے

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (سورہ انبیاء:25)

”آپ سے پہلے ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہم نے اس کو یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی حق دار عبادت نہیں لہٰذا میری ہی عبادت کرو۔“

یعنی تمام پیغمبر خدا کے پاس سے یہی حکم لے کر آئے کہ صرف اللہ ہی کو معبود مانا جائے اور اس کے سوا کسی کو الٰہ اور معبود نہ مانا جائے۔ معلوم ہوا کہ توحید کا حکم اور شرک سے ممانعت تمام شریعتوں کا ایک متفقہ مسئلہ ہے اس لئے صرف یہی راہ نجات ہے باقی تمام راہیں غلط اور ٹیڑھی ہیں۔

عن ابی هريرة رضی الله تعالىٰ عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قال الله تعالىٰ انا اغنى الشركاء عن الشرك من عمل عملا اشرك فيه معی غيری تركته وشركه و فی رواية فانا منه بری و هو للذی عمله (مسلم مشكوة، باب الريا)

> ”حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا میں ساجھیوں میں سب سے زیادہ ساجھے یعنی شرکت سے بے پرواہ ہوں جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں اس نے میرے ساتھ غیر کو شریک کیا تو میں اس کو اور اس کے ساجھے کو چھوڑ دیتا ہوں اور میں اس سے بیزار ہو جاتا ہوں۔“

یعنی میں لوگوں کی طرح مشترکہ چیز نہیں بانٹتا۔ میں بے پرواہ ہوں۔ جس نے میرے لئے عمل کیا اور اس میں غیر کو بھی شریک کر لیا تو میں اپنا حصہ بھی نہیں لیتا بلکہ سارا عمل دوسرے ہی کے لئے چھوڑ دیتا ہوں اور اس سے بیزار ہو جاتا ہوں۔ معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ کے واسطے کوئی عمل کرے اور لیکن ساتھ ہی کسی غیر کو خوش کرنا بھی مقصود ہو تو اس نے شرک کیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مشرکوں کی عبادت جو اللہ کے لئے کی جائے ناقابل قبول ہے بلکہ حق تعالیٰ اس سے بیزار ہے۔

عن معاذ بن جبل رضی الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تشرك بالله شيئا وان قتلت او حرقت۔ (مسند احمد۔ مشكوة باب الكبائر)

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر خواہ تجھے مار ڈالا جائے یا جلا دیا جائے۔

جس طرح مسلمانوں کو ظاہری مصیبتوں پر صبر کرنا چاہئے اور ان کے ڈر سے اپنا ایمان نہ بگاڑنا چاہئے اسی طرح باطنی تکلیفوں پر بھی (جن، بھوت وغیرہ کی ایذاؤں پر بھی) صبر سے کام لینا چاہئے۔ ان سے ڈر کر اپنے ایمان کو نہ بگاڑنا چاہئے۔ یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ درحقیقت ہر چیز خواہ تکلیف ہو یا آرام اللہ کے اختیار میں ہے خدا کبھی کبھی ایمان والوں کی آزمائش فرماتا ہے۔ مومن کو بقدر ایمان آزمایا جاتا ہے۔ کبھی بروں کے ہاتھوں سے نیکوں کو تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں تاکہ مخلصوں اور منافقوں میں تمیز ہو جائے لہٰذا جس طرح بظاہر

فرمانبرداروں کو نافرمانوں سے اور مسلمانوں کو کافروں سے اللہ کے ارادے سے تکلیفیں پہنچ جاتی ہیں اور وہ صبر ہی سے کام لیتے ہیں۔ تکلیفوں سے گھبرا کر ایمان نہیں بگاڑتے۔ اسی طرح کبھی کبھی نیک لوگوں کو جنوں اور شیطان سے اللہ کے ارادے سے تکلیف پہنچ جاتی ہے، لہٰذا اس پر صبر و تحمل سے کام لیا جائے اور تکلیف کے اندیشے سے انہیں ہرگز ہرگز معبود نہیں ماننا چاہئے۔

عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنه قال قال رجل یا رسول اللہ ای الذنب اکبر عند اللہ قال ان تدعو للہ ندا و ھو خلقك (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب الکبائر)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ سب سے بڑا گناہ کون سا ہے۔ فرمایا کہ تو کسی کو اللہ جیسا سمجھ کر پکارے حالانکہ اللہ نے تجھے پیدا کیا ہے۔

یعنی جس طرح اللہ کو حاضر و ناظر سمجھا جاتا ہے اور کائنات کا تصرف اسی کے قبضے میں بتایا جاتا ہے اسی وجہ سے ہر مشکل کے وقت اسے پکارا جاتا ہے۔ اسی طرح غیر اللہ کو اسی صفت سے متصف مان کر پکارنا سب سے بڑا گناہ ہے اس لئے کہ کسی میں بھی حاجت برلانے کی اور ہر جگہ حاضر و ناظر رہنے کی صلاحیت نہیں۔

شرک کے درجے اور ان کا حکم

قرآن پاک میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰـهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ۔ (بلاشبہ اللہ اس کو معاف نہیں کریں گے کہ ان کے ساتھ شرک کیا جائے)۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شرک کی کیا حقیقت ہے؟ اور آیا شرک کے کچھ درجے بھی ہیں کہ ان میں سے کسی میں بالکل نجات نہ ہو اور کسی میں نجات ہو سکے۔

اس کا بیان یہ ہے کہ شرک کے دو درجے ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی الوہیت یعنی خدائی میں کسی کو شریک ٹھہرانا۔ دوسرے خدائی میں تو شریک نہ ٹھہرائے لیکن کچھ چیزیں کہ ان کا اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہونا قرآن و حدیث کے دلائل سے ثابت ہے ان میں دوسرے کو شریک کرنا۔ پہلے درجہ کا شرک تو کبھی بھی معاف نہ ہوگا کیونکہ وہ حقیقی شرک ہے کہ خدا کی خدائی میں شریک ٹھہرایا ہے اور چونکہ اس کے مرتکب نے خدا کو اس طرح نہیں مانا جیسے ماننا چاہئے تھا اس لیے یہ خدا کو نہ ماننے کے مترادف ہوا اور یہ شخص کافر ٹھہرا۔ اس درجہ کہ ہم کفریہ شرک کا نام دیتے ہیں۔

دوسرے درجہ میں چونکہ حقیقتاً خدائی میں شریک نہیں ٹھہرایا اس لیے اس کا مرتکب کافر نہیں اور اس کو دائمی عذاب نہ ہوگا لیکن چونکہ شرک تو ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خصوصیات میں شریک ٹھہرایا ہے لہٰذا اس کے دو اثر ہوں

گے۔ ایک تو اس کا مرتکب اہل سنت والجماعت سے خارج ہوگا کیونکہ اس نے ان کے خلاف عقیدہ اختیار کیا ہے۔ دوسرے آیت اِنَّ اللّٰہَ لَایَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ کے بموجب اگر توبہ کئے بغیر مرگیا تو اس کو اس پر سزا ضرور ہوگی لیکن دائمی نہیں ہوگی اور بالآخر نجات ہوجائے گی۔ اس درجہ کو ہم فسقیہ شرک کا نام دیتے ہیں۔ آگے ان دو درجوں کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے۔

شرک کا پہلا درجہ: کفریہ شرک

اس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں:

1- اللہ تعالیٰ کی ذات میں کسی کو شریک ٹھہرایا جائے مثلاً دو یا زائد خدا ماننا جیسے عیسائی تین خداؤں کو مانتے ہیں یعنی خدا تعالیٰ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کو یا جیسے مجوسی دو خداؤں کو مانتے ہیں خیر کا خدا یزداں اور شر کا خدا اہرمن۔

2- جو صفات اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں ان میں کسی کو شریک ٹھہرانا مثلاً:

i- اللہ تعالیٰ کی صفت علم غیب میں شریک ٹھہرانا

یعنی کسی بندے کے لیے وہ صلاحیت ماننا جس سے وہ کسی بھی بات کو کسی بھی واسطہ اور ذریعہ کے بغیر جان سکے پھر خواہ یہ عقیدہ ہو کہ اس بندے کو وہ صلاحیت از خود حاصل ہے یا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی عطا سے حاصل ہے۔

ii- اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت وتصرف میں شریک ٹھہرانا۔

ا۔ یہ عقیدہ ہو کہ کسی مخلوق کو مافوق الاسباب نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت از خود حاصل ہے۔

ب۔ یا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی خاص مقرب بندے کو مافوق الاسباب نفع وضرر پہنچانے کی مستقل یعنی بلا کسی روک ٹوک کے آزاد قدرت عطا فرمادی ہے اور وہ مقرب اپنے معتقد یا مخالف کو نفع یا ضرر پہنچا سکتا ہے اس طرح سے کہ کوئی سا بھی نفع یا ضرر پہنچانے میں وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور مشیت کا محتاج نہیں اگرچہ اللہ تعالیٰ روکنا چاہیں تو پھر اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت غالب ہوگی جیسے کوئی حاکم اعلیٰ اپنے نائبین کو خاص اختیارات اس طرح دے دیتا ہے کہ ان اختیارات کے اجراء کے وقت حاکم اعلیٰ کی منظوری نہیں لی جاتی اگرچہ حاکم اعلیٰ روکنا چاہے تو پھر اسی کا حکم غالب رہے گا۔

iii- اللہ تعالیٰ کی صفت معبودیت میں شریک ٹھہرانا

معبود کہتے ہیں مستحق عبادت کو اور عبادت سے مراد ہے کسی کو انتہائی درجہ کی تعظیم کے قابل سمجھتے ہوئے

اس کے سامنے انتہائی درجہ کی عاجزی و ذلت اختیار کرنا۔ اس میں شریک ٹھہرانے کی صورتیں یہ ہیں۔

ا۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرح کا انتہائی قابل تعظیم سمجھتے ہوئے اس کے سامنے رکوع و سجود جیسے افعال کرنا جو کہ انتہائی تذلل و عاجزی کے افعال ہیں۔

ب۔ جس چیز کی عبادت کافروں میں رائج ہو اور اس کی ذات میں فی الواقع تعظیم کا کوئی پہلو نہ ہو۔ مثلاً بت، صلیب، پیپل کا درخت اور آگ، سورج وغیرہ۔ جب کوئی مسلمان ایسی کسی چیز کو سجدہ کرے تو یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اس کی عبادت کر رہا ہے محض تعظیم نہیں کر رہا (کیونکہ اس کی ذات میں فی الواقع تعظیم کا کوئی بھی پہلو نہیں ہے) اور ہم انسان اس کو مشرک و کافر سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔ البتہ اگر کسی سجدہ کرنے والے کی قلبی تصدیق اور ایمان میں فی الواقع خلل نہ ہوا ہو اور اس نے عبادت کے طور پر نہیں محض لوگوں کی دیکھا دیکھی یا کسی اور حماقت سے سجدہ کر دیا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیقی مشرک اور کافر نہ ہوگا بلکہ محض فسقیہ شرک کا مرتکب قرار پائے گا۔

ج۔ کسی غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے اس غیر اللہ کا نام لے کر جانور کو ذبح کرے تو یہ بھی کفر و شرک ہے۔

شرک کا دوسرا درجہ: فسقیہ شرک

اس کی یہ صورتیں ہیں۔

1- کسی بھی بندے کے لیے ان مغیبات کا علم اللہ تعالیٰ کی عطا سے ماننا جن کے بارے میں قرآن وحدیث میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ان کو نہیں جانتا مثلاً یہ علم کہ قیامت کب واقع ہوگی۔

2- کسی بندے میں تصرف وقدرت کو اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھے اور یہ بھی عقیدہ ہو کہ اس بندے کا کوئی بھی ضرر یا نفع پہنچانا اس حالت میں ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کا خاص اس ضرر یا نفع پہنچانے کا اپنا ارادہ ہوتا ہے۔ یہ فسقیہ شرک ہے کیونکہ اس عالم میں مافوق الاسباب تصرف کرنے کی قدرت صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے کسی اور کو نہیں۔ اگر کسی انسان کو اللہ تعالیٰ کی خاص شے کو ایجاد کرنے یا کسی خاص فعل کو کرنے کی قدرت عطا کر دیں تو اس قدرت کو اس شے یا فعل کو وجود میں لانے میں کچھ دخل نہ ہوگا۔ اس طرح سے وہ قدرت دینا عبث ہوگا اور اللہ تعالیٰ عبث سے منزہ ہیں۔ علاوہ ازیں کسی بھی آیت یا حدیث میں اس کا تذکرہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تصرف کرنے کی اپنی قوت اپنے کسی بندے کو عطا فرمائی ہے۔

تنبیہ: البتہ یہ بات ممکن اور جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے تصرف میں اپنے کسی بندے کو آلہ اور ذریعہ بنالیں جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مادرزاد اندھے کی آنکھ پر ہاتھ پھیرنے کو آلہ اور ذریعہ بنا کر اللہ تعالیٰ اپنے تصرف سے اس اندھے کو بینا کر دیتے تھے یہ نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مادرزاد اندھے کو بینا کرنے کی قدرت عطا فرمادی تھی۔

3- رکوع سجدہ وغیرہ افعال عبادت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ مخلوق کی تعظیم کے لیے بھی ان کا ہونا ثابت ہے مثلاً قرآن پاک میں ہے کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے سجدہ کیا یہ سجدہ تعظیم کے لیے تھا۔ ہماری شریعت میں کسی مخلوق کے لیے تعظیم کے طور پر بھی سجدہ کرنا بلکہ رکوع کی حد تک جھکنا بھی منع ہے۔ اس لیے کسی مخلوق کو سجدہ وغیرہ کرنا محض ظاہر تعظیم کے طور پر ہو عبادت کے طور پر نہ ہو جیسے کسی کا یہ عقیدہ ہو کہ فلاں بزرگ کو مستقل قدرت تو حاصل نہیں البتہ ان کو اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب وقبولیت کا درجہ ملا ہوا ہے اور یہ بزرگ اپنے متوسلین کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں محض سفارش کرتے ہیں اور نفع وضرر صرف اللہ تعالیٰ ہی دیتے ہیں لیکن ان کی سفارش کبھی رد نہیں ہوتی اور اس سفارش کو حاصل کرنے کے لیے اس بزرگ کی تعظیم کے لیے یہ افعال کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اس سے برتر سمجھتے ہیں۔

ii- اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جانور کو ذبح کیا لیکن کسی بزرگ کی تعظیم کے لیے تا کہ ان بزرگ کی اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارش حاصل ہو سکے۔ یہ فسقیہ شرک ہے اور اس سے جانور حرام ہو جائے گا۔

iii- کسی امیر یا بڑے آدمی کے آنے پر اس کی تعظیم کے اظہار کے طور پر جانور ذبح کرنے کا عمل کرنا اگرچہ ذبح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا نام لیا ہو۔ اس سے بھی جانور حرام ہو جاتا ہے۔

کسی مہمان کے آنے پر اس کے اکرام کی خاطر جانور ذبح کر کے اس کا گوشت پکانا شرک نہیں ہے۔

4- غیر اللہ کے نام کی نذر ومنت کے طور پر بزرگوں کے مزارات پر چڑھاوے چڑھانا جب کہ اس بزرگ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں محض سفارشی سمجھے۔

شرک کے بارے میں مزید وضاحت:

شرک کی اقسام

(1) شرک فی العلم

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ(سورہ انعام:59)

(ترجمہ: ”اللہ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں وہی جانتا ہے اور جو کچھ زمین، خشکی اور تری میں ہے اسے بھی جانتا ہے۔ جو بھی پتہ گرتا ہے اسے بھی جانتا ہے زمین کے نیچے اندھیروں میں کوئی دانہ ایسا نہیں اور کوئی تر اور خشک چیز ایسی نہیں جو روشن کتاب میں نہ ہو۔“

علم غیب اللہ ہی کو ہے

یعنی جس طرح اللہ پاک نے انسان کو ظاہری چیزیں معلوم کرنے کی کچھ مشینیں دے دی ہیں مثلاً دیکھنے کو آنکھ، سننے کو کان، سونگھنے کو ناک، چکھنے کو زبان، ٹٹولنے کو ہاتھ اور سمجھنے کو عقل بخشی ہے پھر یہ مشینیں انسان کے قبضہ واختیار میں دے دی ہیں کہ ادھر اس نے ارادہ کیا ادھر اس نے کام کر دیا مثلاً آنکھ سے دیکھنا چاہا آنکھ کھول دی نہ چاہا بند کر لی۔ اسی پر ہر ایک عضو کو قیاس کر لو۔ گویا انسان کو ظاہری چیزوں کے معلوم کرنے کی کنجیاں دے دی ہیں جیسے کنجی والے ہی کے اختیار میں تالے کو کھولنا یا نہ کھولنا ہے اسی طرح ظاہری چیزوں کو معلوم کرنا انسان کے اختیار میں ہے چاہے معلوم کرے یا نہ کرے لیکن غیب کا معلوم کرنا انسان کے اختیار سے باہر ہے اس کی کنجیاں حق تعالیٰ نے اپنے پاس رکھی ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے انسان کو مقرب ترین فرشتے کو بھی غیب کے معلوم کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا کہ جب چاہیں اپنی مرضی سے غیب معلوم کر لیں اور جب چاہیں نہ کریں بلکہ اللہ پاک اپنی مرضی سے کبھی کسی کو غیب کی جس قدر بات بتانا چاہتا ہے بتا دیتا ہے۔ یہ غیب کا بتا دینا اللہ کے ارادے پر موقوف ہے کسی کی خواہش پر نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ آپ کو بعض بات دریافت کرنے کی خواہش ہوئی مگر وہ بات آپ کو معلوم نہ ہو سکی پھر جب ارادہ الٰہی ہوا فوراً بتا دی گئی عہد رسالت میں منافقوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ پر الزام لگایا اس سے آپ کو سخت صدمہ ہوا۔ آپ نے کئی دنوں تک معاملہ کی کرید کی مگر کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ پھر جب حق تعالیٰ نے چاہا تو وحی بھیج کر بتا دیا کہ منافق کذاب ہیں صدیقہ پاک دامن ہیں۔ اب ایک مسلمان موحد (اللہ کو ایک ماننے والے) کا یہ عقیدہ ہونا ضروری ہے کہ اللہ نے غیب کے خزانوں کی کنجیاں اپنے پاس رکھی ہیں ان خزانوں کا کسی کو خزانچی نہیں بنایا۔ وہ خود اپنے ہاتھ سے قفل کھول کر جس کو جس قدر چاہے دے دے اس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو یہ دعویٰ کرے کہ میں ایسا علم جانتا ہوں جس سے غیب معلوم کر لیتا ہوں اور ماضی و مستقبل کی باتیں بتا سکتا ہوں وہ جھوٹا ہے اور خدائی کا دعویٰ کرتا ہے۔ اگر کسی نبی کو یا ولی کو یا جن کو یا فرشتے کو یا پیر کو یا شہید کو یا نجومی، رمال، جفار کو یا فال کھولنے والے کو ایسا مان لیا جائے تو ماننے والا شرک کا مرتکب ہوتا ہے اور اس آیت کا انکار کرتا ہے۔ اگر اتفاق سے کسی نجومی وغیرہ کی بات صحیح بھی ہو جائے تو اس سے ان کی غیب دانی کا ثبوت نہیں ہوتا کیونکہ زیادہ تر ان کی باتیں غلط ہی ہوتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ علم غیب ان کے بس کی بات نہیں۔ اٹکل کی بات کبھی ٹھیک اور کبھی غلط بھی ہو جاتی ہے۔ صرف وحی ہے جو کبھی غلط نہیں ہوتی اور وہ بھی انبیاء کے قابو میں نہیں، اللہ پاک اپنی مرضی کے مطابق جو چاہتا ہے بتا دیتا ہے۔ ان کی خواہش پر وحی کا دارومدار نہیں۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (سورہ نمل:65)

(ترجمہ: ''آپ فرما دیں کہ آسمان وزمین میں جتنے لوگ ہیں اللہ کے سوا غیب کی باتیں نہیں جانتے انہیں تو یہ بھی خبر نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔''

یعنی غیب کو ازخود جاننا کسی کے بس کی بات نہیں خواہ وہ بڑے سے بڑا انسان یا فرشتہ ہی کیوں نہ ہو۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ دنیا جانتی ہے کہ قیامت آئے گی لیکن یہ کسی کو خبر نہیں کہ کب آئے گی۔ اگر ہر چیز کا معلوم کرنا ان کے بس میں ہوتا تو قیامت کے آنے کی تاریخ بھی معلوم کر لیتے۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَّمَا تَدْرِىْ نَفْسٌ بِاَىِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (سورہ لقمان:34)

''بلا شبہ اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے وہی مینہ برساتا ہے وہی پیٹ کے بچے کو جانتا ہے کسی کو معلوم نہیں کہ کل کیا کمائے گا اور نہ یہ معلوم کہ کہاں مرے گا۔ یاد رکھو اللہ خوب جاننے والا اور بڑا خبردار ہے۔''

یعنی غیب کی باتوں کی خبر اللہ ہی کو ہے اس کے سوا کوئی غیب دان نہیں چنانچہ قیامت کی خبر بھی جس کا آنا عوام میں مشہور ہے اور یقینی ہے کسی کو نہیں معلوم کہ کب آئے گی پھر اور چیزوں کا تو کیا کہنا مثلاً فتح وشکست کا، صحت ومرض کا اور اسی قسم کی دوسری باتوں کا کسی کو بھی علم نہیں۔ یہ باتیں نہ تو قیامت کی طرح مشہور ہیں اور نہ یقینی ہیں۔ اسی طرح بارش کی کسی کو پکی اور یقینی خبر نہیں کہ کب ہوگی حالانکہ اس کا موسم بھی مقرر ہے اور اکثر موسم میں بارش ہوتی بھی ہے اکثر لوگوں کو اس کی خواہش بھی رہتی ہے اگر اس وقت کسی طرح معلوم ہو سکتا تو

کسی نہ کسی کو ضرور معلوم ہو جاتا۔ پھر جو بے موسم کی چیزیں ہیں اور تمام لوگوں کی خواہش ان سے وابستہ بھی نہیں مثلاً کسی شخص کی موت وحیات یا اولاد کا ہونا یا نہ ہونا یا مال دار ہونا یا نہ ہونا فتح وشکست کا ہونا۔ ان چیزوں کی بھلا کسی کو کیسے خبر ہو سکتی ہے۔ پیٹ کے بچے کے بارے میں تمام معلومات کوئی نہیں جانتا کہ ایک ہے یا ایک سے زیادہ، نر ہے یا مادہ، کامل ہے یا ناقص، ادھورا ہے یا پورا، اور خوبصورت ہے یا بدصورت نیک بخت ہے یا بد بخت یعنی جنتی ہے یا جہنمی ہے اس کا رزق کتنا ہے اس کی عمر کتنی ہے۔ پھر انسان کے اندرونی حالات بھلا کوئی کیسے معلوم کر سکتا ہے مثلاً خیالات، ارادے، نیتیں اور ایمان ونفاق کا حال۔ جب کوئی یہ نہیں جانتا کہ میں خود کل کیا کروں گا تو وہ دوسروں کا حال کیسے جان سکتا ہے۔ بہر حال اللہ کے سوا کوئی آئندہ کی باتیں اپنے اختیار سے نہیں جانتا۔ معلوم ہوا کہ غیب دانی کا دعویٰ کرنے والے سب جھوٹے ہیں۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (سورہ احقاف:5)

> ”آپ فرما دیں کہ مجھے اپنے لئے بھی بھلائی برائی کا اختیار نہیں مگر جو خدا کو منظور ہوا گر میں غیب جانتا تو کثرت سے بھلائی جمع کر لیتا اور مجھ تک برائی نہ پہنچتی۔ میں تو صرف ایمان والوں کو ڈرانے والا اور خوش خبری سنانے والا ہوں۔“

یعنی پیغمبر اسلام علیہ الصلوۃ والسلام سرتاج انبیاء ﷺ ہیں۔ آپ سے بڑے بڑے معجزے ظاہر ہوئے لوگوں نے آپ سے اسرار ورموز سیکھے۔ بزرگوں کو آپ کی راہ پر چلنے سے بزرگی نصیب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ہی سے فرمایا کہ لوگوں کے سامنے اپنا حال بیان فرما دیں کہ مجھے نہ تو کچھ قدرت حاصل ہے اور نہ ہی غیب دان ہوں میری قدرت کا یہاں سے اندازہ لگاؤ کہ میں اپنی جان تک کے لئے نفع ونقصان کا مالک نہیں، دوسروں کو تو کیا بھلائی برائی پہنچا سکوں گا۔ اگر میں غیب دان ہوتا تو کام سے پہلے اس کا انجام معلوم کر لیا کرتا اگر اس کا انجام برا معلوم ہوتا تو اس میں کبھی ہاتھ نہیں ڈالتا۔ غیب دانی خدا کی شان ہے اور میں پیغمبر ہوں پیغمبر کا صرف اتنا کام ہوتا ہے کہ وہ برے کاموں کے انجام سے خبردار کر دے اور نیک کاموں پر خوش خبری سنا دے، یہ بات بھی انہیں کو فائدہ پہنچاتی ہے جن کے دلوں میں یقین ہو اور یقین پیدا کرنا اللہ ہی کا کام ہے۔

عظمت انبیاء کی اصل وجہ:

معلوم ہوا کہ انبیاء اور اولیاء میں یہی بڑائی ہے کہ وہ اللہ کی راہ بتاتے ہیں اور جن اچھے برے کاموں سے

واقف ہیں ان سے لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں۔ اللہ پاک نے ان کی تبلیغ میں تاثیر رکھی ہے۔ بہت لوگ ان کی تبلیغ سے سیدھی راہ پر آجاتے ہیں۔ یہ کوئی بڑائی نہیں کہ ان میں تصرف عالم کی قدرت رکھ دی گئی ہو کہ جسے چاہیں مار ڈالیں یا بیٹا بیٹی دے دیں یا آئی بلا ٹال دیں یا مرادیں برلائیں یا فتح وشکست دے دیں یا تونگر بنا دیں یا فقیر وقلاش کر دیں یا کسی کو بادشاہ بنا دیں اور کسی کے ہاتھ میں کاسہ گدائی دے دیں یا کسی کو امیر یا وزیر بنا دیں اور کسی کو فقیر وحقیر کر دیں۔ کسی کے دل میں ایمان ڈال دیں اور کسی سے چھین لیں۔ کسی بیمار کو تندرست یا تندرست کو بیمار کر دیں۔ یہ خدا ہی کی شان ہے اور ان باتوں سے سب چھوٹے بڑے عاجز ہیں اور عجز میں سب برابر ہیں اسی طرح یہ کوئی بڑائی نہیں کہ اللہ تعالیٰ غیب کی کنجیاں انہیں دے دے کہ جب چاہیں کسی کے دل کی بات معلوم کر لیں یا جس غیب کی بات کو چاہیں معلوم کر لیں کہ فلاں کے ہاں اولاد ہوگی یا نہیں تجارت میں فائدہ ہوگا یا نہیں۔ لڑائی میں فتح ہوگی یا شکست۔ ان باتوں سے سب چھوٹے بڑے یکساں بے خبر ہیں پھر جس طرح کوئی بات عقل سے یا کسی قرینے سے کہہ دی جاتی ہے اور وہ اسی طرح ہو جاتی ہے جس طرح کہی گئی تھی اسی طرح یہ بڑے لوگ بھی جو بات عقل وقرینہ سے کہہ دیتے ہیں کبھی تو وہ ٹھیک ہو جاتی ہے اور کبھی غلط ہو جاتی ہے لیکن وحی یا الہام کی بات غلط نہیں ہوتی مگر وحی اختیار میں نہیں ہوتی۔

عن عائشة رضى الله عنها قالت من اخبرك ان محمدا صلى الله عليه و سلم يعلم الخمس التى قال الله تعالىٰ ان الله عنده علم الساعة فقد اعظم الفرية (بخارى، مشكوة، باب روية الله)

حضرت عائشہؓ نے فرمایا جو تمہیں خبر دے کہ محمد رسول اللہ ﷺ ان پانچ باتوں کو جانتے ہیں۔ جن کی اللہ پاک نے اس آیت اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ میں خبر دی ہے اس نے بڑا زبردست بہتان باندھا۔ کہ یہ دعوی کیا کہ آپ ﷺ کو علم غیب حاصل ہے حالانکہ وہ تو صرف خدا ہی کو حاصل ہے۔

(2) شرک فی التصرف

قُلۡ مَنۡ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّھُوَ یُجِیۡرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیۡہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ☆ سَیَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰہِ قُلۡ فَاَنّٰی تُسۡحَرُوۡنَ (مومنون: 89-88)

”آپ فرما دیں کون ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابل میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا اگر تم علم والے ہو۔ وہ کہیں گے کہ اللہ کے لئے ہے۔“

یعنی جس مشرک سے پوچھا جائے کہ ایسی شان کس کی ہے جس کے اختیار وتصرف میں ہر چیز ہے جو چاہے کرے۔ اس کا ہاتھ کوئی پکڑنے والا نہ ہو اور کوئی اس کی بات ٹال نہ سکے تو وہ اللہ ہی کو بتائیں گے۔ تو

دوسروں سے مرادیں مانگنا پاگل پن ہوا۔ معلوم ہوا کہ عہد رسالت میں بھی لوگ اس بات کے قائل تھے کے اللہ کے برابر اور مقابلے کا کوئی نہیں مگر بتوں کو اپنا وکیل سمجھ کر پوجتے تھے اور ان سے مانگتے تھے اسی وجہ سے مشرک ہوئے۔ آج بھی اگر کوئی اس عالم میں کسی مخلوق کے تصرف کا قائل ہو اور اپنا وکیل سمجھ کر اس کی عبادت کرے تو مشرک ہو جائے گا گو اس کو خدا کے برابر نہ سمجھتا ہو اور اس کے مقابلے کی طاقت اس میں نہ جانتا ہو۔

قُلْ اِنِّي لَا اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا☆قُلْ اِنِّي لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (سورہ جن :21-22)

آپ فرما دیں کہ میں تم پر نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا آپ فرما دیں کہ مجھے کوئی اللہ سے ہرگز ہرگز نہیں بچا سکتا اور میں اس کے سوا کہیں بچاؤ نہیں پاتا۔

یعنی میں تمہارے نفع و نقصان پر اختیار نہیں رکھتا۔ میرے امتی ہونے کی وجہ سے تم لوگ مغرور ہو کر یہ خیال کر کے حد سے نہ بڑھنا کہ ہمارا پایہ مضبوط ہے۔ ہمارا وکیل بہت بڑا ہے۔ اور اللہ کا محبوب ہمارا شفیع ہے ہم جو چاہیں کریں وہ ہمیں اللہ کے عذاب سے بچا لے گا کیونکہ میں تو خود ہی ڈرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اللہ کے سوا کہیں پناہ گاہ نہیں دیکھتا اگر اللہ کسی کو سزا دینا چاہیں تو میرا کوئی زور نہیں۔ غرض سرکار رسالت تو دن رات اللہ سے ڈرتے تھے اور اس کی رحمت کے سوا کہیں اپنا بچاؤ نہیں جانتے تھے بھلا کسی اور کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (سورہ نمل:37)

مشرک خدا کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہیں جو آسمان و زمین سے روزی پہنچانے میں کچھ بھی دخل نہیں رکھتے اور نہ رکھ سکتے ہیں۔ یعنی ایسے لوگوں کی اللہ کی سی تعظیم کرتے ہیں جو قطعی بے بس ہیں۔ روزی پہنچانے میں ان کا کچھ بھی دخل نہیں۔ نہ آسمان سے مینہ برسا سکیں اور نہ زمین سے کچھ اگا سکیں انہیں کسی بھی طرح کی سکت نہیں۔ معلوم ہوا کہ بعض لوگوں میں جو یہ بات مشہور ہے کہ بزرگوں کو عالم میں تصرف کی تو قدرت ہے مگر تقدیر الٰہی پر شاکر ہیں، ادب سے دم نہیں مارتے ورنہ اگر چاہیں تو کائنات کو زیر و زبر کر دیں لیکن شرع کی عظمت کا خیال کر کے چپ ہیں یہ قطعی غلط ہے کائنات میں نہ انہیں بالفعل دخل ہے نہ بالقوہ (potentially) یعنی ان میں اس قسم کے تصرف کی صلاحیت و قدرت ہی نہیں۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ (یونس

(106:

’’اللہ کو چھوڑ کر اس کو مت پکاریئے جو آپ کو نہ نفع پہنچا سکے اور نہ نقصان۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ ظالم بن جائیں گے۔‘‘

یعنی عزت وجلال والے خدا کے ہوتے ہوئے ایسے لوگوں کو پکارنا جو نہ نفع کے مالک ہیں اور نہ نقصان کے سراسر ظلم ہے کیونکہ بڑی سے بڑی ہستی کا مقام محض ان لوگوں کو دیا جارہا ہے جو اس کے آگے بے بس ہیں۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ☆ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ حَتّٰى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ☆ (سورہ سبا:23-22)

(ترجمہ: آپ فرما دیجئے پکار کر دیکھو تو سہی جن کو تم نے اللہ کو چھوڑ کر معبود خیال کر رکھا ہے جو آسمانوں میں اور زمین میں ذرہ برابر بھی اختیار نہیں رکھتے نہ ان میں ان کا کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں کوئی اللہ کا مددگار ہے۔ اس کے آگے کسی کی سفارش کام نہیں آئے گی مگر جس کو وہ اجازت دے دے یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا اور جواب دیتے ہیں کہ حق ہی فرمایا ہوگا۔ وہی سب سے بلند و بڑا ہے۔)

یعنی آڑے وقت کسی سے مراد مانگنا اور جس سے مراد مانگی ہے اس کا مراد کو پورا کرنا کئی طرح ہے۔ جس سے مراد مانگی ہے وہ خود مالک ہو یا اس کا ساجھی ہو یا اس کا مالک پر دباؤ ہو جیسے بادشاہ دیگر امراء کا کہنا مان لیتا ہے کیونکہ وہ اراکین سلطنت ہیں اور ان کے ناراض ہونے سے حکومت کا نظم ونسق بگڑتا ہے یا وہ مالک سے سفارش کرے اور مالک کو اس کی سفارش ماننی ہی پڑتی ہے خواہ دل سے چاہے یا نہ چاہے مثلاً شاہزادیوں سے یا بیگمات سے بادشاہ کو محبت ہوتی ہے اور ان کی محبت کی وجہ سے سفارش رد نہیں کی جاتی۔ اب غور کرو کہ مشرک خدا کو چھوڑ کر جن بزرگوں کو پکارتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں نہ تو وہ کائنات میں مچھر کے ایک پر کے مالک ہیں نہ ان کا رتی بھر ساجھا ہے نہ خدائی سلطنت کے رکن ہیں اور نہ خدا کے معین و مددگار کہ ان سے دب کر اللہ تعالیٰ ان کی بات مان لے اور نہ بلا اجازت خداوندی سفارش کے لئے لب ہلا سکتے ہیں خواہ مخواہ اس سے کچھ دلوا دیں۔ بلکہ بارگاہ الوہیت میں ان کا یہ حال ہے کہ اس کے آگے سب کے ہوش اڑ جاتے ہیں اور بدحواس ومرعوب ہو جاتے ہیں۔ احترام ودہشت کی وجہ سے دوسری دفعہ پوچھنے کی بھی جرات نہیں ہوتی۔ بلکہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ رب نے کیا کہا اور تحقیق کے بعد آمَنَّا وَصَدَّقْنَا ہی کہنا پڑتا ہے چہ جا

ئیکہ بات نہ مانی جائے یا کوئی وکالت وحمایت کی جرات کرے۔

عن انس رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ لیسئال احدکم ربه حاجته کلها حتی لیسال الملح وحتی یسئله شسع نعله اذا انقطع (ترمذی)

”حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر ایک مسلمان کو اپنے رب سے اپنی ساری ضرورتیں مانگنی چاہئیں۔ یہاں تک کہ نمک اور جوتے کا تسمہ جب وہ ٹوٹ جائے اسی سے مانگے۔“

یعنی اللہ پاک کو دنیوی بادشاہوں کی طرح نہ سمجھو کہ بڑے کام تو خود کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے کام نوکروں سے کراتے ہیں اس لئے لوگوں کو چھوٹے چھوٹے کاموں میں نوکروں سے التجا کرنی پڑتی ہے۔ خدا کا کارخانہ ایسا نہیں ہے وہ قادر مطلق تو پلک جھپکنے میں بے شمار چھوٹے بڑے کام ٹھیک فرما دیتا ہے اس کی سلطنت میں کوئی شریک اور ساجھی نہیں اس لئے چھوٹی سے چھوٹی چیزیں بھی براہ راست اس سے مانگو کیونکہ اس کے سوا تو کوئی اور نہ چھوٹی چیز دے سکتا ہے اور نہ بڑی۔

(3) شرک فی العبادۃ

عبادت ان کاموں کو کہا جاتا ہے جو حق تعالیٰ نے اپنی تعظیم کے واسطے مقرر فرما کر اپنے بندوں کو سکھائے ہیں۔ یہاں یہ بتلانا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی تعظیم کے واسطے کون کون سے کام بتائے ہیں تاکہ غیر اللہ کے لئے وہ کام نہ کئے جائیں اور شرک سے بچا جائے۔

عبادت صرف اللہ کے لئے ہے

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ☆ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ (سورہ هود: 25-26)

ترجمہ: ”بلاشبہ ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔ انہوں نے کہا کہ اے قوم میں تمہیں ایک کھلا ڈرانے والا ہوں اس بات سے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو مجھے تم پر قیامت کے دن کے دردناک عذاب کا اندیشہ ہے۔“

یعنی مسلمانوں اور کافروں میں حضرت نوحؑ کے زمانے سے جھگڑا چلا آرہا ہے۔ اللہ کے مقبول بندے یہی کہتے آئے ہیں کہ اللہ کی سی تعظیم غیر اللہ کی نہ کرو۔ فرمایا:

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ

الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ(سورہ حم سجدہ :37)

’’رات، دن اور سورج اور چاند اس کی نشانیوں میں سے ہیں۔ سورج کو اور چاند کو سجدہ نہ کرو۔ اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔‘‘

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام میں سجدہ خالق ہی کا حق ہے لہٰذا کسی مخلوق کو سجدہ نہ کیا جائے خواہ وہ چاند، سورج ہوں یا نبی، ولی یا جن اور فرشتے ہوں۔

غیر اللہ کو پکارنا شرک ہے

وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَداً☆وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَداً☆قُلْ اِنَّمَا اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَا اُشْرِكُ بِهٖ اَحَداً (سورہ جن:18-20)

’’یقین مانو مسجدیں اللہ ہی کی ہیں لہٰذا اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو اور جب اللہ کا بندہ اس کی عبادت کے لئے کھڑا ہوا تو قریب تھا کہ وہ بھیڑ کی بھیڑ بن کر اس پر جھک پڑیں آپ فرما دیں کہ میں تو اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا۔‘‘

یعنی جب کوئی اللہ کا بندہ اپنے پاک وصاف دل سے خدا کو پکارتا ہے تو یہ نادان سمجھتے ہیں کہ بڑا پہنچا ہوا ہے۔ غوث وقطب ہے۔ جس کو جو چاہے دے دے اور جس سے جو چاہے چھین لے اس لئے ٹھٹ کے ٹھٹ اس کے پاس اس امید پر جمع ہو جاتے ہیں کہ بگڑی بنا دے گا۔ اب اس بندے کا فرض ہے کہ صحیح صحیح بات بتا دے کہ آڑے وقت خدا ہی کو پکارنا چاہیے یہ حق کسی اور کا نہیں ہے۔ اللہ ہی سے نفع ونقصان کی امید رکھنی چاہئے کیونکہ اس طرح کا معاملہ کرنا شرک ہے۔ میں شرک سے اور شرک کرنے سے بیزار ہوں اگر کوئی مجھ سے اس قسم کا معاملہ کرنا چاہے تو میں اس سے راضی نہیں اور دینا لینا خدا ہی کا کام ہے۔ وہی دیتا ہے اور وہی لیتا ہے میرے ہاتھ میں کچھ نہیں وہی میرا اور تمہارا رب ہے لہٰذا آؤ اور معبودان باطل کو چھوڑ کر اسی ایک وحدہ لاشریک لہ کو پکارو جو اپنی وحدانیت میں، معبودیت میں ربوبیت میں اور حاکمیت میں اکیلا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کے (ہاتھ باندھ کر) ادب سے کھڑا ہونا، پکارنا، اور نام کا وظیفہ پڑھنا ان کاموں میں سے ہے جن کو حق تعالیٰ نے اپنی تعظیم کے لیے مخصوص فرما دیا ہے یہ معاملہ غیر اللہ سے کرنا شرک ہے۔

شعائر اللہ کی تعظیم

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِّيَشْهَدُوْا

مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ عَلٰی مَارَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيْرَ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ۔ (سورہ حج: 27-29)

’’لوگوں میں حج کی آواز لگادو وہ تمہارے پاس پیدل اور دبلے دبلے اونٹوں پر چلے ائیں گے کہ وہ (اونٹ) چلے آتے ہیں دور دور کے رستے سے تاکہ (لوگ) اپنے فائدہ کی جگہوں میں پہنچ جائیں اور (تاکہ) لیں اللہ کا نام مقرر دنوں میں چوپایوں پر جو اللہ نے ان کو دیئے۔ سو کھاؤ ان سے اور کھلاؤ بدحال محتاج کو۔ پھر چاہیے کہ دور کریں اپنا میل کچیل اور پوری کریں اپنی نذریں اور طواف کریں اس قدیم گھر کا۔‘‘

یعنی حق تعالیٰ نے اپنی تعظیم کے لیے بعض جگہیں مقرر فرمائی ہیں جیسے کعبہ، عرفات مزدلفہ، صفا و مروہ، مقام ابراہیم، مسجد حرام، بلکہ سارا مکہ معظّمہ بلکہ حرم۔ لوگوں کو ان مقامات کی زیارت کا شوق دیا ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے سے سمٹ کر خواہ سوار ہو کر خواہ پاپیادہ دور دور سے بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئیں۔ سفر کی مشقتیں اٹھا کر ایک خاص بے سلے لباس میں مخصوص ہیئت سے وہاں پہنچیں، اور خدا کے نام کی قربانیاں کریں۔ اپنی منتیں پوری کریں۔ بیت اللہ کا طواف کریں اور دلوں میں مالک کی تعظیم کی جو امنگیں کروٹیں لے رہی ہیں بیت اللہ آ کر انہیں پوری کریں اسکی چوکھٹ کو چومیں۔ اس کے دروازے کے سامنے بلک بلک کر دعائیں مانگیں پھر کوئی بیت اللہ کا پردہ تھام کر رو رو کر خدا سے دعائیں مانگ رہا ہے۔ کوئی وہاں اعتکاف میں بیٹھ کر رات دن ذکر الٰہی کر رہا ہے۔ کوئی مودب چپ چاپ حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ ہی رہا ہے۔ بہرحال یہ سب کام خدا کی تعظیم و اکرام کے لیے کیے جاتے ہیں۔ خدا ان سے ان کاموں کے سبب خوش ہوتا ہے اور ان سے دونوں جہان میں فائدہ ہوتا ہے لہذا اس قسم کے کام غیر اللہ کی تعظیم کے لیے حرام و شرک ہیں۔ کسی مزار یا چلہ پر دور دراز سے سفر کی مشقتیں اٹھا کر آنا اور میلے کچیلے ہو کر وہاں جا کر جانوروں کی قربانی کرنا کسی گھر کا یا قبر کا طواف کرنا اس کے آس پاس کے جنگل کا ادب کرنا وہاں کا شکار نہ کرنا وہاں کے درختوں کو نہ کاٹنا، گھاس کے تنکے نہ توڑنا اور نہ اکھاڑنا اور اسی قسم کے اور کام کرنے اور ان دونوں جہان کی بھلائیوں کی امید رکھنا سب شرک ہے ان سے بچنا چاہیے کیونکہ شریعت نے جن مقامات کی تعظیم کرنے کا حکم دیا ہے ان کے علاوہ اور جگہوں پر ایسا کرنا اور اپنی طرف سے اس کو دین میں داخل سمجھنا بدعت ہے اطاعت اور فرمانبرداری کا معاملہ اللہ ہی سے کرنا چاہیے، نہ کہ مخلوق سے۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَا اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْلَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْفِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّغَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (سورہ انعام:142)

”آپ فرما دیجئے کہ میں کھانے والے پر کسی چیز کو حرام نہیں پاتا کہ وہ اسے کھائے مگر وہ چیز جو مردار ہے یا بہنے والا خون ہے، یا خنزیر کا گوشت ہے کیونکہ یہ ناپاک ہے یا گناہ کی چیز ہے کہ اسے غیر اللہ کے نام پر مشہور کیا گیا ہو۔ اور اگر کوئی مجبور ہو جائے تو تمہارا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے۔“

یعنی جس طرح سور، خون اور مردار حرام ہے اسی طرح وہ جانور حرام ہے جو گناہ کی صورت میں ہو کہ اللہ کے نام کا نہیں بلکہ کسی اور کے نام کا ہے۔ مثلاً یہ کہہ دیا جائے کہ یہ سید احمد کبیر کی گائے ہے، یہ شیخ سدو کا بکرا ہے وغیرہ غیرہ۔ اس آیت میں اس بات کا بیان نہیں کہ وہ جانور جب ہی حرام ہوگا جب ذبح کرتے وقت اس پر غیر اللہ کا نام لیا جائے بلکہ محض نامزد کرنے ہی سے حرام ہو گیا۔ اگر کوئی جانور مرغی ہو یا بکری، اونٹ ہو یا گائے کسی مخلوق کے نام کر دیا جائے خواہ ولی کے نام ہو یا نبی کے نام۔ باپ، دادا کے نام ہو یا پیر و شیخ کے نام کا ہو وہ ناجائز و حرام و ناپاک ہے اور نام کرنا شرک ہے۔

عن معاوية قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من سره ان يتمثل له الرجال قياما فليتبوء مقعده من النار (ترمذی)

”حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو اس بات سے مسرت ہو کہ لوگ اس کے سامنے مورتیوں کی مانند کھڑے رہیں تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔“

یعنی جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ لوگ اس کے سامنے باادب ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے رہیں نہ ہلیں جلیں، نہ ادھر ادھر دیکھیں اور نہ بولیں چالیں بلکہ بت بنے ہوئے کھڑے رہیں وہ دوزخی ہے کیونکہ وہ خدائی کا دعویدار ہے کہ جو تعظیم اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے خاص ہے وہی اپنے لئے چاہتا ہے۔ نماز میں نمازی ہاتھ باندھ کر چپ چاپ ادھر ادھر دیکھے بغیر کھڑے ہوتے ہیں اور ایسا قیام اللہ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی کے سامنے مذکورہ بالا طریقے سے ادب و تعظیم کی غرض سے کھڑا ہونا ناجائز اور شرک ہے۔

عن ثوبان قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تقوم الساعة حتى تلحق قبائل من امتى بالمشركين وحتى تعبد قبائل من امتى الاوثان۔ (ترمذی)

”حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت نہیں آئے گی جب تک میری

امت کے قبیلے مشرکوں میں نہ جا ملیں اور بت پرستی اختیار نہ کر لیں۔‘‘

بت دو طرح کے ہوتے ہیں۔ کسی کے نام کی تصویر یا مورتی بنا کر اس کو پوجا جائے اس کو عربی میں صنم کہا جاتا ہے۔ کسی جگہ کو درخت کو یا پتھر یا لکڑی کو یا کاغذ کو کسی کے نام مقرر کر کے پوجا جائے اس کو وثن کہا جاتا ہے۔ قبر، چلہ، لحد، چھڑی، تعزیہ، علم، امام قاسم کی اور شیخ عبدالقادر کی مہندی۔ یہ سب وثن میں داخل ہیں۔ اسی طرح شہید کے نام کا طاق یا نشان اور اسی طرح بعض مکانات بیماریوں کے نام سے مشہور ہیں جیسے سیتلا (یعنی چیچک) کا مکان یا مسانی (یعنی (ام الصبیان اور اٹھرا) کا مکان یا براہی (یعنی خارش) کا مکان یہ سب وثن ہیں۔ صنم اور وثن دونوں کی پرستش سے شرک ثابت ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے خبر دی کہ قیامت کے قریب مسلمانوں کا شرک اسی قسم کا ہوگا۔ برخلاف دوسرے مشرکوں کے جیسے ہندو یا عرب کے مشرک کہ اکثر مورتوں کو مانتے ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ کے دشمن ہیں۔

عن ابی الطفیل ان علیا رضی الله عنه اخرج صحیفة فیها لعن الله من ذبح لغیر الله۔ (مسلم)

حضرت ابوالطفیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک کتاب نکالی جس میں یہ حدیث تھی کہ جس نے جانور کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا اس پر خدا کی لعنت ہے۔

یعنی جو شخص اللہ کے سوا کسی مخلوق کے نام کا جانور ذبح کرے وہ ملعون ہے۔ حضرت علیؓ نے ایک کاپی جس میں رسول اللہ ﷺ کی کئی حدیثیں لکھ رکھی تھیں نکالی ان میں یہ حدیث بھی تھی۔ معلوم ہوا کہ جانور اللہ ہی کا نام لے کر ذبح کرنے سے حلال ہوتا ہے۔ غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا شرک ہے اور جانور بھی حرام ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ جانور بھی حرام ہوتا ہے جو غیر اللہ کا نامزد ہو خواہ اس پر ذبح کے وقت اللہ ہی کا نام لیا گیا ہو۔

(4) شرک فی العادات

ذیل میں ان آیات واحادیث کا بیان ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح انسان دنیوی کاموں میں طرح طرح سے اللہ کی تعظیم بجالاتا رہتا ہے ایسا معاملہ غیر اللہ سے نہ کیا جائے۔

اِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ اِلَّا اِنٰثًا وَّ اِنْ یَّدْعُوْنَ اِلَّا شَیْطَانًا مَّرِیْداً ☆ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا ☆ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّیَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ وَمَنْ یَّتَّخِذِ الشَّیْطٰنَ وَلِیًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِیْنًا ☆ یَعِدُهُمْ

وَيُمَنِّيهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ☆ اُولٰئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا☆

(سورہ نساء : 120-117)

> ”یہ مشرک اللہ کو چھوڑ کر عورتوں ہی کو پکارتے ہیں بلکہ سرکش شیطان ہی کو پکارتے ہیں جس پر اللہ نے پھٹکار ڈال دی ہے اس نے کہہ رکھا ہے کہ میں تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ الگ کر رکھوں گا میں انہیں گمراہ کئے بغیر، آرزو دلائے بغیر اور حکم کئے بغیر نہ رہوں گا۔ وہ جانوروں کے کان کاٹ ڈالیں گے اور میں انہیں حکم کروں گا کہ وہ اللہ کی پیدائش کو بدل ڈالیں گے جو اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنائے وہ زبرست گھاٹے میں پڑ گیا۔ شیطان ان سے وعدہ کرتا ہے اور امیدیں بندھاتا ہے۔ شیطان ان سے وعدہ کر کے محض دھوکہ کر رہا ہے۔ انہیں لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے جس سے وہ رہائی نہ پا سکیں گے۔“

یعنی جو غیر اللہ کو پکارتے ہیں وہ اپنے خیال میں عورتوں کے پجاری ہیں۔ کوئی تو حضرت بی بی کو، کوئی بی بی آسیہ کو، کوئی بی بی اتاوَلی کو، کوئی لال پری کو، کوئی سیاہ پری کو، کوئی سیتلا کو، کوئی مسانی کو اور کوئی کالی کو پوجتا ہے۔ یہ محض خیالات ہیں ورنہ ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ نہ کوئی عورت ہے نہ کوئی مرد۔ محض خیال خام اور شیطانی وسوسہ ہے جس کو معبود بنا لیا ہے۔

ان مشرکوں کی تمام عبادتیں شیطان کے لئے ہو رہی ہیں یہ اپنے خیال میں نذر و نیاز عورتوں کو دیتے ہیں مگر درحقیقت شیطان لے لیتا ہے۔ انہیں ان باتوں سے نہ دینی فائدہ ہے اور نہ دنیوی کیونکہ شیطان راندۂ درگاہ ہے اس سے دینی فائدہ تو ہونے سے رہا کیونکہ یہ انسان کا دشمن ہے وہ کیسے اسکا بھلا چاہے گا یہ تو خدا کے سامنے کہہ چکا ہے کہ میں تیرے بہت سے بندوں کو اپنا بنا لوں گا۔ ان کی عقلیں ایسی ماروں گا کہ اپنے خیالات ہی کو ماننے لگیں گے میرے نام کے جانور مقرر کریں گے جن پر میری نیاز کا نشان ہوگا مثلاً اسکا کان چیر ڈالیں گے یا اسکے گلے میں کمر بند ڈال دیں گے۔ ماتھے پر مہندی لگا دیں گے منہ پر سہرا باندھ دیں گے۔ منہ کے اندر پیسہ رکھ دیں گے۔ بہرحال ہر وہ علامت جو یہ بتائے کہ یہ جانور فلاں کی نیاز کا ہے اسی میں داخل ہے۔ شیطان یہ بھی کہہ آیا ہے کہ میرے اثر سے لوگ اللہ تعالیٰ کی پیدائش کو بگاڑ ڈالیں گے۔ کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھ لے گا۔ کسی کے نام پر ناک یا کان چھدوا لے گا، کوئی داڑھی منڈوائے گا، کوئی چار ابرو صاف کر کے فقیری کا اظہار کرے گا یہ سب شیطانی باتیں ہیں اور اسلام کے خلاف ہیں۔ پھر جس نے اللہ جیسے کریم کو چھوڑ کر شیطان جیسے دشمن کی راہ اختیار کی اس نے صریح دھوکہ کھایا۔ کیوں کہ اول تو شیطان دشمن ہے۔ دوسرے اس میں بجز وسوسے ڈالنے کے اور کوئی قدرت بھی نہیں۔ جھوٹے سچے وعدوں سے انسان کا وقتی طور پر دل بہلا دیتا ہے کہ اگر اتنے

پیسے ہوں تو ایسا ایسا باغ تیار ہو جائے گا اور خوبصورت محل بن جائے گا۔ چونکہ یہ امیدیں پوری ہوتی نہیں اس لئے انسان گھبرا کر خدا کو بھول کر غیروں کی طرف دوڑنے لگتا ہے اور ہوتا وہی ہے جو مقدر میں ہے۔ کسی کے ماننے یا نہ ماننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تو محض ایک شیطانی وسوسہ اور اس کا مکروفریب ہے ان باتوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ انسان شرک میں گرفتار ہو کر جہنمی بن جاتا ہے اور شیطانی جال میں اس بری طرح سے پھنس جاتا ہے کہ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے مگر رہائی نصیب نہیں ہوتی۔

اولاد میں شرک

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْکُنَ اِلَیْهَا فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَکُوْنَنَّ مِنَ الشَّاکِرِیْنَ☆فَلَمَّا اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَکَآءَ فِیْمَا اٰتٰهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (سورہ اعراف: **189-190**)

> ”اس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کی بیوی پیدا کی تا کہ اس سے چین پائے پھر جب اس نے اس سے ہم بستری کر لی تو اس کو حمل رہ گیا وہ اسے لے کر چلتی پھرتی رہی جب بھاری ہوگئی تو دونوں نے اللہ کو جو ان کا رب ہے پکارا کہ اگر تو ہمیں تندرست اولاد دے گا ہم تیرے شکر گزار ہوں گے پھر جب اس نے ان کو تندرست بچہ دیا تو اس بچے میں اللہ کے شریک بنانے لگے۔ ان کے شرک سے اللہ بلند و برتر ہے۔“

یعنی شروع میں بھی اللہ ہی نے انسان کو بنایا۔ اسے بیوی دی اور دونوں میں محبت پیدا کی۔ پھر جب اولاد کی امید ہوئی تو دونوں اللہ سے دعائیں مانگنے لگے کہ اگر صحیح سالم اور تندرست بچہ پیدا ہو جائے تو ہم خدا کا بہت ہی احسان مانیں گے۔ پھر جب حسب خواہش بچہ پیدا ہو گیا تو غیر اللہ کو ماننے لگے۔ اور ان کی نذرونیاز کرنے لگے۔ کوئی بچہ کو کسی کی قبر پر لے گیا۔ کوئی مزار پر۔ کسی نے کسی کے نام کی چوٹی رکھ لی۔ کسی نے بیڑی ڈال دی کسی نے کسی کا فقیر بنا دیا اور نام بھی رکھے تو شرکیہ جیسے نبی بخش، علی بخش، پیر بخش، گنگا بخش، جمنا داس وغیرہ۔ اللہ تو ان نیازوں سے بے پرواہ ہے مگر ان نادانوں کا ایمان جاتا رہتا ہے۔

کھیتی باڑی میں شرک

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَکَآئِنَا فَمَا

كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَايَحْكُمُوْنَ (سورہ انعام: 137)

”اور مشرک ان چیزوں میں سے جو اللہ نے پیدا کی ہیں یعنی کھیتی اور جانوروں میں ایک حصہ مقرر کر چکے ہیں اور اپنے خیال میں کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا ہے اور یہ ہمارے شریکوں کا۔ پھر جو ان کے شریکوں کا ہے وہ اللہ کو نہیں پہنچتا اور جو اللہ کا ہے وہ ان کے شرکاء کو مل جاتا ہے یہ جو فیصلہ کر رہے ہیں برا ہے۔“

یعنی تمام غلے اور جانور اللہ ہی نے پیدا کئے ہیں پھر مشرک جس طرح ان میں سے خدا کی نیاز نکالتے ہیں اسی طرح غیر اللہ کی بھی نیاز نکالتے ہیں جب کہ غیر اللہ کی نیاز میں جو ادب واحترام بجالاتے ہیں وہ اللہ کی نیاز میں نہیں بجالاتے۔

چوپایوں میں شرک

وَقَالُوْا هٰذِهٖ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَا اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (سورہ انعام: 139)

”کہتے ہیں کہ یہ جانور اور کھیتی اچھوتی ہے اسے کوئی نہ کھائے علاوہ اس کے جسے ہم چاہیں (محض اپنے خیال سے) بعض جانوروں کی سواری منع ہے اور بعض جانوروں پر اللہ کا نام نہیں لیتے یہ سب اللہ پر بہتان ہے وہ ان کے بہتان کی جلدی سزا دے گا۔“

یعنی لوگ محض اپنے خیال سے کہہ دیتے ہیں کہ فلاں چیز اچھوتی ہے اس کو فلاں شخص کھا سکتا ہے۔ بعض جانوروں کو لادتے نہیں اور سواری بھی نہیں کرنے دیتے کہ یہ فلاں کی نیاز کا جانور ہے اس کا ادب کرنا چاہئے۔ اور بعض جانوروں کو غیر اللہ کے نام پر نامزد کر دیتے ہیں کہ ان کاموں سے اللہ خوش ہوگا اور مرادیں بر لائے گا۔ مگر ان کے یہ خیالات وافعال جھوٹے ہیں جن کی وہ ضرور سزا پائیں گے۔

مَاجَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ وَّ لَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (سورہ مائدہ: 103)

”اللہ نے نہ بحیرہ کو نہ سائبہ کو نہ وصیلہ کو اور نہ حامی کو جائز قرار دیا لیکن کافر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور اکثر ناسمجھ ہیں۔“

جو جانور کسی کے نام کا نامزد کر دیا جاتا اور اس کا کان چیر دیا جاتا تو اس کو بحیرہ کہتے تھے جو جانور بتوں کے نام پر ہمارے زمانہ کے سانڈھ کی طرح چھوڑ دیا جاتا تھا اس کو سائبہ کہتے تھے۔ جو اونٹنی مسلسل مادہ بچہ جنے

درمیان میں نر بچہ پیدا ہوا اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے اور اس کو وصیلہ کہتے تھے اور جو نر اونٹ ایک خاص عدد سے جفتی کر چکا ہوا سے بھی بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے اور اس کو حامی کہتے تھے۔ فرمایا کہ یہ باتیں اللہ کے حکم کی نہیں بلکہ تمہاری اپنی بنائی ہوئی رسمیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی جانور کو کسی کے نام کا ٹھہرا دینا اور اس پر اس کی علامت لگا دینا اور یہ مقرر کرنا کہ فلاں کی نیاز گائے، فلاں کی بکری اور فلاں کی مرغی ہوتی ہے یہ سب جاہلانہ رسمیں ہیں اور شریعت مطہرہ کے خلاف ہیں۔

حکم میں شرک

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ **(سورہ نحل: 116)**

”جھوٹ نہ کہو جس کو تمہاری زبانیں بیان کرتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تاکہ اللہ پر جھوٹ باندھو۔ یقین مانو جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح کو نہیں پہنچتے۔“

یعنی اپنی طرف سے حلال وحرام مقرر نہ کرو یہ خدا ہی کی شان ہے اور اس طرح کہنے سے اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ یہ خیال کرنا کہ اگر فلاں کام اس طرح کیا جائے تو ٹھیک ہو جائے گا ورنہ اس میں گڑبڑ ہو جائے گی غلط ہے کیونکہ خدا پر جھوٹ باندھ کر انسان کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ معلوم ہوا کہ یہ عقیدہ کہ محرم میں پان نہ کھایا جائے۔ لال کپڑے نہ پہنے جائیں، محرم اور رجب میں نکاح نہ کیا جائے دسویں محرم کو کھچڑا پکایا اور تقسیم کیا جائے اور شب برات کے موقع پر حلوہ ہی کھایا کھلایا جائے شاہ عبدالحق صاحب کا تحفہ حلوہ ہی ہے اس کو احتیاط سے بناؤ اور حقہ پینے والے کو نہ کھلاؤ۔ شاہ مدار کی نیاز مالیدہ ہی ہے۔ بوعلی قلندر کی نیاز سویاں اور اصحاب کہف کی گوشت روٹی ہے۔ شادی کے موقعہ پر فلاں فلاں اور موت وغمی کے موقع پر فلاں فلاں رسموں کا انجام دینا ضروری ہے۔ شوہر کی موت کے بعد نہ شادی کرو، نہ شادی میں بیٹھو نہ اچار ڈالو۔ فلاں نیلا کپڑا اور فلاں سرخ کپڑا نہ پہنو، یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے کہ شرع کا حکم دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے جبکہ یہ بھی حکم گھڑ رہے ہیں اور ان کو اللہ کے حکم کی مانند سمجھ رہے ہیں۔ یہ شرک فی الحکم ہے۔

ستاروں سے متعلق شرک

عن زيد بن خالد الجهنی قال صلى لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم صلوة الصبح بالحديبية على اثر سماء كانت من الليل فلما انصرف اقبل على الناس فقال هل تدرون ماذا قال ربكم قالوا الله ورسوله اعلم قال قال اصبح من عبادی مومن بی و کافر بی فاما من قال مطرنا

بفضل الله و رحمته فذلك مومن بى و كافر بالكواكب واما من قال مطرنا بنوء كذا فذلك كافر بى و مومن بالكواكب (بخارى و مسلم)

زید بن خالد جہنیؓ سے روایت ہے کہ ایک دن حدیبیہ میں رات کی بارش کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ہم کو صبح کی نماز پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا۔ صحابہ نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کا رسول خوب جانتا ہے۔ فرمایا کہ اس نے کہا کہ میرے بندوں نے صبح کی کچھ تو مومن تھے اور کچھ کافر تھے جس نے کہا اللہ کے فضل سے اور اس کی رحمت سے بارش ہوئی وہ مجھ پر ایمان لایا اور تاروں کے ساتھ کفر کیا۔ اور جس نے کہا فلاں فلاں تارے سے بارش ہوئی اس نے میرے ساتھ کفر کیا اور تاروں پر ایمان لایا۔

یعنی جو شخص کائنات میں مخلوق کی اصل تاثیر سمجھتا ہے اسے حق تعالیٰ اپنے منکروں میں شمار فرماتا ہے کہ وہ ستارہ پرست ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ سارا کارخانہ خدا کے حکم سے چل رہا ہے وہ اس کا مقبول بندہ ہے ستارہ پرست نہیں۔ معلوم ہوا کہ نیک و بد ساعتوں کے ماننے، اچھی بری تاریخوں کے یا دن کے پوچھنے اور نجومی کی باتوں پر یقین کرنے سے شرک کا در کھلتا ہے کیونکہ ان سب کا تعلق نجوم سے ہے اور نجوم کا ماننا ستارہ پرستوں کا کام ہے۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من اقتبس بابا من علم النجوم بغير ما ذكر الله فقد اقتبس شعبة من السحر المنجم كاهن والكاهن ساحر والساحر كافر (رزين)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے علم نجوم کا کوئی مسئلہ سیکھا بغیر ایسی صورت کے جو اللہ نے بیان کی ہے۔ تو اس نے جادو کا ایک حصہ سیکھا۔ نجومی کاہن ہے اور کاہن جادوگر ہے اور جادوگر کافر ہے۔

یعنی قرآن پاک میں تاروں کا بیان ہے کہ ان سے خدا کی قدرت وحکمت معلوم ہوتی ہے۔ ان سے آسمان کی خوبصورتی ہے یہ بیان نہیں ہے کہ انہیں کارخانہ قدرت میں دخل ہے۔ دنیا کی برائی بھلائی انہیں کے اثرات ہیں۔ اب اگر کوئی تاروں کے پہلے فوائد چھوڑ کر یہ کہے کہ انہیں کی تاثیرات عالم میں کارفرما ہیں اور غیب کا دعویٰ کرے۔ جس طرح جاہلیت میں جنوں سے پوچھ پوچھ کر کاہن غیب کی باتیں بیان کیا کرتے تھے اسی طرح نجومی تاروں سے معلوم کر کے بتاتے ہیں گویا کاہن، نجومی، رمال، جفار سب کی ایک ہی راہ ہے۔ کاہن جادوگروں کی طرح جنوں سے دوستی گانٹھتا ہے اور جنوں سے دوستی ان کو مانے بغیر پیدا نہیں ہوتی جب ان کو

پکارا جائے اور نذرانہ دیا جائے تو دوستی پیدا ہوتی ہے لہٰذا یہ کفر وشرک کی باتیں ہیں۔

آئندہ کی خبریں بتانے والوں کے پاس جانا

عن حفصة زوج النبی صلی الله علیه وسلم قالت قال النبی صلی الله علیه وسلم من اتی عرافا فساله عن شیء لم تقبل له اربعین لیلة۔ (مسلم)

''ام المومنین حضرت حفصہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جوخبریں بتانے والے کے پاس آیا اور اس سے کچھ پوچھا تو اس کی چالیس دن تک نماز قبول نہیں ہوگی۔''

یعنی جو شخص غیب کی باتیں بتانے کا دعویدار ہے اگر اس سے کسی نے جا کر کچھ پوچھ لیا تو اس کی چالیس دن تک عبادت قابل قبول نہیں رہی کیونکہ اس نے شرک کیا اور شرک عبادتوں کا نور مٹا دیتا ہے۔ نجومی، رمال، جفار، فال کھولنے والے نامہ نکالنے سب عراف میں داخل ہیں۔

توہمات سے بچنا

عن قبیصة ان النبی صلی الله علیه وسلم قال العیافة والطرق والطیرة من الجبت۔ (ابودائود)

''حضرت قبیصہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شگون لینے کے لئے پرندہ اڑانا، فال نکالنے کے لئے کچھ ڈالنا اور بدشگونی کفر (وشرک کے آثار) میں سے ہے۔''

عرب میں شگون لینے کا بہت رواج تھا اور ان کا شگون پر بڑا اعتقاد تھا اس لئے آپ نے کئی بار فرمایا کہ یہ شرک ہے تاکہ لوگ باز آ جائیں جیسا کہ اگلی حدیث میں ہے۔

عن عبدالله بن مسعود عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال الطیرة شرك الطیرة شرك الطیرة شرك (ابوداؤد)

''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شگون لینا شرک ہے شگون لینا شرک ہے، شگون لینا شرک ہے۔''

فائدہ: قرآن وحدیث سے معلوم ہوا کہ پرندہ کے دائیں یا بائیں اڑنے میں یا کوے کے آواز نکالنے میں یا کالی بلی کے رستہ کاٹنے میں اللہ تعالیٰ نے کاموں کے اچھے یا برے ہونے کا کوئی تعلق نہیں رکھا۔ پچھلے کسی دین سماوی میں بھی ایسا کوئی تعلق نہیں بتایا گیا۔ پھر لوگوں نے جو یہ تعلق بنا لئے ہیں تو خدائی کام میں دخل دیا ہے

جوشرک کی صورت ہے۔

عن سعد بن مالك ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا هامة ولا عدوى ولا طيرة وان تكن الطيرة شىء ففى الدار والفرس والمراة(ابو داؤد)

''حضرت سعد بن مالک ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہ الو ہے نہ کسی کا کسی کو مرض لگتا ہے۔ اور نہ کسی چیز میں نحوست ہے اور اگر نحوست ہوتی تو (بانجھ اور بدزبان) عورت (تنگ اور برے پڑوسیوں والے) گھر اور (سرکش) گھوڑے میں ہوتی ہے۔''

عرب کا عقیدہ تھا کہ جس مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے اس کی کھوپڑی میں سے الو نکل کر فریاد کرتا پھرتا ہے اس کو ہامہ کہا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے۔ معلوم ہوا کہ تناسخ بھی قطعی بے بنیاد ہے۔ عرب میں بعض بیماریوں کے جیسے کھجلی، کوڑھ وغیرہ کے متعلق یہ خیال تھا کہ ایک دوسرے کو لگ جاتی ہیں اور سمجھتے تھے کہ یہ بیماریوں کی ذاتی تاثیر ہے یا خود ایک کی بیماری (اس کا سبب نہیں) دوسرے کو لگ جاتی ہے فرمایا یہ بات غلط ہے۔

لوگوں میں یہ بھی مشہور ہے کہ فلاں کام فلاں کو نامبارک ہے یہ بھی غلط ہے فرمایا کہ اگر اس بات کا کچھ اثر ہے تو تین ہی چیزوں میں ہے گھر، گھوڑا، عورت یعنی یہ چیزیں کبھی نامبارک ثابت ہوتی ہیں مگر ان کی نامبارکی معلوم کرنے کی کوئی راہ بتائی گئی یہ جو لوگوں میں مشہور ہے شیر دہاں گھر، ستارہ پیشانی گھوڑا اور کل جبھی (یعنی سیاہ اور بدزبان) عورت منحوس ہوتی ہے بے سند بات ہے مسلمانوں کو ان باتوں کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اگر نیا مکان یا گھوڑا خریدا جائے یا عورت سے شادی کی جائے تو اللہ ہی سے اس کی بھلائی مانگیں اور اسی سے اس کی برائی سے پناہ مانگیں۔

عن ابى هريرة قال قال رسول ﷺ ولا عدوى ولا هامة ولا صفر۔(بخاری)

''حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہ چھوت چھات ہے نہ الو ہے اور نہ صفر ہے۔''

عرب والے جوع الکلب (یعنی خوب کھانے کے باوجود پیٹ نہ بھرنے) کی بیماری کو بلا کا اثر خیال کیا کرتے تھے کہ اس کے پیٹ میں کوئی بلا گھسی ہوئی ہے جو غذا چٹ کر جاتی ہے اسی لئے اس غریب کا پیٹ نہیں بھرتا اس بھوت کا نام صفر تھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ محض واہمہ ہے ہے بھوت ووت کچھ نہیں۔ معلوم ہوا کہ بیماریاں بلا کے اثرات سے نہیں ہوتیں۔ بعض لوگ بعض بیماریوں کو بلا کا اثر خیال کرتے ہیں جیسے چیچک اور

خارش وغیرہ مگر یہ بات غلط ہے۔ جاہلیت میں ماہ صفر کو نحس خیال کرتے تھے اور اس میں کوئی نیا کام نہیں کرتے تھے۔ یہ بھی غلط ہے۔ معلوم ہوا کہ صفر کے تیرہ دنوں کو نحس سمجھنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ ان میں بلائیں اترتی ہیں اسی وجہ سے ان کا نام بھی تیرہ تیزی رکھا گیا کہ ان کی تیزی سے کام بگڑ جاتے ہیں غلط ہے اسی طرح کسی چیز کو یا تاریخ کو یا دن کو یا ساعت کو نحس سمجھنا شرک کی باتیں ہیں۔

عن جابر ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اخذ بيد مجذوم فوضعها معه فى القصعة فقال كل ثقة بالله وتوكلا عليه (ابن ماجه)

’’حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کوڑھی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ پیالہ میں رکھ کر فرمایا۔ اللہ پر اعتماد اور بھروسہ کر کے کھاؤ۔‘‘

یعنی ہمارا اعتماد و توکل اللہ پر ہے وہ جسے چاہے بیمار کر دے اور جسے چاہے تندرست کر دے۔

ناموں میں شرک کی آمیزش سے بچنا

عن ابن عمر رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان احب اسمائكم عبدالله وعبدالرحمن (مسلم)

’’حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے بہت ہی پیارے نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔‘‘

انہیں ناموں میں عبدالقدوس، عبدالجلیل عبدالخالق، خدا بخش، اللہ دیا، اللہ داد وغیرہ داخل ہیں جن میں اللہ کی طرف نسبت ہوتی ہے۔

عن شريح بن هانى عن ابيه انه لما وفد الى رسول الله صلى الله عليه وسلم مع قومه سمعهم يكنونه بابى الحكم فدعاه رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال ان الله هو الحكم واليه الحكم فلم تكنى ابا الحكم (ابودائود، نسائى)

’’حضرت ہانیؓ کا بیان ہے کہ جب میں اپنی قوم کے وفد کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو آپ نے ان سے سنا کہ مجھے میرے ساتھی ابوالحکم کہہ کر آواز دیتے ہیں۔ آپ نے مجھے بلا کر فرمایا کہ حکم اللہ ہے۔ حُکم اسی کا ہے۔ تمہاری کنیت ابوالحکم کیوں رکھی گئی ہے‘‘۔

یعنی ہر فیصلہ کا چکا دینا اور جھگڑے کا مٹا دینا اللہ ہی کی شان ہے جس کا ظہور آخرت میں ہوگا کہ وہاں

اگلے پچھلے سارے جھگڑے طے ہو جائیں گے ایسی طاقت کسی مخلوق میں نہیں۔ معلوم ہوا کہ جو لفظ اللہ ہی کی شان کے لائق ہے۔ اسے کسی غیر کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ مثلاً شہنشاہ خدا ہی کو کہا جائے سارے جہان کا خداوند جو چاہے کرڈالے۔ یہ جملہ خدا ہی کی شان میں بولا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بڑا بے نیاز اور داتا وغیرہ الفاظ خدا ہی کی شان کے لائق ہیں کسی دوسرے کے لئے بولنے میں شرک کا خیال ہوتا ہے۔

عن حذيفة عن النبى صلى الله عليه وسلم قال لا تقولوا ماشاء الله وشاء محمد وقولوا ماشاء الله وحده۔ (شرح السنة)

”حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا یوں نہ کہو جو کچھ اللہ نے چاہا اور محمد ﷺ نے چاہا بلکہ یوں کہو جس کو اللہ وحدہ لاشریک لہ نے چاہا۔“

یعنی شان الوہیت میں کسی مخلوق کا دخل نہیں خواہ وہ کتنا ہی بڑا اور کیسا ہی مقرب کیوں نہ ہو مثلاً یوں نہ کہا جائے کہ اللہ اور رسول چاہے گا تو کام ہو جائے گا کیونکہ دنیا کا سارا کاروبار اللہ ہی کے چاہنے سے ہوتا ہے رسول کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یا اگر کوئی شخص پوچھے کہ فلاں کے دل میں کیا ہے، یا فلاں کی شادی کب ہوگی یا فلاں درخت پر کتنے پتے ہیں یا آسمان میں کتنے تارے ہیں تو اسکے جواب میں یوں نہ کہے کہ اللہ اور رسول ہی جانیں کیونکہ غیب کی بات کی اللہ ہی کو خبر ہے۔ رسول کو خبر نہیں۔ ہاں اگر دینی باتوں میں یہ لفظ بول دیا جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اللہ نے اپنے رسول کو دین کی ہر بات بتا دی ہے اور لوگوں کو اپنے رسول کی فرمانبرداری کا حکم دیا ہے۔

غیراللہ کے نام کی قسم

عن ابن عمر قال سمعت رسول الله عليه وسلم يقول من حلف بغيرالله فقد اشرك (ترمذى)

”حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا فرما رہے تھے جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔“

عن عبدالرحمن بن سمرة قال قال رسول الله صلى الله على وسلم لا تحلفوا بالطواغيت ولا بابائكم (مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بتوں کی قسمیں نہ کھاؤ، اور نہ اپنے باپ کی قسمیں کھاؤ۔

عن ابن عمر ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال ان الله ینهاکم ان تحلفوا بابائکم من کان حالفا فلیحلف بالله اولیصمت۔ (بخاری مسلم)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ پاک تم کو باپ دادا کی قسمیں کھانے سے منع فرماتا ہے جو شخص قسم کھائے تو اللہ کی کھائے ورنہ خاموش رہے۔

عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال من حلف فقال فی حلفه باللات والعزی فلیقل لااله الا الله (بخاری، مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس نے (سبقت لسانی کے طور پر) لات وعزیٰ کی قسم کھائی اسے لا الٰہ الا اللہ کہہ لینا چاہئے۔

زمانہ جاہلیت میں بتوں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں۔ اسلام میں اگر کسی مسلمان کے منہ سے عادت کے مطابق غیر شعوری طور پر بتوں کی قسم نکل جائے تو فوراً لا الٰہ الا اللہ پڑھ کر توحید کا اقرار کرلے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا کسی چیز کی قسم نہ کھائی جائے۔ اگر غیر شعوری طور پر غیر اللہ کی قسم زبان سے نکل جائے تو فوراً توبہ کی جائے۔ مشرکوں میں جن کی قسمیں کھائی جاتی ہیں ان کی قسم کھانے سے ایمان میں خلل آتا ہے۔

غیر اللہ کے لئے نذر ناجائز ہے

عن ثابت بن ضحاك قال نذر رجل علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم ان ینحر ابلا ببوانة فاتی رسول الله صلی الله علیه وسلم فاخبره فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم هل کان فیها وثن من اوثان الجاهلیة یعبد قالوا لا قال فهل کان فیها عید من اعیادهم قالوا لا فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم اوف بنذرك فانه لا وفاء لنذر فی معصیة الله (ابوداؤد)

حضرت ثابت بن ضحاک کا بیان ہے کہ ایک شخص نے عہد رسالت میں یہ نذر مانی کہ بوانہ جا کر اونٹ نحر کروں گا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر آپ کو اپنی نذر کی خبر کی۔ فرمایا جاہلیت کے تھانوں میں سے کوئی تھان تو وہاں نہیں تھا؟ صحابہ نے کہا نہیں۔ فرمایا وہاں کوئی تہوار تو نہیں منایا جاتا بولے نہیں۔ فرمایا اپنی نذر کو پورا کر کیونکہ اس نذر کو پورا کرنا منع ہے جس میں اللہ کا گناہ ہوتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا اور کسی کی منت ماننا گناہ ہے۔ ایسی منت کو پورا نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ بات خود گناہ ہے پھر اسے پورا کرنا اور گناہ پر گناہ ہوگا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جس جگہ غیر اللہ کے نام پر جانور

چڑھائے جاتے ہوں یا غیر اللہ کی پوجا پاٹ ہوتی ہو یا جمع ہو کر شرک کیا جاتا ہو وہاں اللہ کے نام کا بھی جانور نہ لے جایا جائے اور ان میں شرکت نہیں کرنی چاہئے خواہ اچھی نیت ہو یا بری کیونکہ ان میں شرکت خود مستقل بری بات ہے۔

غیر اللہ کے لئے تعظیمی سجدہ بھی نہیں

عن عائشه رضی الله عنها ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان فی نفر من المهاجرین والانصار فجاء بعیر فسجد له فقال اصحابه یا رسول الله تسجد لك البهائم والشجر فنحن احق ان نسجد لك فقال اعبدو ربکم واکرموا اخاکم(مسند احمد)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مہاجرین وانصار کی ایک جماعت میں تشریف فرما تھے کہ ایک اونٹ نے آکر آپ کو سجدہ کیا۔ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ آپ کو جانور اور درخت سجدہ کرتے ہیں۔ ان سے زیادہ تو ہمارا حق ہے کہ ہم آپ کو سجدہ کریں فرمایا اپنے رب کی عبادت کرو اور اپنے بھائی کی تعظیم کرو۔

یعنی تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں جو بہت بزرگ ہو وہ بڑا بھائی ہے اس کی بڑے بھائی کی سی تعظیم کرو باقی سب کا مالک اللہ ہے عبادت اس کی کرنی چاہئے معلوم ہوا کہ جتنے اللہ کے مقرب بندے ہیں خواہ انبیاء ہوں یا اولیاء ہوں وہ سب کے سب اللہ کے بے بس بندے ہیں اور ہمارے بھائی ہیں مگر حق تعالیٰ نے انہیں بڑائی بخشی تو ہمارے بڑے بھائی کی طرح ہوئے ہمیں ان کی فرمانبرداری کا حکم ہے کیونکہ ہم چھوٹے ہیں لہٰذا ان کی تعظیم انسانوں کی سی کرو اور انہیں خدا نہ بناؤ۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض بزرگوں کی تعظیم درخت اور جانور بھی کرتے ہیں چنانچہ بعض درگاہوں پر شیر بعض پر ہاتھی اور بعض پر بھیڑیئے حاضر ہوتے ہیں۔ لیکن انسانوں کو ان کی ریس نہیں کرنی چاہئے۔ انسان خدا کی بتائی ہوئی تعظیم کرسکتا ہے اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ مثلاً قبروں پر مجاور بن کر رہنا شرع میں نہیں ہے اس لئے ہرگز ہرگز حرص لائق نہیں ہے۔

عن قیس بن سعد قال اتیت الحیرة فرایتهم یسجدون لمرزبان لهم فقلت لرسول الله صلی الله علیه وسلم احق ان یسجد له فاتیت رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلت انی اتیت الحیرة فرایتهم یسجدون لمرزبان لهم فانت احق ان یسجد لك فقال لی ارایت لو مررت بقبری اکنت تسجد له فقلت لا فقال لا تفعلوا (ابوداؤد)

حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں شہر حیرہ میں گیا۔ میں نے وہاں کے لوگوں کو اپنے راجہ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے دل میں کہا بلاشبہ رسول اللہ ﷺ سجدہ کئے جانے کے زیادہ حق دار ہیں چنانچہ میں نے آپ کے پاس آ کر کہا کہ میں نے حیرہ میں لوگوں کو راجہ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا۔ آپ اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں فرمایا بھلا بتا تو سہی اگر تو میری قبر پر گزرے تو کیا تو اسے سجدہ کرے گا۔ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا تو ایسا خیال مت کرو۔

یعنی ایک نہ ایک دن میں بھی فوت ہو کر آغوش لحد میں جا سوؤں گا پھر میں سجدہ کے لائق نہ رہوں گا۔ سجدہ کے لائق تو وہی پاک ذات ہے جو لازوال ہے معلوم ہوا کہ سجدہ نہ زندہ کو روا ہے اور نہ مردہ کو اور نہ کسی قبر کو روا ہے اور نہ کسی مزار کو۔ کیونکہ زندہ ایک دن مرنے والا ہے اور مرا ہوا بھی کبھی زندہ تھا اور بشر تھا مر کر خدا نہیں ہوا بندہ ہی ہے۔

جن الفاظ سے شرک کا وہم ہوتا ہے ان سے بچنا

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يقولن احدكم عبدى وامتى كلكم عبيدالله وكل نساء كم اماء الله ولا يقل العبد لسيده مولاى فان مولاكم الله (مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی عبدی وامتی (میرا بندہ۔ میری بندی) نہ کہے تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمہاری ساری عورتیں اللہ کی بندیاں ہیں۔ غلام اپنے سید کو اپنا مالک نہ کہے کیونکہ تم سب کا مالک اللہ ہے۔

معلوم ہوا کہ غلام کو بھی آپس میں ایسی گفتگو سے پرہیز کرنا چاہئے کہ میں فلاں کا بندہ ہوں اور فلاں میرا مالک ہے۔ پھر خواہ مخواہ بندہ بننا عبدالنبی، بندہ علی، بندہ حضور، پرستار خاص، زن پرست، پیر پرست خود کو کہلوانا اور ہر کسی کو خداوند خدائے گان اور داتا کہہ دینا کس قدر بے جا ہے اور کتنی بڑی گستاخی ہے۔ ذرا ذرا سی بات میں کہنا کہ تم ہماری جان اور مال کے مالک ہو۔ ہم تمہارے بس میں ہیں جو چاہو کرو۔ یہ سب باتیں محض جھوٹ اور شرک پر مبنی ہیں۔

عزت وتکریم میں احتیاط

عن عمرؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تطرونى كما اطرت النصارى عيسى بن مريم فانما انا عبده فقولوا عبدالله ورسوله (بخارى ومسلم)

”حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ مجھے حد سے مت بڑھانا جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو حد سے بڑھا دیا میں تو محض اس کا بندہ ہی ہوں تو مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔“

یعنی حق تعالیٰ نے مجھے جن خوبیوں اور کمالات سے نوازا ہے وہ سب بندہ اور رسول کے کہہ دینے میں آجاتے ہیں کیونکہ بشر کے لئے رسالت سے بڑھ کر اور کیا مرتبہ ہوگا سارے مراتب اس سے نیچے ہیں۔ مگر بشر رسول بن کر بھی بشر ہی رہتا ہے، بندہ ہونا ہی اس کے لئے سبب فخر ہے۔ نبی بن کر بشر میں خدائی شان نہیں آجاتی اور خدا کی ذات میں نہیں مل جاتا۔ بشر کو بشریت ہی کے مقام پر رکھو۔ عیسائیوں کی طرح نہ بنو کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کو بشریت سے نکال کر جامہ الوہیت پہنا دیا جس سے یہ لوگ کافر اور مشرک بن گئے اور خدا کا قہر و عتاب ان پر نازل ہوا، اسی لئے پیغمبر اسلام علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنی امت سے فرمایا کہ عیسائیوں کی سی چال نہ چلنا اور میری تعریف میں حد سے نہ بڑھنا۔

عن مطرف بن عبدالله بن الشخير قال انطلقت فی وفد بنی عامر الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلنا انت سیدنا فقال السید الله فقلنا وافضلنا فضلا واعظمنا حولا فقال قولوا قولکم او بعض قولکم فلا یستجرینکم الشیطن (ابوداؤد)

حضرت مطرف بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں بھی رسول اللہ ﷺ کے پاس عامری وفد میں گیا ہم نے کہا آپ ہمارے سید ہیں فرمایا سید اللہ ہے پھر ہم نے کہا آپ ہم میں افضل ہیں اور بڑے ہیں فرمایا ہاں یہ ساری یا بعض بات کہہ سکتے ہو۔ کہیں شیطان تم کو گستاخ نہ بنا دے۔

یعنی کسی بزرگ کی شان میں زبان سنبھال کر بات کرنی چاہئے اس کی انسان ہی سی تعریف کرو۔ بلکہ اس میں بھی کمی کرو۔ سید کے دو معنی ہیں۔ (1) خود مختار، مالک کل جو کسی کا محکوم نہ ہو اور جو چاہے کرے۔ یہ شان خدا ہی کی ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے خدا کے علاوہ کوئی سید نہیں۔ (2) پہلے حاکم کا حکم اس کے پاس آئے اور پھر اس کی زبانی دوسروں تک پہنچے جیسے چودھری زمیندار، اس معنی کے لحاظ سے ہر نبی اپنی امت کا سید و سردار ہے۔ ہر مجتہد اپنے ماننے والوں کا، ہر بزرگ اپنے عقیدت مندوں کا اور ہر عالم اپنے شاگردوں کا سید ہے کہ یہ بڑے بڑے حضرات پہلے حکم پر خود عامل ہوتے ہیں پھر اپنے چھوٹوں کو سکھاتے پڑھاتے ہیں اس لحاظ سے ہمارے محبوب نبی ﷺ تمام جہان کے سید ہیں۔ خدا کی نگاہ میں آپ کا مرتبہ سب سے بڑا ہے۔ آپ سب سے زیادہ احکام شرعیہ کے پابند تھے، اور خدا کا دین سیکھنے میں لوگ آپ ہی کے محتاج ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے آپ کو سارے جہان کا سردار کہا جاسکتا ہے بلکہ کہنا چاہئے اور پہلے معنی کے لحاظ سے ایک چیونٹی کا سردار بھی

آپ کو نہ مانا جائے۔ آپ اپنی طرف سے ایک چیونٹی میں بھی تصرف کے مختار نہیں۔

بندگی میں شرف

عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انى لا اريد ان ترفعونى فوق منزلة التى انزلنيها الله تعالىٰ انا محمد بن عبدالله ورسوله (رزين)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے میرے اس مرتبہ سے آگے بڑھاؤ جس پر اللہ پاک نے مجھے رکھا ہے میں محمد ہوں عبداللہ کا بیٹا ہوں اور اللہ کا رسول ہوں۔

یعنی جس طرح اور بڑے لوگ اپنی تعریف میں مبالغہ سے خوش ہوتے ہیں مجھے اپنی تعریف میں مبالغہ ذرہ برابر بھی پسند نہیں۔ ان لوگوں کو تو مبالغہ کرنے والوں کے دین سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا خواہ دین رہے یا نہ رہے لیکن پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی امت پر بڑے شفیق و مہربان ہیں آپ کو رات دن یہی فکر دامن گیر تھا کہ امت کا دین سنور جائے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ میرے امتی مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں اور میرے بہت احسان مند ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ محبّ محبوب کے خوش کرنے کو آسمان اور زمین کے قلابے ملایا کرتا ہے ایسا نہ ہو یہ تعریف میں حد سے بڑھ جائیں جس سے خدا کی شان میں بے ادبی ہو جائے، جس سے ان کا دین غارت ہو جائے اور میری ناخوشی بھی واجب ہو جائے اس لئے آپ نے فرمایا کہ مجھے مبالغہ پسند نہیں۔ میرا نام محمد ﷺ ہے میں خالق یا رزاق نہیں، میں عام لوگوں کی طرح اپنے باپ ہی سے پیدا ہوا اور میرا شرف بندہ ہونے ہی میں ہے البتہ عوام سے میں اس بات میں جدا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور اللہ کے احکام کو جانتا ہوں لوگ نہیں جانتے۔ لہٰذا انہیں مجھ سے اللہ کا دین سیکھنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات خاصہ کی نقل کرنا

عن ابى هريرة قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول قال الله تعالىٰ ومن اظلم ممن ذهب يخلق كخلقى فليخلقوا ذرة اوليخلقوا حبة اوشعيرة(بخارى، مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرما رہے تھے کہ اللہ نے فرمایا ہے اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو میری طرح پیدا کرنے کی ریس کرے سو بھلا ایک ذرہ یا ایک جو تو پیدا کر کے دکھائیں۔

یعنی اشیاء کو صورت دینا اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی بنائی ہوئی اور دی ہوئی صورتوں

میں سے بے جان اشیاء کی صورتیں نقل کرنے کی تو اجازت دی لیکن جاندار اشیاء کی صورتوں کو نقل کرنے سے منع فرما دیا۔ اب جو کوئی اللہ کا حکم نہ مانے اور ممنوعہ اشیاء میں اللہ کی صفت کی نقالی کرے تو بڑی گستاخی اور جرأت کرتا ہے۔ اس مناسبت سے اس کو قیامت کے دن کہا جائے گا کہ جب تو نے ایک صفت میں نقالی کی جرأت کی ہے تو دوسری صفت یعنی پیدا کرنے میں بھی نقل کر کے دکھا جب اتنی قدرت نہیں ہے تو دنیا میں کیوں گستاخی کا ارتکاب کیا لہٰذا اب اس کا عذاب چکھ۔

عن عائشة انها اشترت نمرقة فيها تصاوير فلما راها رسول الله صلى الله عليه وسلم قام على الباب فلم يدخل فعرفت فى وجهه الكراهة قالت قلت يا رسول الله اتوب الى الله والى رسوله ماذا اذنبت فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم مابال هذه النمرقة قالت قلت اشتريتها لك تقعد عليها وتوسدها فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان اصحاب هذه الصور يعذبون يوم القيمة ويقال لهم احيوا ما خلقتم وقال ان البيت الذى فيه الصور لا تدخله الملئكة (بخارى)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک غالیچہ خریدا جس میں تصویریں تھیں جب اس کو رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو آپ دروازے ہی پر کھڑے رہے اندر نہیں آئے فرماتی ہیں میں نے آپ کے چہرے سے ناگواری محسوس کی۔ میں نے کہا یا رسول اللہ میری توبہ ہے میں نے کیا گناہ کیا ہے۔ فرمایا یہ غالیچہ کیسا ہے۔ فرماتی ہیں میں نے کہا میں نے اس کو آپ کے لئے خریدا ہے تاکہ آپ اس پر بیٹھیں اور تکیہ بنائیں فرمایا ان تصویروں والوں پر قیامت کے دن یہ عذاب ہوگا کہ ان سے کہا جائے گا کہ اپنی بنائی ہوئی تصویروں کو زندہ کرو۔ فرمایا جس گھر میں تصویریں ہوتی ہیں اس میں فرشتے نہیں آتے۔

چونکہ اکثر مشرک مورتیاں پوجتے ہیں اس لئے فرشتوں اور نبیوں کو مورتیوں اور تصویروں سے گھن آتی ہے اور اسی وجہ سے جس گھر میں تصویر یا مورتی ہو رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ تصویر بنانے والوں پر عذاب ہوگا کہ سامان بت پرستی مہیا کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ تصویر خواہ پیغمبر کی ہو یا ولی کی یا کسی بھی شخص کی بنائی حرام ہے اور اس کا رکھنا بھی حرام ہے جو لوگ اپنے بزرگوں کی تصویروں کی تعظیم کرتے ہیں اور بطور تبرک اپنے پاس رکھتے ہیں وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ پیغمبر اور فرشتے ان سے گھن کرتے ہیں۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہر قسم کی تصویر کو گندہ سمجھ کر اپنے گھر سے دور کر دے تاکہ رحمت کے فرشتے بھی اس گھر میں آئیں جائیں اور گھر میں برکت ہو۔

عن عبدالله بن عباس قال سمعت رسو ل الله صلی الله علیه وسلم یقول اشد الناس عذابا یوم القیمة من قتل نبیا اوقتله نبی اوقتل احد والدیه والمصورون وعالم لا ینتفع بعلمه (بیهقی)

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب اس شخص کو ہوگا جس نے نبی کو یا جس کو نبی نے قتل کیا یا اس کو جس نے اپنے باپ کو یا ماں کو قتل کیا اور تصویریں بنانے والوں کو اور اس عالم کو بھی جو اپنے علم پر عمل نہ کرے۔

یعنی تصویر بنانا بھی ان بڑے بڑے گناہوں میں داخل ہے اور اس کے بنانے والے کو پیغمبر کے قاتل کا سا گناہ ہوگا۔